آغا ریاض احمد ڈی ایس پی (ر)

دلہن، دل اور دلربا

ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی ڈائری سے جرم و سزا کی سچی کہانیاں
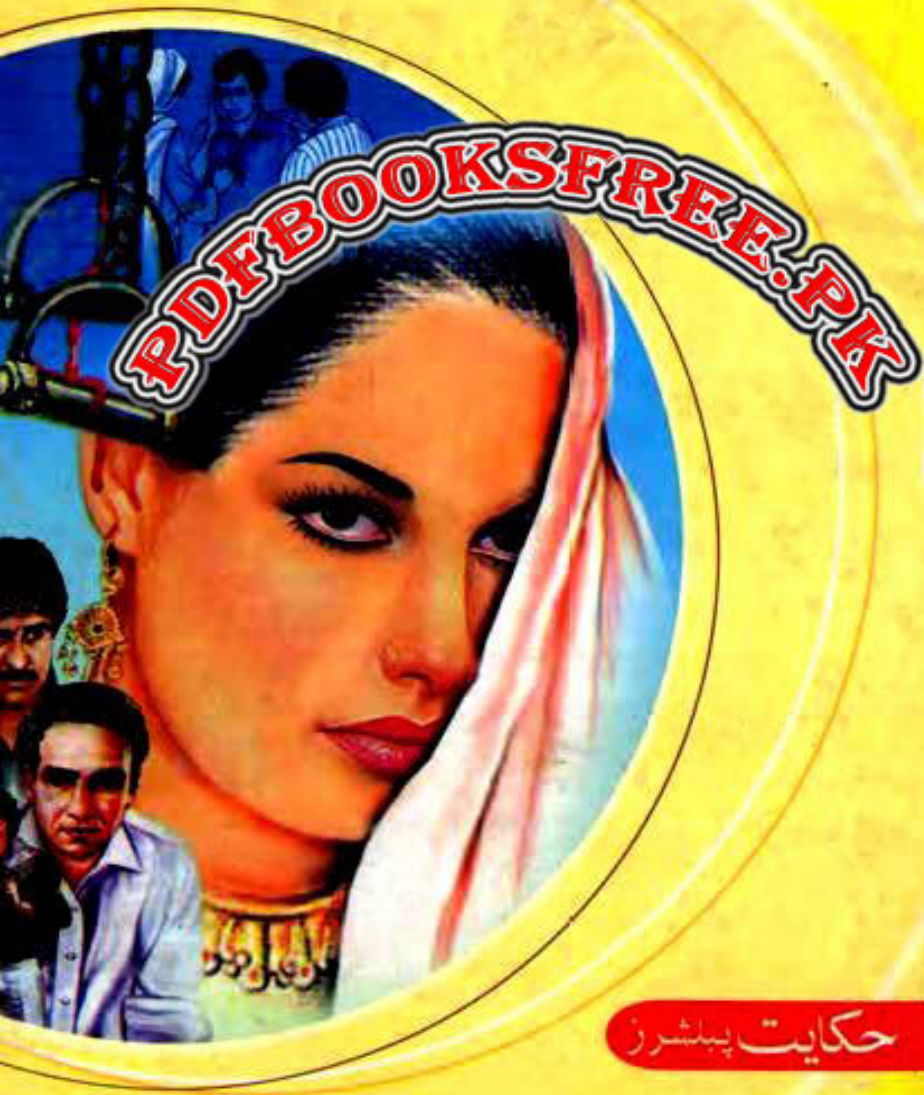
حکایت پبلشرز

پیش لفظ

ڈی ایس پی آغا ریاض احمد کی یادداشتوں سے 9 تفتیشی کہانیوں کا مجموعہ پیش کیا جارہا ہے۔ آغا ریاض احمد کا نام قارئین ''حکایت'' کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ ان کی تفتیشی کہانیاں کچھ عرصہ تواتر سے ''حکایت'' میں چھپتی رہی ہیں۔ 5 مارچ 2004ء کو ان کی وفات کی وجہ سے یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا اور اس طرح سینکڑوں تفتیشی کہانیاں مرحوم کے ساتھ ہی دفن ہو گئیں۔

آغا صاحب 1950ء کی دہائی میں پنجاب کے مختلف علاقوں میں ایس ایچ او رہے اور ڈی ایس پی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ چھچھ کے ایک خوشحال زمیندار گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ پولیس کی سروس ان کی ضرورت نہیں بلکہ شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سروس ریکارڈ بے حد شاندار اور بے داغ رہا۔ ان کی طبیعت میں عاجزی اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ایک پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ بہت اچھے شاعر بھی تھے حالانکہ پولیس کی سخت نوکری اور شاعری جیسی لطیف صنف دو متضاد چیزیں ہیں۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے ''اندازِ جنوں'' اور ''ریزۂ الماس'' کے علاوہ نعتیہ کلام پر مشتمل مجموعہ ''طلوعِ رسولؐ'' منظر عام پر آچکے ہیں۔

یہ تفتیشی کہانیاں چونکہ 50ء کی دہائی کی ہیں اور پنجاب کے دور دراز علاقوں سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے ان میں آپ کو کہانی کی دلچسپی کے ساتھ ان علاقوں کے دلچسپ رسم ورواج بھی ملیں گے۔ یہ افسانے نہیں حقیقی کہانیاں ہیں اور ان کے کردار نئے پرانے ہر دور میں وہی رہتے ہیں، صرف نام اور چہرے بدل جاتے ہیں۔

ادارہ حکایت پبلشرز اپنے وعدے کے مطابق اس نوع کی کہانیاں پیش کر رہا ہے جو افسانے نہیں اور انگریزی سے ترجمہ بھی نہیں بلکہ حقیقی زندگی کی وارداتیں ہیں۔

قارئین سے استدعا ہے کہ وہ خود بھی یہ کہانیاں پڑھیں اور اپنے بچوں کو بھی پڑھائیں تاکہ وہ اخلاق سوز اور دیومالائی لٹریچر سے بچے رہیں۔

مدیر

''حکایت''

فہرست

ماں اور طوائف

''حکایت'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں جہاں جہاں بھی ''حکایت'' پڑھا جاتا ہے، علمی اور ادبی حلقوں میں پاکستانی لٹریچر کو روشناس کرایا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے محترم عنایت اللہ نے شب و روز محنت کی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جرم و جاسوسی اردو ادب کا حصہ نہیں بن سکتی اور اردو ادب میں اس معیار کی کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی جیسی انگریزی میں لکھی جاتی ہے۔

عنایت اللہ مرحوم اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے تھے اور ان کا کہنا تھا۔۔۔ ''مجھے یہ دلیل اس لئے پسند نہیں کہ ہمارے معاشرے میں نہ صرف یہ کہ جرم و جاسوسی کا وجود ہے بلکہ ہمارے ہاں جرم کا اس قدر عمل دخل ہے کہ مجرم ذہنیت کے افراد معاشرے کے باعزت افراد بن جاتے ہیں اور وہ سرکاری مشینری کے کل پرزوں کو اپنی مٹھی میں لے لیتے ہیں۔ اس ''اونچے'' طبقے سے نیچے آ کر دیکھو تو ہمیں وہ لوگ نظر آتے ہیں جو ہتھکڑیوں کو زیور، پولیس والوں کو اپنے برادران نسبتی اور جیل خانے کو سسرال کا گھر سمجھتے ہیں۔ جرم و جاسوسی ایک بدنام صنف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہمارے ہاں ترجموں کے ذریعے آئی ہے اور صرف ان کہانیوں کے تراجم شائع کئے گئے ہیں جن میں فحش رومان انگیزی اور کردار سوز لذت پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے گھٹیا ادب مقبول ہوا اور اچھے ذوق کے لوگوں نے اسے دھتکار دیا''۔

میں بہ حیثیت ریٹائرڈ پولیس افسر، مرحوم سے اتفاق کرتا ہوں کہ سراغرسانی کرنے یا کہانی لکھنے کی صلاحیت صرف انگریزوں تک محدود نہیں، ہمارے اپنے ملک میں بے انتہا ایسی کہانیاں موجود ہیں۔ عنایت اللہ مرحوم نے احمد یار خان، محبوب عالم اور راؤ شجاع الدین ابوبکر جیسے پاکستانی پولیس افسروں کی تفتیشی کہانیاں پیش کر کے اس بات کو ثابت بھی کر دیا ہے۔ میں نے بھی مرحوم کے کہنے پر لکھنا شروع کیا تھا۔

قتل کی ایک واردات کی تفتیش پیش کر رہا ہوں۔ اس کہانی میں آپ کو تفتیش اور سراغ رسانی دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ اس کے بجائے انسان کی نفسیات قابل غور ہے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی شخص ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کر لے تو ایک بھونچال سا آ جاتا ہے اور لعن طعن سے بڑھ کر نوبت قتل تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ انسان کی نفسیات ہے کہ وہ برائی پر اتر آئے تو شیطان بھی کان پکڑتا نظر آتا ہے اور یہی انسان جب نیکی پر اتر آئے تو فرشتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں صوبہ پنجاب کے ایک ضلع کے چھوٹے سے شہر کے تھانے میں تعینات تھا۔ ایک دن سہ پہر تین بجے کا وقت ہو گا، ایک ادھیڑ عمر عورت تھانے میں آئی۔ اس کے ساتھ دو مرد بھی تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ ایک عورت مر گئی ہے اور ان لوگوں کو شک ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انہیں یہ شک کیوں ہے کہ اس عورت کو قتل کیا گیا ہے۔ دونوں مردوں میں سے ایک نے بتایا کہ لاش کی حالت ایسی ہے جس سے شک ہوتا ہے کہ مقتولہ نے خود کوئی زہریلی چیز کھا لی ہے یا کسی نے اسے زہر کھلا دیا ہے۔

میں نے دیکھا کہ عورت بالکل نہیں بول رہی تھی، صرف دونوں مرد بول رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ رپورٹ کس کی طرف سے درج ہو گی تو دونوں مردوں نے عورت کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ وہ دونوں اس عورت کے محلے دار ہیں۔ میں نے اس عورت سے نام پوچھا تو اس نے اپنا نام شادو بتایا اور مرنے والی کا نام سردار بیگم بتایا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مرنے والی سے اس کا کیا رشتہ ہے اور کیا اس کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ اس نے جو جواب مجھے دیا، اسے سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔

شادو نے بتایا کہ مرنے والی اس کی سوکن تھی اور ان کا شوہر تقریباً آٹھ نو ماہ پہلے فوت ہو گیا تھا۔ سوکن کا لفظ سنتے ہی میرے ذہن میں سوکنوں کی روایتی دشمنی اور چپقلش آ گئی۔ بہرحال میں نے رپورٹ درج کی اور شادو کے گھر چلا گیا۔ سردار بیگم کی لاش ایک چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے لاش کی ظاہری حالت دیکھتے ہی یقین کر لیا کہ اس کی موت زہر خورانی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ میں نے لاش قبضے میں لے کر موقعے پر ضروری کاغذی کارروائی کی اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی اور خود تفتیش میں لگ گیا۔

میں نے موقعہ کا گہری نظروں سے معائنہ کیا۔ ایک طرف تام چینی کی ایک پلیٹ میں تھوڑا سا حلوہ پڑا ہوا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس میں سے حلوے کی زیادہ تر مقدار کھائی جا چکی ہے۔

میں نے حلوہ اپنے قبضے میں لے کر کیمیکل ایگزامینر کے پاس بھجوا دیا۔ مجھے شک تھا کہ مقتولہ کو اس حلوے میں زہر دیا گیا ہو گا۔ بہرحال حلوے کی رپورٹ آنے پر ہی پتہ لگ سکتا تھا کہ زہر حلوے میں دیا گیا ہے یا کسی اور طریقے سے۔

میں نے شادو سے جو معلومات حاصل کیں ان کے مُطابق شادو اور سردار بیگم کے مشترکہ خاوند کا نام مسعود احمد تھا۔ وہ کاروباری آدمی تھا اور چھوٹا موٹا کاروبار کرتا تھا۔ شادو مسعود احمد کی دوسری بیوی تھی اور سردار بیگم پہلی بیوی تھی۔ سردار بیگم مسعود احمد کے رشتے داروں میں سے تھی جبکہ شادو کا ان کے خاندان بلکہ برادری سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ سردار بیگم سے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی جبکہ شادو سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ میں نے شادو سے پوچھا کہ بچے کہاں ہیں تو اس نے جواب دیا کہ لڑکی کی شادی ہو چکی ہے اور دونوں بیٹے الگ رہتے ہیں۔ دونوں شادی شدہ ہیں۔ میرے پوچھنے پر شادو نے بتایا کہ ان کو اطلاع بھجوا دی ہے۔

میں نے شادو سے تمام تفصیلات پوچھیں جو مختصراً بیان کر دیتا ہوں۔ مسعود احمد کا کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ اس نے شادو کے ساتھ چوری چھپے شادی کی تھی اور اس کو الگ کرائے کے مکان میں رکھا ہوا تھا۔ مسعود احمد نے یہ راز کسی کو نہیں بتایا تھا۔ زندگی بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ پھر وہ وقت آیا جب مسعود احمد بیمار ہو گیا اور یہ بیماری طول پکڑتی گئی۔ جب مسعود احمد کو اپنے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو اس نے پہلی بیوی سردار بیگم کے سامنے یہ انکشاف کر دیا کہ اس نے چوری چھپے ایک اور شادی کر رکھی ہے۔ یہ سن کر سردار بیگم کو دکھ تو بہت ہوا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

مسعود احمد نے دوسری بیوی شادو کو بلا کر اس کا ہاتھ سردار بیگم کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ کوئی پتہ نہیں کب جان نکل جائے۔ شادو نے میری خاطر سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اب اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ میں تمہاری شرافت اور خاندانی ہونے کی وجہ سے اس کو تمہارے سپرد کرتا ہوں۔

سردار بیگم نے شوہر کے سامنے وعدہ کیا کہ وہ شادو کا ہر طرح سے خیال رکھے گی اور اس کو اکیلا بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گی۔ اس واقعے کے چند روز بعد مسعود احمد فوت ہو گیا۔ سردار بیگم نے اپنے شوہر کی وصیت کو دل و جان سے تسلیم کر لیا اور شادو سے کہا کہ وہ اسے سوکنوں کی طرح نہیں بلکہ بہنوں کی طرح رکھے گی۔ سردار بیگم نے شادو کو اپنے پاس بلا لیا مگر اس کے دونوں بیٹے اس بات سے خوش نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے شادو کو سوتیلی ماں کی حیثیت سے قبول کیا۔ اس وجہ

سے گھر میں آئے روز لڑائی جھگڑا رہنے لگا۔

ان حالات سے تنگ آ کر سردار بیگم شادو کو لے کر اسی کرائے کے مکان میں آ گئی جہاں پہلے شادو رہا کرتی تھی۔ بیٹی بیاہی گئی تھی اور دونوں بیٹے بھی شادی شدہ تھے اور اپنی زندگی میں مگن تھے۔ اس لئے انہوں نے ماں کے جانے کی پرواہ نہ کی۔ دونوں بیٹوں نے دکھاوے اور دنیا داری نبھانے کے لیے کئی بار اپنی ماں سردار بیگم سے کہا کہ وہ ان کے پاس آ جائے لیکن اس شرط پر کہ شادو ساتھ نہ ہو۔ سردار بیگم نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ مرتے دم تک اپنے شوہر کی وصیت پر عمل کرے گی اور شادو کا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔

باپ کے کاروبار اور بینک میں جمع شدہ رقم پر بڑے بیٹے شریف نے بہانوں بہانوں سے قبضہ کر لیا تھا۔ سردار بیگم اور شادو پریشانی سے دوچار ہو گئیں۔ سردار بیگم پڑھی لکھی تھی۔ اس نے گھر پر محلے کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا اور اس کے علاوہ بچیوں کو قرآن بھی پڑھانے لگی۔ شادو نے قریب کے لڑکیوں کے سکول کی ہیڈ مسٹریس سے اپنی مشکل بیان کی تو اس نے شادو کو سکول کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے رکھ لیا۔ اس طرح ان کو اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی اور گھر کا خرچہ آسانی سے چلنے لگا۔

سردار بیگم کبھی مہینے پندرہ دنوں بعد اپنے بیٹوں سے ملنے چلی جاتی تھی۔ بڑے بیٹے شریف کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہ ہوتا تھا۔ وہ ماں سے یہی کہتا تھا کہ شادو کو چھوڑ دے اور گھر آ جائے لیکن سردار بیگم کسی طرح بھی یہ بات ماننے پر تیار نہ تھی۔ شریف کو اس پر بہت غصہ آتا تھا۔

بہرحال سردار بیگم بڑے عزم اور ہمت سے وفا کی پتلی بنی اپنے مرحوم شوہر سے کیا ہوا وعدہ نبھا رہی تھی اور شادو بھی اس کے ساتھ پورا تعاون کر رہی تھی۔

اب میں واقعات کو مختصر کر کے بات اس روز پر لے آتا ہوں جس روز سردار بیگم مر گئی تھی۔ شادو سکول سے چھٹی کے بعد کام کاج سے فارغ ہو کر گھر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ سردار بیگم مردہ پڑی ہوئی تھی۔ شادو نے چیخ و پکار کی تو محلے دار اکٹھے ہو گئے۔ کچھ سمجھدار لوگوں نے رائے دی کہ پولیس کو اطلاع دینا ضروری ہے۔ انہوں نے لاش کی حالت دیکھ کر شک ظاہر کیا کہ اس کو زہر دیا گیا ہے یا اس نے خود زہر کھا لیا ہے اس لیے پوسٹ مارٹم ضروری ہے۔

اس طرح دو آدمی شادو کو ساتھ لے کر میرے پاس تھانے میں آ گئے۔ یہ وہی آدمی تھے جنہوں نے تھانے میں رپورٹ درج کرانے کا مشورہ دیا تھا۔

شام تک پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی۔ ڈاکٹر نے واضح الفاظ میں لکھا تھا کہ مقتولہ کی موت زہر خورانی کے باعث ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے یہ بھی لکھا تھا کہ مقتولہ کے معدے میں غیر ہضم شدہ حلوہ پایا گیا اور یہ حلوہ زہریلا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ مقتولہ کو حلوے میں ملا کر زہر دیا گیا ہے۔ پھر کیمیکل ایگزامنر سے حلوے کی رپورٹ بھی آ گئی۔ اس رپورٹ میں لکھا تھا کہ حلوے کا جو نمونہ تجزیے کے لیے بھیجا گیا ہے وہ زہریلا ہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ کیمیکل ایگزامنر نے لکھا تھا کہ حلوے میں سنکھیا پائی گئی ہے۔

یہاں میں قارئین کی معلومات میں اضافے کے لیے بتادوں کو سنکھیا کو سم الفار بھی کہتے ہیں اور انگریزی میں اسے Arsenic کہا جاتا ہے۔ شیشہ اور رنگ تیار کرنے ولی دوائیوں میں، سیاہیوں میں اور مہلک جنگی گیس تیار کرنے میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ سیسے میں سنکھیا ملا کر گول چھرے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوائیوں کی تیاری میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ انسانوں کے لیے اس کا براہِ راست استعمال مہلک ہوتا ہے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ اور کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ آنے سے پہلے میرا ایک خیال یہ بھی تھا کہ یہ اتفاقیہ ہو سکتا ہے کہ حلوے میں پکاتے وقت کوئی زہریلا کیڑا مکوڑا گر گیا ہو اور مقتولہ کو اس کا علم نہ ہوا ہو۔ میں نے شادو سے پوچھا تھا کہ گھر میں حلوہ پکایا گیا تھا تو شادو نے کہا تھا کہ گھر میں حلوہ نہیں پکایا گیا۔ اگر پکایا گیا ہوتا تو وہ برتن یا کڑاہی میں موجود ہوتا لیکن کھانے پکانے والے برتن صاف تھے۔

اب پوسٹ مارٹم رپورٹ اور کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ سردار بیگم کو قتل کیا گیا ہے یا سردار بیگم نے خودکشی کر لی ہو لیکن پھر میں نے یہ سوچ کر اس خیال کو رد کر دیا کہ اگر وہ خودکشی کرتی تو حلوہ گھر میں پکاتی اور زہر ملاتی جبکہ اس روز گھر میں حلوہ پکایا ہی نہیں گیا تھا۔ اب سوچنے والی بات یہ تھی کہ زہریلا حلوہ کہاں سے آیا؟ ایسا کون دشمن ہو سکتا ہے جو سردار بیگم کو یہ زہریلا حلوہ دے گیا؟ سردار بیگم معمر عورت تھی اور اس کے پاس جائیداد بھی نہیں تھی کہ جائیداد کی خاطر کوئی اسے قتل کر دیتا۔ وہ نوجوان اور حسین بھی نہیں تھی کہ کسی رقابت کی وجہ سے قتل ہو جاتی۔ یہ سوالات میرے ذہن میں ایک سوالیہ نشان بن کر جم گئے تھے اور جواب نہیں مل رہا تھا۔

میں نے شادو سے پوچھا کہ کسی کے ساتھ کوئی دشمنی یا لڑائی جھگڑا تو نہیں ہے۔

''نہیں جی!'' ــــ شادو نے میرے سوال کے جواب میں کہا ــــ ''میری سوکن سردار بیگم

کی کسی کے ساتھ دشمنی یا لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ تو بڑی ہی پیاری اور موم عورت تھی۔ میں نے اسے کبھی غصے میں نہیں دیکھا۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایسی عورت کا کون دشمن ہو سکتا ہے''۔

''کسی پر کوئی شک؟''___ میں نے پوچھا۔

''بالکل نہیں جی!''___ شادو نے کورا جواب دیا۔

میں نے شادو سے بہت سوال کئے۔ اسے طرح طرح سے کریدا مگر اس نے ایسا کوئی اشارہ نہ دیا جس سے مجھے قاتل کے متعلق کوئی اشارہ مل سکتا۔ میں بہت پریشان ہو گیا۔ یہ قتل میری عقل اور سمجھ سے باہر تھا اور میرے لیے ایک معمہ بن گیا تھا۔ پوچھ گچھ اور کارروائیوں میں رات ہو چکی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ مقتولہ کے دونوں بیٹے بھی آئے ہوئے ہیں۔ میں ان سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا لیکن پتہ لگا کہ مقتولہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد گھر آ گئی ہے۔ وہ لوگ کفن دفن کے انتظامات میں لگ گئے اور میں تھانے آ گیا۔ میں نے اگلے دن مقتولہ کے بیٹوں کو تھانے بلانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے امید تھی کہ ان سے کام کی کوئی نہ کوئی بات ضرور معلوم ہو جائے گی۔

اگلے دن میں نے مقتولہ سردار بیگم کے دونوں بیٹوں کو تھانے بلا لیا۔ دونوں آ گئے۔ میں نے ان کے ساتھ افسوس کا اظہار کیا اور ان سے بھی پوچھا کہ ان کی کسی کے ساتھ دشمنی یا لڑائی ہو تو مجھے بتائیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ میرے ساتھ بات صرف بڑا بیٹا شریف کرتا تھا۔ چھوٹا بیٹا اس کی تائید میں سر ہلا دیتا تھا۔

''ہماری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں ہے''___ شریف نے جواب دیا___ ''نہ ہی کبھی ہمارا کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوا ہے۔ اس لیے آپ یہ بات ذہن سے نکال دیں''۔

''کسی پر کوئی شک؟''___ میں نے پوچھا۔

''ہاں، مجھے شادو پر شک ہے''___ شریف نے کہا۔

میں شریف سے یہ سن کر بہت حیران ہوا۔ یہ تو شادو نے بتایا تھا کہ شریف اس سے نفرت کرتا ہے اور اس کا گھر میں رہنا پسند نہیں ہے لیکن اس حد تک نفرت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''اس شک کی کوئی وجہ؟''___ میں نے شریف سے پوچھا۔

''ایسی عورتوں سے ہر قسم کی امید رکھی جا سکتی ہے''___ شریف نے نفرت بھرے لہجے میں

کہا۔

''ایسی عورتوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''___ میں نے حیران ہو کر پوچھا___ ''وہ تمہاری سوتیلی ماں ہے''۔

''شادو طوائف ہے''___ شریف نے کہا___ ''میں نے اسے کبھی ماں نہیں سمجھا۔ ایسی عورتیں پیسے کی بھوکی ہوتی ہیں۔ یہ ہماری لاعلمی میں ہمارے باپ کو کھاتی رہی ہے۔ ہو سکتا ہے ہماری ماں کے پاس ہمارے باپ کی دی ہوئی کوئی خفیہ رقم ہو جسے ہتھیانے کے لیے اس نے ہماری ماں کو زہر دے دیا ہو...... ایسی بازاری عورتوں کا کیا بھروسہ کہ کب دغا دے جائیں''۔

یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا اور خاصا سنسنی خیز انکشاف تھا۔ شادو نے یہ بات مجھ سے چھپائی تھی اور چھپانی چاہئے بھی تھی۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ایسی باتیں چھپائی جاتی ہیں۔ میں نے شریف سے پوچھا کہ اسے کس طرح یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ اس کی سوتیلی ماں شادو طوائف ہوا کرتی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے مرحوم باپ کے ایک دوست نے اسے یہ بات بتائی تھی۔ اس دوست کو اس خفیہ شادی کے متعلق بھی معلوم تھا۔ مسعود احمد کے مرنے کے بعد اس دوست نے شریف کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اُڑتی اُڑتی یہ بات کچھ اور لوگوں کو بھی معلوم ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شریف شادو کے خلاف تھا اور اپنی ماں کا اس کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔

میں نے شریف کے ساتھ اور بھی بہت سی باتیں کیں لیکن شریف ہر بات کو کھینچ تان کر اس کا رخ شادو کی طرف کر دیتا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ مقتولہ سردار بیگم کو شادو نے زہر دے کر مارا ہے۔ پولیس والے ذرا ذرا سی بات کھنگالنے بیٹھ جاتے ہیں اور ہر کسی کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ شریف کی باتوں میں کچھ وزن تھا اس لیے اب شادو میری نظروں میں مشکوک ہو گئی تھی۔ بڑی عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ مدعیہ خود مشتبہ ہو گئی تھی۔

میں نے شریف کے چھوٹے بھائی ادریس سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ بہت کم بولنے کا عادی معلوم ہوتا تھا اور میرے ہر سوال کا مختصر ترین جواب دیتا تھا۔ زیادہ تر سوالوں کے جواب ہاں یا ناں میں دیئے تھے۔ میں نے دونوں بھائیوں کو بھیج دیا اور کہا کہ ان کی ضرورت پڑی تو میں انہیں بلا لوں گا۔

میں نے ہر پہلو پر غور کیا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ میں نے اپنے مخبر بھی محلے میں پھیلا دیئے تھے۔ مجھے امید تھی کہ وہ کوئی کام کی بات معلوم کر لیں گے۔ میں نے مخبروں سے خاص طور پر

یہ کہا تھا کہ وہ یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ مقتولہ سردار بیگم اور شادو کے آپس میں تعلقات کیسے تھے۔ کیا ان میں کبھی جھگڑا ہوا تھا...... قتل والے دن مقتولہ کے گھر کون کون آیا تھا، کسی نے پلیٹ میں کوئی چیز لے کر آتے کسی کو دیکھا ہو وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور اسی قسم کی باتیں معلوم کرنے کو کہا تھا۔

یہ کیس میرے لیے دردِ سر بن گیا تھا۔ بظاہر یہ ایک قتل کا کیس تھا لیکن اس لحاظ سے مشکل تھا کہ دور دور تک کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ یہ ایسا قتل تھا جس پر قتل کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ نہ لڑائی جھگڑا نہ دشمنی، نہ دولت نہ جائیداد، نہ حسن و جوانی نہ شادی کا جھگڑا۔ میں نے بہت مغز مارا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ لے دے کر ایک شادو ہی رہ جاتی تھی جس پر شریف نے شک ظاہر کیا تھا۔ میں نے شادو سے اس شک پر پوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

سردار بیگم کی موت کے بعد شادو اکیلی رہ گئی تھی۔ وہ اکثر سردار بیگم کو یاد کرکر کے روتی رہتی تھی۔ سکول کی ہیڈ مسٹریس نے اس کی یہ حالت دیکھی تو شادو کو سکول میں ہی رہنے کے لیے ایک کمرہ دے دیا تھا۔ یہ بات مجھے لوگوں سے معلوم ہوئی تھی۔ مخبروں نے سردار بیگم اور شادو کے متعلق جو رپورٹیں دیں، وہ سب ملتی جلتی تھیں۔ ان کا خلاصہ بیان کردیتا ہوں۔ دونوں میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتی تھیں۔ کھانا اکٹھے کھاتی تھیں۔ ایک دوسرے کے کپڑے دھوتی تھیں۔ محلے میں ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود میں نے شادو سے پوچھ گچھ کرنا ضروری سمجھا۔ واقعات اور حالات ایسے تھے کہ شادو پر بھی شک کیا جاسکتا تھا کہ اس واردات میں اس کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اسے اس گرلز سکول کا پتہ سمجھا کر کہا کہ وہ سکول کی چھٹی کے بعد وہاں چلا جائے اور وہاں سے شادو کو تھانے لے کر آئے۔ ہیڈ کانسٹیبل چلا گیا اور میں ایک بار پھر اس اندھے قتل کے تانے بانے میں الجھ گیا۔ سوچ سوچ کر میرا سر دکھنے لگا تو میں ذہن کو سکون دینے کے لیے دوسرے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

اڑھائی بجے کا وقت ہوگا جب ہیڈ کانسٹیبل شادو کو لے کر آگیا۔ شادو کے ساتھ ایک معزز سی عورت بھی تھی۔ اس عورت نے اپنا تعارف کرایا تو پتہ لگا کہ وہ اس اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہے جہاں شادو کام کرتی ہے۔ میں نے دونوں کو بٹھا لیا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں ہیڈ مسٹریس نے بتایا کہ وہ شادو کے ساتھ اس لیے آئی ہے کہ شادو بہت گھبرا رہی تھی کہ پتہ نہیں

تھانے میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔

میں نے ہیڈ مسٹریس کو تسلی دی کہ شادو سے صرف پوچھ گچھ کرنی ہے، وہ پریشان نہ ہو اور شادو کو تھانے میں چھوڑ جائے۔ میرے تسلی دینے پر ہیڈ مسٹریس شادو کو حوصلہ اور دلاسہ دے کر چلی گئی۔ میں نے شادو کے دل سے تھانے کا خوف دور کرنے کے لیے اس کے ساتھ ہمدردانہ باتیں شروع کردیں اور باتوں کا رخ اس کے مرحوم خاوند کی طرف موڑ دیا۔ خاوند کے ذکر پر وہ جذباتی ہوگئی اور اپنے خاوند کی تعریفیں اس طرح کرنے لگی جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی فرشتہ ہو۔

"کیا یہ بات سچ ہے کہ تم طوائف ہو؟"___ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی شادو سے یہ سوال پوچھ لیا۔ یہ میری مجبوری تھی۔

میرا سوال سن کر اسے جھٹکا سا لگا اور اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہوگیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

"ہوں نہیں، کبھی تھی"___ شادو نے کہا اور سر جھکا لیا۔ پھر ایک جھٹکے سے اس نے جھکا ہوا اوپر اٹھایا اور غصے سے بولی___ "یہ بات آپ سے شریف نے کہی ہوگی کہ شادو طوائف ہے۔ اس کے باپ نے گندگی کی دلدل سے نکال کر مجھے عزت دی تھی۔ اس حساب سے میں اس کی ماں لگتی ہوں لیکن سوتیلا بیٹا مجھے ماں تو کیا سمجھتا، وہ تو مجھے اپنے باپ کی بیوی کی بجائے باپ کی رکھیل سمجھتا ہے"۔

شادو کی یہ بات سن کر مجھے دلچسپی محسوس ہوئی اور میں نے شادو سے کہا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو پوری تفصیل سے بتائے کہ اس کی شادی مسعود احمد کے ساتھ کیسے ہوئی تھی۔ شادو نے مجھے بتایا کہ وہ ساری بات سنانے کو تیار ہے لیکن بات بڑی لمبی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ہر بات تفصیل سے سنائے اور وقت کی پرواہ نہ کرے۔ اس کے جواب میں شادو نے اپنی زندگی کی ساری داستان تفصیل سے سنادی اور جو مختصر کر کے آپ کو سنا دیتا ہوں۔

شادو کا اصل نام شمشاد بیگم تھا اور گھر والے اسے شادو کہتے تھے۔ شادو کا باپ ایک سرکاری دفتر میں چپڑاسی تھا۔ یہ غریب لوگ تھے اور تنگی ترشی سے گزارہ کرتے تھے۔ شادو کے علاوہ چار اور تھے۔ دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ شادو ان سب سے بڑی تھی اور پہلی اولاد ہونے کی وجہ لاڈلی تھی۔ باپ اس کی ہر خواہش پوری کرتا تھا۔ اس وجہ سے شادو کی عادتیں بگڑ گئی تھیں اور وہ اپنی بات منوانے کی عادی ہوگئی تھی۔

پانچ بچے ہو جانے کی وجہ سے گھر کے اخراجات میں اضافہ ہو گیا تو شادو کے باپ نے دفتر سے چھٹی کے بعد بازار میں تکے کباب بیچنے شروع کر دیئے۔ یہ کام چل نکلا اور اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔ اس طرح گھر کے حالات بہتر ہو گئے۔ شادو اگرچہ غریب کے گھر پیدا ہوئی تھی مگر اللہ نے اس کو حسن کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ باپ نے پانچ جماعتیں پڑھانے کے بعد اسے سکول سے اٹھا لیا تھا کہ ان کے خاندان میں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہ تھا۔ یوں شادو گھر میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔

شادو کو فلموں اور فلمی گانے سننے کا بڑا شوق تھا۔ فلم تو اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی لیکن فلمی ہیرو اور ہیروئنیں اس کے ذہن پر سوار رہتی تھیں۔ وہ بھی اپنے آپ کو کسی ہیروئن سے کم نہ سمجھتی تھی۔ باپ نے اس کی ضد سے مجبور ہو کر اسے ایک ٹرانزسٹر ریڈیو لے دیا تھا جس پر وہ بڑی باقاعدگی سے گانے سنتی تھی۔ جب سے وہ جوان ہوئی تھی، محلے کے نوجوان لڑکوں کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ ان میں سے ایک لڑکا اسے اچھا لگتا تھا۔ اس کا نام جمال تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔

جمال اچھی شکل و صورت کا گورا چٹا نوجوان تھا۔ اس کے رشتے دار لاہور میں رہتے تھے اور وہ اکثر لاہور جاتا رہتا تھا۔ شادو کی پسندیدگی بڑھ کر چوری چھپے ملاقاتوں تک پہنچ گئی اور پھر وہ جمال کے عشق میں ایسی اندھی ہوئی کہ گھر سے بھاگنے کو تیار ہو گئی۔ جمال نے اسے بتایا تھا کہ لاہور میں اس کی بڑی جان پہچان ہے اور وہ ضرور شادو کو کسی فلم میں ہیروئن کا رول دلوا دے گا۔

پھر ایک روز دن دیہاڑے شادو ماں سے ایک سہیلی کے گھر جانے کا کہہ کر ہمیشہ کے لیے اس گھر سے نکل آئی جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ جہاں ماں باپ نے اسے گود کھلایا تھا اور اس کے ناز نخرے دیکھے تھے۔ اس ماں کو چھوڑ آئی جس نے اس کا گوہ موتر دھویا تھا اور اپنی چھاتیوں سے اس کے بدن میں زندگی دوڑائی تھی۔ اس باپ کو چھوڑ آئی جس نے ادھار پیسے لے کر بھی اس کی ہر خواہش، ہر ضد پوری کی تھی۔

یہاں پہنچ کر شادو نے بتایا کہ گھر سے نکلتے وقت اس کے ذہن میں یہ ساری سوچیں آئی تھیں مگر پھر ان سوچوں پر جمال کا طلسم غالب آ گیا اور لاہور کی فلمی دنیا کی چکا چوند کے تصور نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا اور عقل پر پردہ ڈال دیا۔ شادو نے کہا کہ نوجوان اور کچے ذہن کی لڑکیوں کو ایسے اندھے اور منہ زور جذبات سے بچنا چاہئے اور ہر حال میں والدین کی عزت کو مقدم

رکھنا چاہئے ورنہ گھر سے نکلنے والی ہر لڑکی کا حال میرے جیسا ہو گا۔

اپنی زندگی کی داستان سناتے ہوئے اس مقام پر پہنچ کر شادو ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ میں نے اسے کھل کر رونے دیا۔ جب وہ رو رو کر ہلکی ہو گئی تو اس نے آگے بات شروع کر کی۔

جمال نے شادو کو بتا رکھا تھا کہ وہ گھر سے نکل کر کہاں پہنچے۔ شادو مقررہ جگہ پہنچی تو جمال اس کا منتظر تھا۔ جمال اپنے گھر سے اچھی خاصی رقم چوری کر کے لے آیا تھا۔ وہاں سے وہ ریل گاڑی میں بیٹھے اور لاہور آ گئے۔ لاہور میں جمال اسے اپنے ایک دوست کے گھر لے گیا۔ یہ چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ جمال کا دوست وزیر آباد کا رہنے والا تھا اور لاہور میں نوکری کرتا تھا۔ وہ اکیلا رہتا تھا۔ اس دوست نے جمال اور شادو کو ایک کمرہ دے دیا جو خالی تھا۔ دوسرے کمرے میں دوست کا سامان تھا۔ انہوں نے رات وہاں گزاری۔ صبح ہوئی تو جمال کا دوست بازار سے ناشتہ لے آیا۔ ناشتے کے بعد دوست دفتر چلا گیا اور شادو اور جمال کوارٹر میں اکیلے رہ گئے۔

دوست کے جانے کے بعد جمال نے شادو کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ شادو نے اسے روکا تو جمال نے کہا کہ فلموں میں کام کرنے کے لیے اسے یہ جھجک اور شرم اتارنی ہو گی۔ پھر ہر روز جمال اپنے دوست کے جانے کے بعد شادو کی شرم اتارنے لگا۔ شرم اتری تو پھر کپڑے اترے اور پھر جمال نے شادو کی ایسی شرم اتاری کہ وہ شرم و حیا کے ساتھ ساتھ اپنی عزت سے بھی دستبردار ہو گئی۔ یوں ایک حیادار حوازادی بے حیا ہو گئی۔

جمال کا دوست اندھا نہیں تھا۔ جان بوجھ کر اندھا بنا ہوا تھا۔ اس کو پتہ تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ وہ موقعے کے انتظار میں تھا کہ لوٹ کے مال میں سے اپنا حصہ وصول کرے۔ ادھر شادو نے جمال کو زور دینا شروع کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کر لے مگر جمال نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا کہ فلم والے شادی شدہ لڑکی کو ہیروئن نہیں لیتے۔ اگر انہیں پتہ لگ گیا کہ لڑکی شادی شدہ ہے تو وہ صاف انکار کر دیں گے۔

اس طرح شادو کو گھر سے بھاگے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا۔ اس دوران جمال یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ ایک فلم کمپنی والوں سے بات چیت کر رہا ہے کہ وہ شادو کو اپنی اگلی فلم میں ہیروئن لے لیں۔ ایک روز جمال شادو سے یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ ایک اور فلم کمپنی والوں سے بات کرنے جا رہا ہے۔ امید ہے کہ کام بن جائے گا۔ جمال چلا گیا تو اس کا دوست آ گیا اور اس نے شادو کے ساتھ وہی

حرکتیں شروع کر دیں جو جمال کرتا رہا تھا۔ شادو نے مزاحمت کی تو وہ زبردستی پر اتر آیا۔ شادو بے بس اور کمزور تھی۔ کچھ بھی نہ کر سکی۔ طوائف کا پھر بھی کچھ مول ہوتا ہے لیکن شادو تو لوٹ کا مال تھی۔ جس کا دل چاہا لوٹ لیا۔ پہلے جمال اکیلا لوٹ رہا تھا اب ایک اور لیٹرا آ گیا تھا۔

جمال واپس آیا تو شادو نے اسے ساری بات سنائی۔ یہ سن کر جمال غصے میں آ گیا اور اپنے دوست کے ساتھ جھگڑنے لگا۔

''یہ کہاں کی شریف زادی ہے؟'' ــــ دوست نے طنزیہ لہجے میں کہا ــــ ''تمہارا اس سے رشتہ کیا ہے؟ زیادہ بک بک کرو گے تو تھانے اطلاع کر دوں گا۔ پھر تم دونوں کا جو حال ہو گا وہ تم سوچ بھی نہیں سکتے...... یہاں رہنا ہے تو میری مرضی سے رہنا ہو گا''۔

دوست کی یہ بات سن کر جمال خاموش ہو گیا۔ اگلے دن اس نے شادو سے کہا کہ اس نے ایک جگہ بات کر لی ہے اور وہ وہاں جا رہے ہیں۔ دوست دفتر چلا گیا تو دونوں اس کے کوارٹر سے نکل گئے۔ جمال اسے ایک ایسے علاقے میں لے گیا جہاں فلم کمپنیوں کے دفتر تھے اور چاروں طرف فلمی بورڈ لگے ہوئے تھے۔ جمال اسے ایک چھوٹے سے دفتر کے اندر لے گیا۔ دفتر میں تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ دفتر کی فضا سگریٹ کے بدبودار دھوئیں سے بوجھل ہو رہی تھی۔ ان آدمیوں نے شادو کو اس طرح دیکھا جس طرح قصائی گائے کو دیکھتے ہیں۔ ان کی نظریں کسی برمے کی طرح شادو کے بدن کو چھیدنے لگیں۔ ان کی نظروں میں ستائش کے بجائے ہوس صاف نظر آ رہی تھی۔ شادو گھبرا کر سمٹنے لگی تو جمال نے اسے سمجھایا کہ وہ گھبرائے نہیں، یہ فلم کے ہدایت کار اور پروڈیوسر وغیرہ ہیں۔

''اچھی طرح دیکھ لیں راٹھور صاحب!'' ــــ جمال نے بڑی میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے موٹے سے آدمی سے کہا ــــ ''ہیرا ہے ہیرا...... آپ اسے اپنی فلم میں ہیروئن لے کر گھاٹے میں نہیں رہیں گے''۔

''لڑکی تو ٹھیک ہے'' ــــ راٹھور نے شادو کو تولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ــــ ''خرچہ کچھ کم کر دو''۔

''آپ کی مرضی راٹھور صاحب!'' ــــ جمال نے دوٹوک انداز میں کہا ــــ ''خرچہ کم نہیں ہو گا۔ اگر آپ کو منظور نہیں تو میں کسی اور ڈائریکٹر سے بات کر لیتا ہوں...... ایسی ہیروئن کا تو منہ مانگا معاوضہ ہونا چاہئے''۔

تھوڑی رد و قدح کے بعد راٹھور نے ایک لفافہ اپنی میز کی دراز سے نکالا اور جمال کو دے دیا۔ جمال نے لفافہ جلدی سے جیب میں ڈال لیا۔ راٹھور نے کہا کہ اس معاہدے کی خوشی میں مٹھائی ہونی چاہئے۔ اس نے ایک نوٹ نکال کر جمال کو دیا کہ وہ جا کر مٹھائی لے آئے۔ جمال نے شادو کو کہا کہ وہ گھبرائے نہیں، وہ ابھی مٹھائی لے کر آتا ہے۔

جمال کو گئے کافی دیر ہو گئی تو شادو کا دل گھبرانے لگا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک آدمی نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے چٹخنی لگا کر بند کر دیا اور شادو سے کہا وہ آرام سے بیٹھی رہے۔ شادو پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی یہ سن کر وہ رونے لگی۔ ایک آدمی نے ڈانٹ کر کہا وہ رونا دھونا بند کرے اور خاموشی سے بیٹھی رہے۔ مگر شادو چپ نہ ہوئی۔ وہ موٹا آدمی جسے جمال نے راٹھور کہا تھا، اس نے اپنے آدمی سے کہا سلا دو یار، یہ تو تنگ کر رہی ہے...... ویسے جمال ہمیشہ اچھی چیز لے کر آتا ہے۔

ایک آدمی نے شیشی لے کر اپنے رومال پر اس میں سے کوئی دوائی ڈالی اور پھر رومال شادو کی ناک سے لگا دیا۔ شادو کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا اور پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو وہ ایک کمرے میں تھی۔ پھر اس کے ساتھ اس کمرے میں وہی شیطانی کھیل کھیلا جانے لگا۔ فرق صرف یہ تھا کہ شیطان بدل گئے تھے۔ راٹھور کی زبانی شادو پر اس ہولناک اور شرمناک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اس کا یار جمال اسے ان لوگوں کے ہاتھ بیچ کر چلا گیا ہے۔ راٹھور نے اسے یہ بھی کہا کہ جب ان کا دل اس سے بھر جائے گا تو وہ اسے طوائفوں کے ہاتھ بیچ دیں گے۔

ماں باپ نے اس کا شمشاد بیگم رکھا تھا اور دنیا اب اسے شادو بائی بنانے جا رہی تھی۔ اس نے وہاں سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک دن اسے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اس دن راٹھور اس کے پاس آیا تو اس نے بہت زیادہ شراب پی رکھی تھی اور وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ ذرا سی دیر کے بعد راٹھور نشے میں دھت ہو کر گہری نیند سو گیا۔ شادو نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی تو اسے کچھ چھوٹے بڑے نوٹ مل گئے۔ نوٹ شادو نے اپنے لباس میں چھپا لئے اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا اور وہ شیطان جاتے ہوئے دروازہ باہر سے بند کر کے جاتے تھے۔ اس دن چونکہ راٹھور ابھی اندر تھا، اس لیے دروازہ کھلا تھا۔

رات کا وقت تھا۔ شادو نے باہر نکل کر دیکھا۔ یہ ایک کوٹھی تھی۔ اسے ارد گرد کوئی نظر نہ آیا۔ وہ بڑی احتیاط سے چھپتی چھپاتی کوٹھی کے گیٹ تک پہنچی مگر گیٹ پر اندر کی طرف تالا لگا ہوا تھا۔ شادو

نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے لان میں ایک کرسی پڑی نظر آئی۔ شادو نے کرسی دیوار کے ساتھ رکھی اور اسی پر چڑھ کر دیوار پر چڑھ گئی اور پھر وہاں سے باہر کی طرف کود گئی۔ اس نے باہر نکل کر جائزہ لیا۔ یہ چھوٹی بڑی کوٹھیوں کا علاقہ تھا۔ شادو وہاں سے تیز تیز چلتی نکل آئی اور مین روڈ پر پہنچ گئی۔ مین روڈ پر ٹریفک چل رہی تھی۔ شادو ریلوے سٹیشن تک جانا چاہتی تھی لیکن اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف جائے۔ کسی سے پوچھتے ہوئے وہ ڈرتی تھی کہ کسی غلط آدمی کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔

شادو نے بہتر یہی سمجھا کہ کسی رکشے میں بیٹھ جائے اور اس سے کہے کہ سٹیشن پہنچا دے۔ پیسے اس کے پاس کافی تھے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور ایک رکشے والے نے اسے لاہور ریلوے سٹیشن پہنچا دیا۔ سٹیشن پر پہنچ کر اس نے سوچا کہ وہ جائے گی کہاں؟ گھر واپس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے خودکشی کے متعلق بھی سوچا لیکن اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ اپنی اس زندگی کے متعلق سوچنے لگی جو اس نے اپنے ماں باپ کے گھر گزاری تھی۔ پھر گھر چھوڑنے کے بعد اس پر جو گزری اس کے متعلق سوچنے لگی۔ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ وہ اس وقت چونکی جب ایک درمیانی سی عمر کے آدمی نے اس سے پوچھا کہ اسے کیا پریشانی ہے اور وہ کیوں رو رہی ہے؟

شادو نے آنسو پونچھ کر اس آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ شکل سے ہی ایک سلجھا ہوا اور شریف انسان نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے نرمی جھلک رہی تھی۔ اس آدمی نے شادو کو دلاسہ دیا کہ وہ بالکل نہ گھبرائے اور اسے بتائے کہ کیا پریشانی ہے۔ اس آدمی نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ اس طرح کھڑی روتی رہے گی تو کسی غلط آدمی کے ہتھے چڑھ جائے گی۔ یہ سن کر شادو لرز کر رہ گئی۔

شادو نے بتایا کہ اس آدمی کے انداز میں اتنی شفقت اور اپنائیت تھی کہ اس کا جی چاہا سب کچھ بتا دے۔ شادو نے مختصر لفظوں میں اپنی داستانِ اَلم اسے سنا دی۔ ساری بات سن کر اس آدمی نے اسے تسلی دی کہ وہ اس کی پوری پوری مدد کرے گا۔ اس آدمی نے اسے کہا کہ وہ اپنے گھر کا پتہ بتائے تاکہ وہ اسے گھر پہنچا دے۔ شادو نے کہ وہ کسی بھی صورت گھر واپس نہیں جائے گی۔ پھر اس آدمی نے کہا کہ اگر وہ اس پر اعتماد کرے تو اس کے ساتھ چلے۔ شادو تھوڑی سی دیر میں ہی اس آدمی سے متاثر ہو گئی تھی۔ اس نے اس پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔

یہ آدمی مسعود احمد تھا۔ مسعود احمد اسے اپنے ایک دوست کے گھر لے گیا۔ پھر اگلے دن ایک کرائے کا مکان لے کر اپنے کچھ دوستوں کو وہاں بلایا اور شادو سے باقاعدہ نکاح پڑھوا لیا۔ نکاح

سے پہلے مسعود احمد نے شادو کو بتا دیا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کے بچے بھی ہیں۔ شادو نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ اس طرح شادو مسعود احمد کی دوسری بیوی بن کر ایک الگ مکان میں رہنے لگی۔ مسعود احمد نے اس شادی کو خفیہ رکھا۔ صرف ان چند دوستوں کو اس شادی کا علم تھا جو اس میں شریک ہوئے تھے۔

مسعود احمد نے بڑی کامیابی سے اس شادی کو نبھایا اور کبھی شادو کو کوئی تکلیف یا شکایت نہیں ہونے دی۔ شادو نماز روزے کی پابند ہو گئی اور جی جان سے مسعود احمد کی خدمت کرنے لگی۔ وہ رو رو کر اللہ سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگتی تھی۔ اس کے ساتھ جو ظلم ہوا تھا اس کی وجہ سے اس کے جسمانی نظام میں کوئی ایسی خرابی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ماں نہ بن سکی۔ مسعود احمد نے کبھی شادو کو اس بات پر طعنہ نہ دیا تھا۔

پھر وہ وقت آیا جب مسعود احمد شدید بیمار ہو گیا اور اس کے بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی مسعود احمد نے شادو سے کہا کہ ایسا نہ ہو میرے مرنے کے بعد تم دربدر ہو جاؤ۔ میری پہلی بیوی بہت نیک اور سعادت مند ہے۔ میں تمہیں اس کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ وہ تمہارا پورا خیال رکھے گی۔ پھر مسعود احمد نے اپنی پہلی بیوی سردار بیگم کے آگے اپنی دوسری شادی کا انکشاف کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ شادو کا ساتھ کبھی نہ چھوڑے۔ سردار بیگم ایسی شوہر پرست بیوی تھی کہ اس اللہ کی بندی نے مرتے دم تک اپنا عہد نبھایا۔ اپنے بچوں کو چھوڑ دیا لیکن شادو کا ساتھ نہ چھوڑا۔

اپنی داستان سنا کر شادو پھر رونے لگی اور میں سوچنے لگا کہ ذرا سی غلطی کی شادو کو کتنی بھیانک سزا بھگتنا پڑی۔ یہاں میں کہانی سے ہٹ کر بات کروں گا۔ ہوسکتا ہے کسی کو اعتراض ہو کہ شادو کی کہانی میں لچر پن ہے لیکن میں نے اس داستان کو اس لیے تفصیل سے شامل کیا ہے کہ نوعمر اور نوجوان لڑکیاں اور لڑکے اس عمر میں بڑی جلدی متاثر ہو جاتے ہیں اور برا بھلا سوچے بغیر گھر سے نکل جاتے ہیں۔ خاص طور پر لڑکیوں کے لئے گھر کی چار دیواری سے بڑھ کر کوئی محفوظ جگہ نہیں ہوسکتی۔ شادو کی کہانی میں نے عبرت حاصل کرنے کے لیے بیان کی ہے۔ اگر اس سے نوجوان لڑکے لڑکیاں عبرت حاصل کریں گے تو اس کو لکھنے کا حق ادا ہو جائے گا۔

شادو کے اتنے لمبے بیان سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ سردار بیگم کی کتنی عزت کرتی تھی۔ یہ ناممکن سی بات تھی کہ وہ سردار بیگم کو زہر دے کر ہلاک کرتی۔ میں نے شادو سے کچھ اور باتیں پوچھ کر اسے بھیج دیا۔ شادو چلی گئی تو میں پھر سردار بیگم کے قاتل کے متعلق سوچنے لگا۔ مجھے

کوئی ذرا سا بھی اشارہ مل جاتا تو میں اپنی پوری توانائیاں صرف کر کے قاتل کا سراغ ڈھونڈ نکالتا۔ مخبر بھی ناکام رہے تھے اور میرے کام کی کوئی بات معلوم نہ کر سکے تھے۔ البتہ ایک مخبر نے ایسی رپورٹ دی تھی جو سردار بیگم کے بڑے بیٹے شریف کے خلاف شک پیدا کرتی تھی۔ اب میں نے اسی پہلو پر تفتیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس مخبر نے بتایا کہ شریف شادو کے خلاف تو تھا ہی لیکن جب اس کی ماں سردار بیگم نے اس کی بات نہ مانی اور شادو کا ساتھ نہ چھوڑا تو وہ ماں کے بھی خلاف ہو گیا۔ وہ کہتا تھا کہ ماں اس کی بے عزتی کرا رہی ہے اور لوگ ان پر تھو تھو کر رہے ہیں کہ جوان بیٹوں کے ہوتے ہوئے ماں کرائے کے مکانوں میں ٹھوکریں کھا رہی ہے اور بچوں کو پڑھا کر دال روٹی پوری کرتی ہے۔ شریف نے اپنی پوری کوشش کر کے دیکھ لی مگر سردار بیگم کسی صورت بھی شادو کا ساتھ چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئی۔ سردار بیگم کا کہنا تھا کہ وہ اپنے مرحوم خاوند کی وصیت پر مرتے دم تک عمل کرے گی۔

مخبر نے یہ بھی بتایا کہ شریف کو یہ کہتے بھی سنا گیا تھا کہ بہتر ہوتا ماں بھی باپ کے ساتھ ہی مر جاتی، اس طرح بدنامی تو نہ ہوتی۔ شریف لوگوں کے طرح طرح کے سوالوں سے بڑا پریشان تھا اور کئی لوگوں سے اس کا جھگڑا بھی ہوا تھا۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ شادو مسعود احمد کی دوسری بیوی ہے اور مسعود احمد نے چوری چھپے ایک اور شادی کر رکھی تھی تو لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بنانی شروع کر دیں۔ شریف کو اپنے مرے ہوئے باپ پر بھی بڑا غصہ تھا کہ وہ خود تو مر گیا تھا مگر ان کے لیے بدنامی چھوڑ گیا تھا۔

میں نے ان تمام باتوں پر غور کیا تو مجھے شریف کا کردار مشکوک لگنے لگا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ شریف کو شاملِ تفتیش کر لوں۔ سردار بیگم کو قتل ہوئے تین دن گزر گئے تھے اور میں ابھی تک ابتدائی تفتیش میں پھنسا ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگلے دن صبح پہلا کام یہی کروں گا کہ شریف کو بلا کر اس پر دباؤ ڈالوں گا کہ اپنی ماں کو اس نے خود زہر دے کر مارا ہے اور اس کی وجہ بھی موجود ہے۔

اگلے دن میں نے اپنے اے ایس آئی سے کہا کہ وہ مقتولہ سردار بیگم کے بڑے بیٹے شریف کے دفتر چلا جائے اور اسے تھانے لے آئے۔ شریف ایک سرکاری محکمے میں سٹینو تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو اس کے دفتر کے متعلق سمجھا کر کہا کہ وہ ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے جائے۔ اے ایس آئی اسی وقت چلا گیا۔

اے ایس آئی چلا گیا تو میں دل ہی دل میں اللہ سے دعا کرنے لگا کہ کوئی راستہ مل جائے، اندھیرے میں روشنی کی کوئی کرن نظر آ جائے۔ میں اسی ادھیڑ بن میں بیٹھا تھا کہ اب تفتیش کو کس طرح آگے چلاؤں کہ ایک کانسٹیبل نے مجھے بتایا کہ دو عورتیں مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ وہ انہیں میرے پاس بھیج دے۔ کانسٹیبل چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد دو عورتیں اندر آ گئیں۔ ان میں سے ایک تو شادو تھی اور دوسری کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

میں نے ان کو بٹھا لیا۔ شادو کے ساتھ آنے والی ایک جواں سال عورت تھی اور لباس اور چہرے سے معزز نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنا تعارف کرایا تو پتہ چلا کہ وہ اس اسکول میں استانی ہے جہاں شادو نوکری کرتی ہے۔ میں نے ان سے آنے کا مقصد پوچھا تو استانی نے کچھ کہے بغیر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیگ کو کھولا اور اس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر میرے آگے رکھ دیا۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘ ـــــ میں نے اس سے پوچھا۔

’’پہلے آپ اسے پڑھ لیں‘‘ ـــــ استانی نے کہا ـــــ ’’اس کے بعد آپ کو ہر سوال کا جواب مل جائے گا‘‘۔

میں نے وہ کاغذ کھول کر دیکھا۔ یہ ایک رقعہ تھا جو شادو کے نام لکھا گیا تھا۔ میں نے رقعہ پڑھا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری دعا اتنی جلدی قبول ہو جائے گی۔ قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا تھا۔ اس رقعے نے میری ساری مشکلیں آسان کر دی تھیں۔ رقعے کا مضمون مجھے آج اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی یاد ہے۔ یہ رقعہ مقتولہ سردار بیگم نے شادو کے نام لکھا تھا۔

اس نے لکھا تھا کہ آج شریف میرے پاس حلوہ لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے بڑا اصرار کر کے حلوہ کھلایا۔ تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھا اور پھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میرا دل متلانے لگا اور سانس رکنے لگی۔ میں سمجھ گئی کہ بیٹا حلوے میں زہر کھلا گیا ہے۔ اب میں بچ نہیں سکوں گی۔ مرنے سے پہلے یہ تحریر لکھ کر صندوق میں رکھ رہی ہوں تاکہ کسی بے گناہ کو تنگ نہ کیا جائے۔ نیچے سردار بیگم نے اپنا نام لکھا تھا۔

اس رقعے سے ہر بات صاف ہو گئی تھی۔ میں نے استانی سے پوچھا کہ ان کو یہ رقعہ کہاں سے ملا ہے۔ استانی کے بجائے اس کا جواب شادو نے دیا۔ اس نے بتایا کہ یہ رقعہ سردار بیگم کے

صندوق سے ملا ہے۔ اس نے رقعہ ملنے کے متعلق ہر بات تفصیل سے سنائی۔ شادو کا بیان مختصراً پیش ہے۔

مقتولہ سردار بیگم کے پاس ایک بڑا ٹرنک تھا۔ جسے وہ ہر وقت تالا لگا کر رکھتی تھی۔ اس تالے کی چابی وہ اپنے سر کے بالوں میں پچھلی طرف گردن کے نیچے لٹکائے رکھتی تھی۔ شادو کو اس بات کا علم تھا۔ جس دن سردار بیگم گھر میں مردہ پائی گئی تھی تو شادو نے اس کے بالوں سے وہ چابی نکال کر اپنے پاس رکھ لی تھی۔ بعد میں شادو اس چابی کے متعلق بالکل بھول گئی۔ بھولنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ یہ ٹرنک زیادہ اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ شادو کو معلوم تھا کہ اس میں دولت تو ہو نہیں سکتی۔ مرحوم خاوند مسعود احمد کے چند جوڑے کپڑے اور کچھ تصاویر وغیرہ ہوں گی لہٰذا اس نے اس ٹرنک کو بالکل نہ چھیڑا۔

سردار بیگم کے مر جانے کے بعد شادو اسے یاد کر کے اکثر رو پڑتی تھی۔ یہ اسی دن کی بات ہے جس دن وہ میرے پاس تھانے میں رقعہ لے کر آئی تھی۔ شادو حسبِ معمول سردار بیگم کو یاد کر کے رو رہی تھی کہ ایک استانی، جو اس کے ساتھ تھانے آئی تھی، نے اسے پوچھ لیا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ شادو نے اسے بتایا کہ سردار بیگم کو فوت ہوئے اتنے دن ہو گئے ہیں۔ وہ گھر جا کر اپنی کچھ ضروری چیزیں لینا چاہتی ہے لیکن اب اس گھر سے اسے ڈر آتا ہے۔ استانی نے اسے کہا کہ چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ گھر پہنچ کر شادو نے وہاں سے اپنی ضرورت کا سامان اکٹھا کیا۔

اس کی نظر جب سردار بیگم کے ٹرنک پر پڑی تو اسے خیال آیا کہ اسے کھول کر دیکھے کہ اس میں کیا ہے۔ چابی شادو کے پاس تھی۔ اس نے تالہ کھولا تو اسے کپڑوں کے اوپر یہ رقعہ پڑا ہوا ملا۔ استانی نے وہ رقعہ پڑھا تو اس نے شادو کو ساتھ لیا اور وہیں سے اسے میرے پاس تھانے لے آئی۔

میں نے دونوں سے کچھ ضروری باتیں پوچھیں۔ پھر میں نے شادو سے پوچھا کہ گھر میں سردار بیگم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی تحریر مل سکتی ہے تو شادو نے بتایا کہ وہ چونکہ بچوں کو پڑھاتی تھی اس لیے اس کے ہاتھ کی تحریر آسانی سے مل جائے گی۔ میں نے ایک حوالدار کو شادو کے ساتھ بھیجا کہ وہ اس کے ساتھ جا کر سردار بیگم کے ہاتھ کی تحریر کا نمونہ لے آئے۔ پھر میں نے استانی اور شادو دونوں کا شکریہ ادا کیا اور ضرورت پڑنے پر ان کو پیش ہونے کے لیے کہا۔

شادو اور استانی کو گئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اے ایس آئی شریف کو لے کر آ گیا۔ مجھے اس شخص کو دیکھ کر ایک دم غصہ آ گیا۔ میں نے اے ایس آئی کو اشارہ کیا تو وہ اسے میرے پاس چھوڑ

کر باہر نکل گیا۔ اے ایس آئی اسے چھوڑ کر باہر نکلا تو شریف میرے کہے بغیر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"فوراً کھڑے ہو جاؤ"۔۔۔ میں نے میز پر زور سے بید کی چھڑی مار کر غصے سے کہا۔۔۔ "سامنے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ"۔

"کک۔۔۔۔۔۔کیا ہوا آغا صاحب؟"۔۔۔ شریف نے ہکا بکا ہو کر کہا۔۔۔ "مجھ سے کیا قصور ہو گیا ہے؟"

وہ میرے سامنے اداکاری کر رہا تھا اور مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے شادو کو اپنی ماں کا قاتل ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے میری تفتیش کو غلط رخ پر ڈالنے کی کوشش کی تھی اور خود مظلوم بنا بیٹھا تھا۔ وہ میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے غصے کے عالم میں بید کی چھڑی بڑے زور سے اس کے ہاتھ پر ماری تو وہ تڑپ کر اٹھا اور اپنا ہاتھ بغل میں دبا کر "سی سی" کرنے لگا۔ درد کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"فوراً اقبالی بیان دے دو"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "ورنہ تمہاری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دوں گا"۔

"کیسا اقبالی بیان جناب؟"۔۔۔ اس نے ڈھیٹ بن کر کہا۔

"اپنی ماں کو تم نے خود قتل کیا ہے"۔۔۔ میں نے اس کے قریب جا کر چھڑی اس کے حلقوم پر رکھ کر دباتے ہوئے کہا۔۔۔ "بکو۔۔۔۔۔جلدی بکو کیا ہے یا نہیں!"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں آغا صاحب!"۔۔۔ شریف نے تڑپ کر کہا۔۔۔ "بھلا میں اپنی ماں کو کیوں قتل کرنے لگا۔ مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ بڑا ہی ڈھیٹ ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے سردار بیگم کے ہاتھ کا لکھا ہوا رقعہ اس کی آنکھوں کے سامنے کر کے اسے کہا کہ اسے پڑھو۔ اس نے رقعہ لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے اس کا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے پیچھے جھٹک کر کہا کہ ایسے ہی پڑھو۔ کاغذ کا وہ ٹکڑا اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ اسے پڑھنے لگا۔

میں نے دیکھا، جوں جوں وہ پڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا اور آخر میں اس نے سر جھکا لیا۔

"یہ رقعہ تمہاری ماں کے ٹرنک سے ملا ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اب کیا کہتے ہو؟"

وہ منہ سے کچھ نہ بولا بس آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھتا رہا۔اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے۔تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اسے اقبالی بیان دینے کے لیے تیار کرلیا۔اس نے اپنے اقبالی بیان میں بتایا کہ اسے ماں کا شادو کے ساتھ رہنا سخت ناپسند تھا۔وہ ماں کو مجبور کرتا رہتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ گھر چلے لیکن اس کی ماں کسی صورت شادو کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔اس بات کا شریف کو بڑا رنج تھا۔اس کے بعد ایک اور ایسی بات ہوگئی جس نے شریف کو اور زیادہ غضب ناک کر دیا۔اس کے باپ مسعود احمد کے ایک دوست نے اسے شادو کے متعلق یہ بتایا کہ وہ ایک طوائف ہے اور اس کا باپ اسے لاہور کی ہیرا منڈی سے لایا تھا۔

ایسی ہی باتیں سن سن کر وہ کڑھتا رہتا تھا۔اسے اپنی ماں پر بہت غصہ آتا تھا جو اولاد کو چھوڑ کر ایک بازاری عورت کے ساتھ رہنے لگی تھی۔سوچ سوچ کر شریف نے اپنی ماں اور شادو دونوں کو زہر دے کر قتل کرنے کا منصوبہ بنالیا۔اس نے ایک حکیم جمعہ خان سے سنکھیا کا زہر لیا اور حلوہ تیار کر کے اس میں ملا دیا۔یہ حلوہ اس نے دونوں کو کھلانا تھا لیکن شادو کو اس دن سکول میں کام زیادہ تھا، اس لیے وہ وقت پر گھر نہ آسکی۔

شریف نے بڑا اصرار کر کے اپنی ماں کو حلوہ کھلایا اور کہا کہ شادو کو بھی ضرور کھلائے۔تھوڑی دیر کے بعد شریف نے محسوس کیا کہ اس کی ماں پر گھبراہٹ طاری ہو رہی ہے اور وہ کھینچ کر سانس لے رہی ہے تو وہ وہاں سے بھاگ آیا۔بعد میں اسے پتہ لگا کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔

''مجھے کیا پتہ تھا کہ ماں مرتے مرتے تحریر چھوڑ جائے گی''___ شریف نے ڈھٹائی سے کہا___ ''اگر مجھے ایسا شک ہوتا تو میں ماں کے مرنے کے بعد وہاں سے نکلتا اور یوں نہ پھنستا''۔

میں نے شریف کا بیان قلم بند کرلیا اور اس کے دستخط کرا لئے۔میں نے اس سے حکیم جمعہ خان کا پتہ پوچھ کر ایک کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل کو بھیجا کہ وہ اس حکیم کو گرفتار کر کے تھانے لے آئے۔جمعہ خان کو میں نے غیر قانونی زہر رکھنے کے جرم میں باقاعدہ گرفتار کرلیا۔

میں نے بڑی محنت سے مقدمہ تیار کیا اور کوئی خانہ خالی نہ چھوڑا۔شریف اپنے رشتہ داروں اور لوگوں کی لعنت ملامت کی وجہ سے اپنے اقبالی بیان پر قائم رہا۔اسے بیس سال قید کی سزا ملی۔جمعہ خان کو بھی دو سال قید کی سزا سنائی گئی۔اس طرح ایک بد بخت بیٹا اپنے انجام کو پہنچا۔

اُس رات کے پردے میں

آج سے 45 برس پہلے کا واقعہ ہے، میں ضلع خوشاب کے تھانہ نوشہرہ کا ایس ایچ او ہوا کرتا تھا۔اس علاقے کو وادیٔ سون سکیسر بھی کہا جاتا ہے۔یہاں اعوان قوم آباد ہے جو ابھی تک اپنی قدیم روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔یہ بڑی ہی دلیر، غیرت مند، مہمان نواز اور دوست نواز قوم ہے۔

میری ایک بات کو خاص طور پر ذہن میں رکھ لیں۔بات یہ ہے کہ اس واردات اور میری تفتیش کی داستان پڑھتے وقت اپنے شہر ماحول اور نئی تہذیب کو ذہن سے نکال دیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ شہروں اور قصبوں میں ہماری اصل تہذیب اور تمدن رہا ہی نہیں۔اس پر مغرب کا رنگ چڑھ گیا ہے اور مغرب کے اثرات نے شرم وحیا اور عزت وغیرت کو ہماری معاشرتی اقدار اور کردار سے غائب کر دیا ہے۔وہ خواتین وحضرات جو مغرب کے رنگ میں رنگے گئے ہیں میری اس تفتیشی کہانی کو وہ اہمیت نہیں دیں گے جس کی یہ حامل ہے۔اس حقیقی کہانی کی بنیاد ہی عزت وغیرت پر رکھی گئی ہے۔اگر آپ اس کہانی کی اصل روح کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ذہن میں وہ اوصاف اور خصائل پیدا کریں جو ایک غیرت مند قوم کی پہچان ہے۔

یہ واردات کوئی زیادہ پرانی نہیں۔1953ء کل کی ہی بات معلوم ہوتی ہے۔اپنے پاکستان کی ہی واردات ہے۔میں اپنے متعلق یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ضلع اٹک کے علاقہ چھچھ کا رہنے والا ہوں اور میرا تعلق پٹھان قبیلہ کے ساتھ ہے۔ایک تو میں مسلمان ہوں اور دوسرے پٹھان بھی ہوں اس لیے قومی تہذیب وتمدن، شجاعت۔غیرت اور مہمان نوازی کو اپنے ایمان کا جز سمجھتا ہوں۔یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وادیٔ سون سکیسر کے لوگ مجھے اچھے لگتے تھے۔میرے دل میں ان کی عزت اور ان کے دلوں میں میری عزت تھی۔

میں اس علاقے کا بھی تھوڑا سا ذکر کر دوں تو بے محل نہیں ہوگا۔چونکہ یہ علاقہ شاہراہِ

پاکستان سے خاصا ہٹ کر ہے اس لیے بہت کم لوگوں نے اسے دیکھا ہوگا۔ یہ سرسبز وشاداب علاقہ ہے۔ قدرتی مناظر حسین اور دلکش ہیں۔ کچھ علاقے میں مالٹے کے باغات ہیں۔ یہاں کا مالٹا عجیب وغریب قسم کی شیرنی کا حامل ہوتا ہے۔ بادام اور خوبانی جیسے پھلدار درخت بھی عام ہیں۔ چشموں اور کنوؤں کا پانی بڑے اچھے ذائقے والا، ٹھنڈا اور صحت وتندرستی کے لیے خاص طور پر مفید ہے۔ گرمی کی شدت نہیں ہوتی کیونکہ ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا چلتی رہتی ہے۔

تھانہ نوشہرہ آبادی سے تقریباً ایک کلومیٹر دور واقع ہے۔ یہ انگریزوں کا دستور تھا کہ وہ تھانے آبادیوں سے ہٹ کر بناتے تھے۔ میں جو واردات سنانے لگا ہوں یہ جاڑا نام کے ایک گاؤں کی ہے۔ مدعیہ اس گاؤں کی ایک عورت سیدو بی بی تھی۔ جس وقت یہ واردات ہوئی اس وقت میں اپنے علاقے میں ایک اور جگہ تفتیش پر گیا ہوا تھا اور ابھی دو چار دن وہیں قیام کرنا تھا۔ میرا اے ایس آئی سید اقبال حسین شاہ تھا جو اب مرحوم ہو چکا ہے۔

اے ایس آئی سید اقبال حسین شاہ مرحوم کے بارے میں بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں تو ابھی جوانی کی عمر میں تھا لیکن اس اے ایس آئی کی عمر اتنی ہو چکی تھی کہ میں اسے اپنا بزرگ تسلیم کرتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے اتنی زیادہ سروس ہو جانے کے باوجود ترقی کیوں نہ ملی، میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ بڑا ہی تجربہ کار پولیس آفیسر تھا اور اپنے فرائض اور میری ذات کے ساتھ تو وہ بہت ہی مخلص تھا۔ میں اکثر اس کے تجربے سے فائدہ اٹھایا کرتا تھا۔

میں اتنی طویل تمہید کی معافی چاہتا ہوں۔ اب اصل واردات کی طرف آتا ہوں۔

ایک روز صبح کے وقت تھانے میں سیدو بی بی جو ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ دو تین آدمیوں کے ساتھ تھانے میں آئی۔ اس نے رپورٹ یہ دی کہ گزشتہ رات اس کے گھر ڈاکہ پڑا ہے اور ڈاکو اپنے ہی ایک ساتھی کو گولی مار کر جان سے ہی مار گئے ہیں۔ یہ پتہ نہیں کہ یہ گولی اتفاقیہ چل گئی تھی یا کسی وجہ سے ساتھیوں نے دانستہ اس ساتھی کو گولی ماری تھی۔ ڈاکو تین تھے۔ وہ اپنے ساتھی کی لاش سیدو بی بی کے گھر ہی چھوڑ کر مال ومتاع لوٹ کر بھاگ گئے تھے۔

یہ رپورٹ تھانے کے محرر ہیڈ کانسٹیبل محمد علی نے لی۔ وہ خاصا تجربہ کار تھا۔ اس نے سیدو بی بی کے حوالے سے ایف آئی آر تحریر کر لی۔ یہ خاص طور پر نوٹ فرمائیں کہ ابھی پاکستان کے تھانوں میں آج والی ٹال مٹول شروع نہیں ہوئی تھی۔ محرر ہیڈ کانسٹیبل محمد علی کہہ سکتا تھا کہ نہ بڑا تھانیدار موجود ہے نہ چھوٹا تھانیدار اس لیے رپورٹ نہیں لی جا سکتی لہٰذا پھر کبھی آنا۔ میرے اس محرر نے اپنا

فرض دیانتداری سے پورا کیا۔ ایف آئی آر تحریر کی اور سیدو بی بی سے کہا کہ اب وہ پورا بیان دے کہ یہ واردات کس طرح ہوئی ہے۔

سیدو بی بی نے جو بیان دیا اور وہ اس طرح تھا کہ گزشتہ رات وہ روزمرہ معمول کے مطابق کھانا کھا کر اور دروازے کی اندر کی کنڈی لگا کر سو گئی۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو کراچی میں ملازمت کرتا تھا اور اس کی بہو اپنے میکے گھر گئی ہوئی تھی۔ اس کے میکے جانے کی وجہ یہ تھی کہ یہ رات شب برأت تھی اور سیدو بی بی نے حلوہ پکا کر بہو کو دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ شب برأت کی وجہ سے اپنے ماں باپ کے گھر ہی رہے۔ اس طرح سیدو بی بی گھر میں اکیلی تھی۔ اس کا خاوند وفات پا چکا تھا۔

رات آدھی گزر گئی تھی۔ ڈاکوؤں نے اس کے کمرے کے دروازے کا ایک کواڑ اکھاڑ لیا تھا اور اس طرح وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈاکوؤں نے دیوار پھلانگ کر صحن کے باہر والے دروازے کی کنڈی کھول لی تھی یا وہ کسی اور طریقے سے مکان میں داخل ہوئے تھے۔ سیدو بی بی ہڑبڑا کر جاگی۔ ایک ڈاکو کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ انہوں نے سیدو بی بی کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی اور کہا کہ وہ بتائے کہ نقدی اور زیورات کس جگہ رکھے ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ وہ تین آدمی تھے اور یہ اکیلی عورت تھی، اس نے ڈاکوؤں کے آگے ہاتھ جوڑے، روتے ہوئے منت سماجت کی۔

ڈاکو رحم کرنے کے لیے نہیں آیا کرتے اور پھر وہ بہت جلدی میں بھی ہوتے ہیں اس لیے انہوں نے دو ٹرنکوں کے تالے توڑے۔ نقدی اور زیورات انہی ٹرنکوں میں تھے جو ڈاکوؤں نے سمیٹ لئے۔ زیورات بہت قیمتی تھے اور رقم دو ہزار روپیہ تھی جو اس زمانے کی بہت بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔

اس دوران سیدو بی بی کو معلوم نہیں کہ کس طرح ایک ڈاکو کا پستول فائر ہوا۔ گولی ان کے اپنے ہی ایک ساتھی کے سر میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے دو ڈاکوؤں نے بڑی تیزی سے مال سمیٹا اور اپنے ساتھی کی لاش وہیں پھینک کر بھاگ گئے۔

سیدو بی بی نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ دوڑ کر صحن میں گئی اور شور مچایا۔ گاؤں کے کئی آدمی اس کے شور پر جاگ اٹھے اور اس کے گھر میں آئے۔ گاؤں کا نمبردار ملک یارن خان بھی آن پہنچا۔ نمبردار نے پہلا کام یہ کیا کہ جو کواڑ اکھاڑا گیا تھا وہ اپنی جگہ پر لگا دیا اور کہا کہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔

محرر ہیڈ کانسٹیبل نے یہ سارا بیان تحریر کرلیا۔ سیدو بی بی کا انگوٹھا لگوایا اور ایک نقل سیدو بی بی کو دے دی اور دو کانسٹیبلوں کو سیدو بی بی کے ساتھ اس کے گاؤں روانہ کر دیا تاکہ جائے واردات پر کوئی ردوبدل اور گڑبڑ نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایف آئی آر کی ایک نقل مجھے وہاں بھجوا دی جہاں میں ایک اور کیس کی تفتیش میں مصروف تھا اور ایک نقل اے ایس آئی سید اقبال حسین شاہ کو بھجوا دی جو کہیں اور اپنے فرائض میں لگا ہوا تھا۔

یہاں ایک بات ذہن میں رکھیں کہ میں اس قسم کی کوئی تفصیل نہیں لکھ رہا کہ فلاں سے بیان دن کے وقت لئے گئے یا رات کو یا میں نے فلاں کارروائی قتل کے کتنے دنوں بعد کی۔ آپ وقت اور دنوں کا خیال نہ کریں۔ میں لمحہ بہ لمحہ اپنی تفتیشی سرگرمیاں بیان کرتا جاؤں گا۔

مجھے جونہی اطلاع وقوعہ ملی میں اپنی گھوڑی پر سوار ہوا اور واردات والے گاؤں دن کے پچھلے پہر پہنچ گیا۔ دو کانسٹیبل وہاں موجود تھے۔ نمبردار ملک یارن خان بھی وہاں موجود تھا۔ سیدو بی بی گھر کے ایک کونے میں اداس اور پریشان بیٹھی تھی۔ کچھ لوگ صحن میں کھڑے تھے۔ ان سب کو باہر نکالا اور میں نے صحن میں کرسی رکھوا کر نمبردار کو پاس بٹھا لیا۔ جائے واردات دیکھنے سے پہلے میں نمبردار سے کچھ ضروری باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔

نمبردار نے ابھی بات شروع کی ہی تھی کہ سیدو بی بی میرے پاس آن کھڑی ہوئی اور رونا شروع کر دیا۔ وہ ادھیڑ عمر عورت تھی۔ صحت مندی کی وجہ سے عمر سے کچھ کم لگتی تھی۔ میں نے نمبردار کی بات وہیں رکوا دی اور مکان کے اندر کا جائزہ نظروں سے لینے لگا۔ صحن خاصا کشادہ تھا۔ ایک طرف کچھ مویشی بندھے ہوئے تھے۔ مکان پرانے زمانے کا بنا ہوا تھا اور اس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ یہ متوسط طبقے کا زمیندار گھر ہے۔

اب میں موقعۂ واردات دیکھنے کے لئے اٹھا۔ ایف آئی آر کے مطابق پہلے دروازے کا کواڑ دیکھا جو اکھاڑا گیا تھا۔ یہ تو میں نے دیکھ لیا کہ یہ دروازہ اتنا مضبوط نہیں تھا لیکن یہ بھی صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ آسانی سے اکھڑنے والا نہیں تھا۔ بہت زیادہ زور لگا کر یا کسی بڑے اوزار کے ذریعے کواڑ اکھاڑا جا سکتا تھا۔

میں نے اس کواڑ کو قانون قاعدے کے مطابق اپنے قبضے میں لے لیا اور اس کا فرد تیار کر لیا۔

نمبردار ملک یارن خان کو اور آبادی کے ایک معزز آدمی کو ساتھ لے کر میں کمرے میں داخل

ہوا۔ لاش فرش پر پڑی تھی۔ گولی اس کے سر کے بائیں طرف سر کے اوپر والے حصے میں لگی اور کھوپڑی میں سے نکل گئی تھی۔ دماغ یعنی مغز کھوپڑی سے تھوڑا سا باہر نکلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ خون بہہ بہہ کر جم گیا تھا۔ آنکھیں بھی کھلی ہوئیں اور منہ بھی کھلا ہوا تھا۔ یہ ایک توانا اور طاقتور آدمی کی لاش معلوم ہوتی تھی اور وہ قد آور بھی تھا۔ اس کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں۔

''جناب خان صاحب!''—— نمبردار نے گھبرائی ہوئی آواز میں بڑی تیزی سے کہا—— ''یہ تو ہمارے اپنے گاؤں کا آدمی سیدن شاہ ہے''۔

نمبردار نے مختصراً بتایا کہ مقتول بدکردار، بدمعاش اور جابر آدمی تھا۔ اس موقع پر معزز آدمی نے جو میرے ساتھ تھا۔ تصدیق کر دی کہ یہ اپنے گاؤں کا آدمی ہے اور اس شخص میں شرافت کا نام ونشان نہیں تھا۔ میں نے ابھی ان دونوں سے مقتول کے بارے میں کوئی اور بات نہ پوچھی۔ مجھے یہ خیال ضرور آیا کہ سیدو بی بی اسی گاؤں کی رہنے والی ہے اس مقتول سیدن شاہ کو اسی طرح جانتی ہو گی جس طرح نمبردار جانتا تھا لیکن تھانے میں دیئے ہوئے اپنے بیان میں اس نے یہ بتایا کہ مرنے والا اس کے گاؤں کا آدمی ہے جس کا نام سیدن شاہ ہے۔ میں نے اپنا یہ خیال ذہن میں محفوظ کر لیا اور پھر میں ملاحظہ موقعہ میں مصروف ہو گیا۔

لاش کے قریب چلم (حقہ) پڑی ہوئی تھی اور اس کے قریب فرش پر چلم کی ٹوپی سے پھینکا ہوا اور کچھ جلا ہوا تمباکو اور اس کی راکھ پڑی تھی۔ اسے میں نے خاص اہمیت دی۔

مجھے خیال یہ آیا تھا کہ اس علاقے میں چلم ہر گھر میں پی جاتی ہے لیکن یہ عادت مردوں میں ہے، عورتوں میں نہ ہونے کے برابر ہے اور اس گھر میں کوئی مرد نہیں۔ میں نے نمبردار کے کان میں کہا کہ وہ سیدو بی بی سے پوچھے کہ وہ چلم خود پیتی ہے؟...... نمبردار جواب لایا کہ سیدو بی بی چلم نہیں پیتی۔

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ پنجاب کے دوسرے علاقوں والا حقہ نہیں تھا جس میں ایک بار تمباکو بھر لیا جاتا ہے اور ساری محفل باری باری کش لگاتی ہے۔ یہ سیدھی نال والا حقہ ہوتا ہے جس پر چھوٹی سی ٹوپی دوسری نالی پر رکھی جاتی ہے اور ہر بار تھوڑا سا تمباکو ڈال کر ایک آدمی پیتا ہے اور راکھ پھینک دیتا ہے۔ میں نے فرش پر پھینکی ہوئی راکھ اور ادھ جلے تمباکو کا کچھ حصہ اپنے قبضے میں لے لیا اور اس کا بھی فرد تیار کر دیا۔ پھر میں موقعہ پر دوسری اشیاء دیکھنے لگا۔

لاش کے قریب ایک کرسی پڑی ہوئی تھی اور اس پر گدی رکھی تھی۔ لاش کے ساتھ ہی نوار کی

بنی چھوٹی چوکی پڑی تھی جسے پیڑھی کہتے ہیں۔ کمرے میں ایک طرف چار پائیاں اوران کے اوپر چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ میں نے جو انتہائی ضروری چیز دیکھی وہ دو ٹرنک تھے جن کے کنڈے ٹوٹے ہوئے تھے۔ سیدو بی بی کے بیان کے مطابق زیورات اور نقدی ان ہی ٹرنکوں میں سے ڈاکوؤں نے نکالے اور لے گئے تھے۔

اگر مرنے والا شخص کوئی اجنبی ہوتا جسے گاؤں کا کوئی بھی آدمی نہ پہچان سکتا تو اسے میں ڈاکے کا عام کیس سمجھتا اوراس کے مطابق تفتیش کرتا لیکن نمبردار نے یہ کہہ کر کہ یہ تو اپنے گاؤں کا آدمی ہے مجھے یہ اشارہ دے دیا تھا کہ میں تفتیش سنبھل کراور بہت ہی گہرائی میں جا کر کروں۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجنی تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے یہ بھی سوال کیا، کیا مقتول کو کوئی نشہ آور چیز دی گئی تھی؟

لاش کے قریب دو خالی پلیٹیں پڑی تھیں۔ ایک پلیٹ میں سالن کھایا گیا تھا جس کے نشانات صاف نظر آتے تھے۔ دوسری پلیٹ کو غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ اس میں حلوہ کھایا گیا ہے۔ ساتھ ہی پانی کا گلاس بھی پڑا تھا۔ یہ سارا نقشہ بتاتا تھا کہ یہاں بڑے آرام سے کھانا کھایا گیا ہے اور پھر چلم پی گئی ہے۔

میرے سراغرساں دماغ میں یہ خیال آیا کہ عورتیں ان برتنوں کو کبھی اس طرح اِدھر اُدھر پڑا نہیں رہنے دیتیں جن میں کھانا کھایا گیا ہو۔ دوسرا سوال ذہن میں یہ آیا کہ مقتول کو کیا اسی جگہ گر کر مرنا تھا جہاں برتن پڑے تھے اور چلم بھی رکھی ہوئی تھی؟ اگر چلم سیدو بی بی نے ہی پی تھی تو وہ اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتی لیکن اس نے تو صاف کہا تھا کہ وہ چلم نہیں پیتی اور گھر میں چلم پینے والا کوئی ہے ہی نہیں۔

اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر چلی ہوئی گولی کا سکہ مل گیا۔ اسے بھی میں نے قبضے میں لے لیا اور دوسری اشیاء کی طرح سربمہر کرلیا۔ موقعۂ واردات پر جو اشیاء قبضے میں لی جاتی ہیں انہیں باقاعدہ ایک خاص طریقے سے پیک کر کے سربمہر (سیل) کرلیا جاتا ہے پھر ان کے کاغذات تیار ہوتے ہیں اوران کاغذات پر گواہوں کے دستخط یا نشان انگوٹھا لئے جاتے ہیں۔ میں نے یہ کاغذات تیار کئے اور گواہوں کے دستخط کروائے اور پھر لاش نوشہرہ سول ہسپتال برائے پوسٹ مارٹم بھجوادی۔

سیدو بی بی کے بارے میں پہلے بتایا ہے کہ صحت مند جسم اوراچھی شکل وصورت کی عورت تھی اور متمول یعنی کھاتے پیتے زمیندار گھر کی عورت تھی۔ عام دیہاتی عورتوں کی طرح گنوار دیہاتن

نہیں تھی۔ اس کا ایک بیٹا جس کا نام رحمداد تھا کراچی میں ملازم تھا۔ دو بیٹیاں تھیں جو ساتھ والے گاؤں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ مویشیوں کے لیے اور گھر کی دیکھ بھال کے لیے ایک نوکر تھا۔ مزارعہ بھی تھا لیکن سیدو بی بی گھر میں بہو کے ساتھ رہتی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے گھر میں بہت سی عورتیں اکٹھی ہوگئی تھیں۔ میں وہاں سے نکلنے ہی لگا تھا کہ سیدو بی بی میرے پاس آگئی۔

''میری ایک عرض پر ضرور غور کرنا'' ـــــ سیدو بی بی نے بڑی آہستہ سے مجھے کہا ـــــ ''آپ تفتیش اسی طرح کریں جس طرح میں نے تھانے میں بیان لکھوایا ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ گاؤں میں پارٹی بازی ہے اور یہاں لوگ اپنی سیاست چلاتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ بعض لوگ آپ کے کانوں میں میرے خلاف غلط باتیں ڈالیں گے اور آپ کو گمراہ کریں گے''۔

''میں کسی کی باتوں میں نہیں آؤں گا سیدو!'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''میں یہ ساری باتیں سمجھتا ہوں''۔

میں نے اسے یہ بات کہی تو اس نے مجھے رشوت پیش کی۔ اس کی یہ پیشکش مجھے ناگوار گزری جو وہ سمجھ گئی لیکن مجھے اس شک میں ڈال دیا کہ یہ عورت اپنے مقصد کے مطابق تفتیش کروانا چاہتی ہے لیکن میں نے ان اشاروں پر تفتیش کرنی تھی جو میرے سامنے آئے تھے اور آنے والے تھے۔ بہرحال میں نے اسے یہ بھی کہا کہ تم اگر سچی ہو تو تمہیں کسی سے نہیں ڈرنا چاہئے نہ کوئی تمہارا مخالف مجھے گمراہ کرسکتا ہے۔

میں نے اسے یہ بات کہہ تو دی لیکن یہ بھی سوچا کہ اس نے مجھے یہ بات کیوں کہی ہے۔ یہ ڈاکہ زنی کی واردات تھی جس کی میں نے تفتیش کرنی ہی تھی، یہ میری سمجھ سے بالا تھا کہ اس میں مخالفین کی کیا سیاست چل سکتی ہے۔

اتنے میں میرا اے ایس آئی سید اقبال حسین شاہ مرحوم بھی دو کانسٹیبلوں کے ساتھ آگیا، میں نے پہلے بتایا ہے کہ وہ کسی اور جگہ ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا، اطلاع ملنے پر آگیا۔ میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ میرا یہ اے ایس آئی میرے دل میں ایک جہاندیدہ اور دانشمند بزرگ کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے اسے علیحدگی میں سنایا کہ میں نے اب تک کیا دیکھا اور کیا معلوم کیا ہے۔ میں نے اسے اپنے شکوک بھی بتائے۔

اب دیکھیں کہ اس وقت پولیس آفیسر اپنے فرائض میں کتنے چاق و چوبند اور مخلص تھے۔ سید اقبال حسین شاہ میرے پاس موضع جاڑا کی طرف آرہا تھا۔ اسے اس گاؤں کے ایک دو آدمی مل

گئے۔ اقبال حسین شاہ نے ان سے اس واردات کے بارے میں معلوم کرنا شروع کر دیا۔ اس توقع پر یوں کیا تھا کہ شاید کوئی اشارہ یا سراغ مل جائے۔ ان آدمیوں سے اسے کچھ باتیں معلوم ہو گئی تھیں جو میں آگے چل کر بیان کروں گا۔

اب صحیح طریقے سے تفتیش شروع کرنی تھی۔ نمبردار نے میرے کہنے پر ایک گھر میں ہمارے لئے بیٹھنے کا انتظام کر دیا۔ جیسا کہ آپ تفتیشی کہانیوں میں پڑھتے رہتے ہیں، ہر پولیس آفیسر پہلے پہلے واردات کے بارے میں مختلف ذرائع سے معلومات اور پس منظر معلوم کر لیتا ہے۔ میرے ان ذرائع میں ایک تو نمبردار تھا، محلے کے ایک دو معززین تھے اور پھر وہ خفیہ مخبر تھے جن کے بارے میں کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوتا کہ یہ پولیس کے مخبر ہیں۔

مجھے یہ تو یاد نہیں رہا کہ فلاں بات کس نے بتائی اور فلاں اشارہ کس سے ملا، میں وہ باتیں تحریر کر دیتا ہوں جو تفتیش شروع کرنے سے پہلے میری اور اے ایس آئی اقبال شاہ کی کوششوں سے معلوم ہوئیں۔ یہ تو بالکل واضح ہو گیا تھا کہ ڈاکہ زنی کی یہ واردات صرف ڈاکہ زنی نہیں بلکہ اس کے پیچھے کوئی اور بات بھی ہے۔ ایک بات تو سب سے پہلے معلوم ہو گئی۔

معلوم ہوا کہ یہ بات گاؤں کے ہر کس و ناکس کو معلوم ہے۔ بات یہ تھی کہ وقوعہ قتل سے دو مہینے پہلے سیدو بی بی کی بہو روشن بی بی کھیتوں کی طرف گئی ہوئی تھی۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے اسے مقتول سیدن شاہ راستے میں مل گیا اور اس نوجوان لڑکی کے ساتھ چھیڑ خانی کی۔ یہ صرف زبانی چھیڑ خانی نہیں تھی بلکہ کسی حد تک دست درازی بھی تھی۔ روشن بی بی نے شور مچایا اور سیدن شاہ کو گالیاں بھی دیں۔ سیدن شاہ بدمعاش قسم کا آدمی تھا۔ اس نے ہاتھا پائی میں اس لڑکی کا دوپٹہ اتار لیا یا شاید دوپٹہ سر سے سرک کر گر پڑا جو لڑکی وہیں چھوڑ کر گھر کو بھاگ آئی۔

گھر آ کر اس نے اپنی ساس سیدو بی بی کو بتایا کہ سیدن شاہ نے اس پر دست درازی کی ہے اور اس کا دوپٹہ اتار لیا ہے۔

عام طور پر دیہاتی علاقوں میں اور خصوصاً واردات والے اس علاقے میں کسی مرد کی یہ حرکت قابل معافی سمجھی نہیں جاتی تھی اور ایسے مرد کو واجب القتل قرار دے دیا جاتا تھا۔ کسی عورت کا دوپٹہ اتار لینے کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا جیسے اس شخص نے اس عورت کی جبری آبرو ریزی کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس علاقے میں آج بھی یہی دستور چل رہا ہے۔ کوئی مرد کسی عورت کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

سیدو بی بی نے اپنی بہو کی زبانی سیدن شاہ کی یہ حرکت سنی تو وہ غیض و غضب سے آگ بگولہ ہو گئی۔ اگر اس کے گھر میں کوئی مرد ہوتا تو اسی وقت سیدن شاہ یا اس گھر کا مرد قتل ہو جاتا۔ سیدو بی بی نے گھر میں مرد نہ ہونے کی مجبوری کے تحت یا کچھ اور سوچ کر خاموشی اختیار کر لی۔

اتفاق سے دو تین دنوں بعد کراچی سے اس کا بیٹا دو چار دنوں کی چھٹی پر آ گیا۔ آتے ہی اسے سیدن شاہ کی یہ حرکت معلوم ہوئی تو وہ اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ رحمداد خان ابھی نوجوانی کی عمر میں تھا اور سیدو بی بی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ سیدو بی بی ڈر گئی کہ اس کا بیٹا کہیں مارا ہی نہ جائے۔ وہ پہلے ہی بیوہ تھی۔ اس نے بیٹے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن یہ غیرت مند نوجوان کوئی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ ماں نے آخر اسے کہا کہ وہ پہلے ہی بیوہ ہے، اگر بیٹا بھی نہ رہا یا سیدن شاہ کو قتل کر کے سزائے موت یا عمر قید پا گیا تو پیچھے کوئی مرد نہیں رہے گا اور روشن بی بی کی عزت کی حفاظت ایک مسئلہ بن جائے گا۔

سیدو بی بی نے اپنے بیٹے رحمداد کو یہ بھی کہا کہ وہ اتنی بے غیرت اور ڈرپوک نہیں کہ وہ سیدن شاہ کو بخش دے گی، وہ اپنے تمام رشتہ داروں کو اکٹھا کر کے گاؤں میں پنچایت بٹھائے گی اور یہ پنچایت سیدن شاہ کو سزا دے گی۔

پھر مجھے یہ معلوم ہوا کہ سیدو بی بی نے اپنے بیٹے کو واپس کراچی بھیج دیا لیکن اس نے نہ اپنے رشتہ داروں کو اکٹھا کیا اور نہ پنچایت بٹھانے کی کوئی کوشش شروع کی۔ اس نے تو بالکل ہی خاموشی اختیار کر لی تھی۔

میں اور اے ایس آئی اقبال شاہ اس سوچ میں پڑ گئے کہ سیدن شاہ سیدو بی بی کے گھر کس طرح آیا اور اگر وہ ڈکیتی کی ہی نیت سے آیا تھا تو اسے اپنے ساتھیوں نے گولی کیوں ماری؟ کیا یہ گولی واقعی اتفاقاً چل گئی تھی؟ پھر یہ سوال کہ وہ دو آدمی کون تھے؟

مجھے ایک ایک خیال آیا۔ سیدو بی بی کی بہو روشن بی بی نے سیدن شاہ کی بہت بے عزتی کی تھی۔ اسے گالیاں بھی دی تھیں اور پھر سارے گاؤں میں اس کے خلاف یہ بات پھیلا دی تھی۔ سیدن شاہ کوئی شریف آدمی تو تھا نہیں نہ ہی وہ تعلیم یافتہ تھا کہ یہ سوچ کر دبک جاتا کہ اس نے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ بہت بری حرکت کی ہے اور لڑکی نے اپنا کچھ نہ کچھ ردِعمل تو ظاہر کرنا ہی تھا۔ سیدن شاہ کے کردار میں کوئی اچھائی نہیں تھی اور وہ اپنی اس حرکت کو جائز اور قابل فخر سمجھتا ہو گا اس لیے اس نے اپنی بے عزتی کا انتقام اس طرح لیا کہ دو آدمیوں کو ساتھ لے کر سیدو بی بی کے گھر

ڈکیتی کی واردات کردی۔ اسے معلوم ہوگا کہ اس عورت کے گھر میں زیورات بھی ہیں اور روپیہ پیسہ بھی۔ اگر ایسا ہی ہوا تھا تو پھر یہ واردات انتقامی تھی، اس کا مقصد لوٹ مار نہیں تھا۔ سیدن شاہ نے سارا مال اپنے دونوں ساتھیوں کو دے دیا ہوگا۔

یہ سوچ بھی آئی کہ سیدن شاہ اگر انتقام لینا چاہتا تھا تو وہ خود یہ واردات کرنے کے لیے کیوں گیا۔ وہ اتنا تو سوچ سکتا تھا کہ سیدو بی بی اسے پہچان لے گی۔ وہ دو تین آدمیوں کو بھیج دیتا اور خود نہ جاتا۔ میں نے معلوم کرلیا تھا کہ سیدن شاہ کوئی بیوقوف اور احمق آدمی نہیں تھا۔ یہ ساری باتیں جو میرے ذہن میں آرہی تھیں مجھے اس واردات کے بارے میں شک میں ڈال رہی تھیں اور اس شک کا مرکز سیدن شاہ اور اس کی موت تھی۔

میں مختلف اشخاص سے معلومات اور رائے لے رہا تھا۔ ایک شخص کو اٹھایا تو نمبردار یارن خان میرے پاس آبیٹھا۔ اس نے بات ذرا مختصر کی۔ کہنے لگا کہ اس کی رائے یہ ہے کہ سیدو بی بی کوئی معمولی سی دیہاتی عورت نہیں، بڑے اچھے اور باوقار خاندان کی عورت ہے اور یہ مانا ہی نہیں جاسکتا کہ اس نے سیدن شاہ کو اپنی بہو کی بے عزتی معاف کردی ہو۔ نمبردار نے رائے یہ دی کہ اسے پکا شک ہے کہ سیدو بی بی نے سیدن شاہ کو جھانسہ دیا اور اسے اپنے گھر بلوا کر قتل کروا دیا۔ میں نے اس کی بات پر غور کیا لیکن مسئلہ یہاں پر آکر الجھ جاتا تھا کہ جھانسہ کیسے دیا اور پھر ڈکیتی کی واردات میں سیدن شاہ کو کس طرح لایا گیا؟...... میں مان چکا تھا کہ ڈاکہ زنی ہوئی ہے اور ٹرنکوں کے تالے توڑ کر ڈاکو مال لے گئے ہیں۔

ملک یارن خان خود اونچے خاندان کا آدمی تھا اور پولیس جیسی عقل اور چھٹی حس رکھتا تھا۔ اس نے یہ رائے ویسے ہی نہیں دے دی تھی۔ نمبردار اپنے گاؤں کے ہر گھر اور بندے بندے پر نظر رکھتے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ کسی وقت کسی بھی شخص یا اس کے گھر کے بارے میں یہ معلومات پولیس کو مطلوب ہوسکتی ہیں۔ اس نمبردار کو ایک خاص بات معلوم ہوئی تھی اور اسی پر اس نے اپنی رائے دی تھی۔ میں نے جب اس سے تفصیل پوچھی تو اس نے بہتر سمجھا کہ یہ بات مجھے خود سنانے کی بجائے اس شخص کی زبانی سنائے جس سے اسے معلوم ہوئی تھی۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

وہ جلدی واپس آگیا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی کو میرے پاس بھیج دیا۔ اس کا نام کریم بخش تھا۔

میں نے اپنے مطلب کی خاطر اس کا استقبال بڑے احترام سے کیا۔ یہ لوگ جو اعوان تھے ایسی عزت افزائی کو بہت پسند کرتے تھے لیکن میں ان میں سے کسی کے ساتھ زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا تھا کیونکہ

بعض لوگ تھانیداروں کی بے تکلفی حاصل کرکے چھوٹی موٹی وارداتیں شروع کردیتے تھے۔

اس شخص کریم بخش نے صرف یہ بات بتائی کہ اس گاؤں میں ایک مراثن ہے جو جھاڑ پھونک کا کام کرتی ہے، تعویذ وغیرہ بھی دیتی ہے اور کچھ اُلٹے سیدھے عمل بھی کرتی ہے۔ اس عورت کا نام اس نے پھاتو بتایا اور یہ بھی بتایا کہ پھاتو سیدو بی بی کی رازدار سہیلی بنی ہوئی ہے۔ میں سمجھ نہ سکا کہ کریم بخش نے یہ بھی کہا کہ پھاتو کو بلانے میں ذرا احتیاط کریں۔ میرا خیال ہے یہ لوگ اس عورت سے ڈرتے ہوں گے کہ ناراض ہوکر انہیں نقصان پہنچائے گی۔ اے ایس آئی سید اقبال شاہ میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ پھاتو کے گھر جائے اور وہیں اس کا بیان لے لے، یہاں نہ لائے۔ اس عورت سے بیان لینا اس لیے ضروری تھا کہ یہ سیدو بی بی کی رازدار سہیلی تھی اور اس سے سیدو بی بی کے بارے میں کوئی ضروری بات معلوم ہوسکتی تھی۔

اقبال شاہ اسی وقت چلا گیا اور خاصی دیر بعد واپس آیا۔ اس نے پھاتو کا بیان لے لیا تھا۔ پتہ چلا کہ اس عورت سے بیان ذرا مشکل سے ہی لیا گیا تھا۔ اقبال شاہ نے اس کے خاوند کو جا پکڑا تھا اور اسے کہا تھا کہ یہ ڈاکے اور قتل کی واردات ہے، اگر اس کی بیوی نے کوئی بات چھپانے کی کوشش کی تو گرفتار کرلی جائے گی۔ یہ گاؤں کے کمین اور غریب لوگ تھے، پولیس کو چکر دینے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ پھاتو کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ کسی پر جن آنے لگیں تو وہ جن بھی نکال دیتی ہے۔

پھاتو کے بیان میں کارآمد بات یہ تھی کہ سیدو بی بی نے اسے کہا تھا کہ وہ کوئی ایسا تعویذ یا عمل کرے کہ سیدن شاہ مرجائے۔ پھاتو نے سیدن شاہ کا پتلا بنایا اور اس پر کچھ عمل کرکے اسے جلا دیا تھا اور سیدو بی بی کو یقین دلایا تھا کہ سیدن شاہ زندہ نہیں رہے گا۔

اس بیان سے مجھے یہ بڑا صاف اشارہ ملا کہ سیدو بی بی کے دل میں سیدن شاہ کی عداوت اتنی زیادہ تھی کہ وہ اس کوشش میں تھی کہ سیدن شاہ مرجائے۔

اس موقع پر ایک خیال آیا جس سے مجھے دھچکا سا لگا۔ خیال یہ آیا کہ سیدن شاہ پھاتو کے عمل سے اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہوگا لیکن میں حقیقت پسند آدمی تھا، اس خرافات کو میں نہیں مانتا تھا۔ میں صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کو مانتا تھا جس کے ہاتھ میں ہر بندے میں زندگی اور موت ہے۔ پھر بھی میں نے پھاتو کو ذہن سے اتارا نہیں۔

اس دوران پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی جس میں ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ یہ لکھی تھی کہ سیدن

شاہ کے سر میں بائیں طرف سے گولی لگی اور گولی بہت قریب سے فائر کی گئی تھی۔ رپورٹ میں معدے کی کیفیت یہ لکھی تھی کہ اس میں جو خوراک موجود تھی وہ بالکل تازہ تھی یعنی اس نے مرنے سے کچھ دیر ہی پہلے یہ خوراک کھائی تھی۔ ابھی ہضم ہونے کا نظام چلا ہی نہیں تھا۔ مقتول کے جسم سے کچھ اجزا الگ کر کے ڈاکٹر نے کیمیکل ایگزامینر کو بھجوا دیئے تھے۔

میرے پاس چلم کی ٹوپی میں سے حاصل کیا ہوا تھوڑا سا تمباکو اور اس کی راکھ موجود تھی۔ میں نے ان کا پارسل بنوایا پھر اسے سربمہر کروایا اور کیمیکل ایگزامینر کی طرف یہ پارسل دستی بھجوا دیا تا کہ لے جانے والا رپورٹ دستی لے آئے۔ مجھے شک تھا کہ تمباکو میں کوئی نشہ آور چیز ملائی گئی ہو گی اور اس سے مقتول کو بے ہوش کر کے قتل کیا گیا ہوگا۔

میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ یہ نہ سمجھیں کہ میرے پاس کوئی جادو تھا جس سے میں ڈھکی چھپی باتیں معلوم کر رہا تھا۔ تفتیش عقل اور تجربے کا کھیل ہوتا ہے۔ ذرا ذرا سے شک پر دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے لیکن اس کے لیے فرض شناسی اور دیانتداری لازمی ہوتی ہے۔ اس وقت ''مک مکا'' ٹال مٹول اور پولیس مقابلوں کا رواج نہیں چلا تھا۔ آج کل تو یہ کام بڑا آسان کر لیا گیا ہے۔ کسی ملزم کو کسی واردات میں ملوث کر کے گرفتار کر لیا جاتا ہے اور اگلے روز اسے گولی مار کر اخباروں میں خبر دے دی جاتی ہے کہ یہ ملزم پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ اس طرح تفتیش اور مقدمے کی زحمت سے نجات مل جاتی ہے۔

اسی طرح اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے ایک مخبر سے یہ پتہ چلا کہ سیدو بی بی روزانہ پچھلے پہر گاؤں کی بھٹیارن کی بھٹی پر مکئی کے دانے بھنوانے کے لیے جاتی ہے اور وہاں سے ہٹ کر اس کی ملاقات مقتول سیدن شاہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ سیدو بی بی سیدن شاہ کو بھنے ہوئے دانے پیش کرتی ہے جو سیدن شاہ لے لیتا ہے اور مسکراتا ہوا چلا جاتا ہے۔

اس بیان کی تصدیق کے لیے میں نے بھٹیارن کو بلایا۔ وہ اپنے ایک بیٹے کے ساتھ فوراً آ گئی۔ میں نے اس سے اس بات کی تصدیق چاہی تو اس نے کہا کہ سیدو بی بی اور سیدن شاہ کی ملاقات تو سب لوگ دیکھتے تھے، اس میں راز والی کوئی بات نہیں۔ بہر حال بھٹیارن نے کوئی شک نہ رہنے دیا اور سیدو بی بی اور سیدن شاہ کی ملاقاتوں کی تصدیق کر دی۔

اب ضروری ہو گیا تھا کہ سیدو بی بی کی بہو روشن بی بی کا بیان لیا جائے۔ پولیس کسی کو بھی حکم دے کر اس سے بیان لے سکتی ہے لیکن اچھی قسم کے تھانیدار دیہات کی عورتوں کی عزت و آبرو کا

بہت خیال رکھتے تھے۔ دیہات میں کسی نوجوان لڑکی کا بیان لینا مسئلہ بن جاتا تھا۔ لوگ جوان بیٹیوں کو تھانے چڑھانا بہت سی معیوب سمجھتے تھے خواہ وہ گواہی کے لیے ہی مطلوب ہوتیں۔ میں نے نمبردار ملک یارن خان کو بلا کر کہا کہ وہ وہ سیدو بی بی کو اطلاع دے کہ اس کی بہو بیان کے لیے مطلوب ہے۔ ملک یارن خان اکیلا واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ سیدو بی بی کہتی ہے کہ یہ ڈاکے کی واردات ہے اور اس کی بہو واردات والی رات اس گھر میں تھی ہی نہیں بلکہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی اس لیے وہ بہو کے بیان کی ضروری نہیں سمجھتی اور وہ بہو کو بیان کے لیے پولیس کو پیش نہیں کرے گی۔

میں نے ضابطہ فوجداری کے مطابق یارن خان کے ذریعے سیدو بی بی کو حکم بھیجا کہ وہ اپنی بہو کو خود ساتھ لا کر بیان دلوائے ورنہ اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ ملک یارن خان نے واپس آ کر بتایا کہ اس حکم کے باوجود سیدو بی بی بہو کا بیان دلوانے میں پس و پیش کر رہی تھی۔ ملک یارن خان نے اس کو تیار کر لیا۔ میں نے مناسب یہ سمجھا کہ سیدو بی بی کے گھر ہی جا کر اس کی بہو کا بیان لے لوں۔ میں چلا گیا اور اپنے کانسٹیبلوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ انہیں باہر کھڑا کر کے میں خود اندر چلا گیا۔

سیدو بی بی کی بہو روشن بی بی وہاں موجود تھی۔ ایک تو وہ دیہاتن تھی اور دوسرے وہ نوجوانی کی عمر میں تھی اس لیے وہ بہت ہی شرماتی تھی۔ میں جو بھی سوال کرتا وہ اس کا جواب ہوں یا ہاں میں دے کر سر جھکا لیتی تھی۔ میں آخر ذرا دبدبے سے بولا کہ مجھے تمام حالات اور واقعات کا دوسرے لوگوں سے علم ہو چکا ہے اس لیے وہ میرا وقت ضائع نہ کرے اور مجھے بتائے کہ جو باتیں مجھے معلوم ہوئی ہیں ان میں کون سی سچی اور کون سی جھوٹی ہیں۔ میں نے سیدو بی بی کو بھی تھوڑا سا ڈانٹ دیا کہ میں تھانیدار ہوں، یہ نہ سمجھیں کہ کسی گاؤں سے آ کر یہاں بیٹھ گیا ہوں۔ اس طرح اس لڑکی کو کھل کر بیان دینے پر تیار کیا۔

آخر اس نوجوان عورت روشن بی بی نے وہ واقعہ سنا دیا۔ جو میں نے پہلے سنایا ہے کہ کس طرح سیدن شاہ نے اس لڑکی کو چھیڑا تھا۔ روشن بی بی نے بتایا کہ سیدن شاہ اس کی آبروریزی کرنا چاہتا تھا جس سے وہ بچ گئی۔ روشن بی بی نے اپنی ساس سیدو بی بی کو بتایا۔ سیدو بی بی غصے میں آ گئی لیکن کچھ سوچنے کے بعد اس نے کہا کہ اس واقعہ کا کسی اور کے ساتھ ذکر نہ کرنا۔

اس نے بتایا کہ یہ بات سارے گاؤں میں اس طرح پھیل گئی کہ دور سے دو تین آدمی دیکھ

رہے تھے...... میں نے یہ تسلیم نہ کیا کہ سیدن شاہ روشن بی بی کی آبروریزی کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس لیے کہ دیہاتی علاقے میں دن دیہاڑے ایسے جرم کا ارتکاب ناممکن تھا اور گاؤں کا کوئی بھی شخص سیدن شاہ کو پکڑوا بھی سکتا تھا یا اسے قتل کروا دیتا۔ ماننے والی بات صرف یہ تھی کہ سیدن شاہ نے روشن بی بی پر دست درازی کی تھی اور اس لڑکی کا دوپٹہ سیدن شاہ نے اتار لیا یا ہاتھ پائی میں اترا اور وہیں گر پڑا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ دو تین دنوں بعد اس کا خاوند رحمداد آیا۔ اسے یہ واقعہ سنایا تو وہ اسی وقت سیدن شاہ سے انتقام لینے کے لیے تیار ہو گیا لیکن ماں نے اسے سمجھا بجھا کر روک لیا۔

روشن بی بی کی زبان رواں رواں ہو گئی تھی اور میرے اچھے رویے سے بھی وہ متاثر ہوئی اور بے تکلفی سے بولنے لگی تھی۔ اس نے بڑی کارآمد بات سنائی۔ کہنے لگی کہ ایک تو اس کی ساس کو اتنا غصہ چڑھا کہ وہ پاگل ہونے لگی اور دوسری طرف یہ حال کہ تین چار دن ہی گزرے تھے کہ روشن بی بی کو پتہ چلا کہ اس کی ساس کی سیدن شاہ کے ساتھ بے تکلفی پیدا ہو گئی ہے اور وہ بھٹیارن کی بھٹی کے قریب روزانہ ملتے ہیں۔ روشن بی بی نے کہا کہ اسے ساس پر غصہ آنے لگا لیکن اس نے اس سے کچھ بھی نہ کہا اور اس سے کھچی کھچی رہنے لگی اور اپنے میکے گھر زیادہ جانے لگی۔

روشن بی بی نے بتایا کہ ڈکیتی والی رات شب برأت تھی۔ اس دن روشن بی بی اپنی ساس کے پاس آئی۔ ساس نے مرغ پکایا تھا اور حلوہ بھی پکایا تھا۔ ساس نے ایک ڈونگے میں مرغ کا سالن اور دوسرے میں حلوہ ڈالا پھر تنور سے روٹیاں منگوائیں اور یہ کھانا روشن بی بی کو دے کر کہا کہ آج شب برأت ہے وہ یہ کھانا اپنے میکے لے جائے۔

''تم آج رات اپنے ماں باپ کے گھر ہی رہنا'' ____ سیدو بی بی نے اپنی بہو سے کہا ____ ''میں آج رات عبادت کروں گی اس لیے اکیلی رہنا چاہتی ہوں''۔

روشن بی بی اس رات اپنے ماں باپ کے گھر رہی۔ اگلے روز اسے اطلاع ملی کہ اس کے سسرال گھر ڈاکہ پڑا ہے اور ڈاکوؤں کا ایک ساتھی اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے اور مارا جانے والا سیدن شاہ ہے۔

روشن بی بی سے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ کر کے اسے رخصت کر دیا پھر میں نے اے ایس آئی اقبال شاہ کو پاس بٹھایا اور ہم اس وقت تک کی تفتیش پر تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ اب کچھ صاف ہی نظر آنے لگا تھا کہ ڈکیتی کی یہ واردات مشکوک ہے۔ یہ واضح ہو گیا تھا کہ سیدو بی بی نے سیدن شاہ کی دشمنی پر پردہ ڈالے رکھا پھر کسی طرح اسے جھانسے میں لا کر اپنے گھر بلوا کر اسے قتل کروا دیا

لیکن یہ ہمارا خیال تھا۔ اس جرم کا عملی ارتکاب ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ بہرحال واردات مشکوک تھی اور اس کے پیچھے کوئی ڈرامہ ہوا تھا۔

اس وقت تک ہمارے سامنے جو واقعات اور بیانات آئے ان سے مندرجہ ذیل صورت واضح ہوئی تھی:

1- سیدو بی بی کے دل میں سیدن شاہ کی عداوت موجود تھی جس کی وجہ بیان ہو چکی ہے۔

2- سیدو بی بی نے تھانے میں پہلے روز پرچہ کروانے کے لیے جو بیان دیا اس میں یہ نہ بتایا کہ جو آدمی اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے وہ سیدن شاہ ہے اور وہ اسی گاؤں کا آدمی ہے جسے وہ اچھی طرح پہچانتی ہے۔

3- کمرے میں چلم پی گئی اور جلے ہوئے تمباکو کی راکھ برآمد ہوئی۔

4- ایک پلیٹ میں حلوہ اور دوسرے میں سالن کھایا گیا۔ سیدو بی بی نے بیان میں کہا کہ ڈاکہ آدھی رات کے ذرا بعد میں پڑا ہے لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا گیا کہ مقتول نے تازہ تازہ کھانا کھایا تھا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوا، کیا مقتول آدھی رات کے وقت کھانا کھا کر آیا تھا؟

5- چھاتو مراثن کے بیان سے ظاہر ہوا کہ سیدو بی بی اس قدر غصے میں تھی کہ وہ سیدن شاہ کو مروانا چاہتی تھی۔

6- کواڑ کو اکھاڑنا اور اس طریقے سے اکھاڑنا کہ پھر دروازے میں فٹ آجائے۔ ڈاکو دروازے نہیں اکھاڑا کرتے۔

7- عقل تسلیم نہیں کرتی تھی کہ سیدن شاہ کو اپنے ساتھیوں سے سر میں گولی لگی۔ گولی اتفاقیہ چل جائے تو اس کا سر پر لگنا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا۔

8- بھٹیارن کا بیان صاف بتاتا تھا کہ سیدو بی بی دانے بھنوا کر سیدن شاہ کے انتظار میں رہتی یا سیدن شاہ پہلے ہی وہاں آجاتا پھر سیدو بی بی اسے ہنستے مسکراتے ہوئے دانے پیش کرتی اور سیدن شاہ بڑی خوشی سے دانے لیتا اور دونوں اِدھر اُدھر ہو جاتے۔

9- صندوق کے کنڈے اکھاڑے گئے لیکن کوئی اوزار موقعہ پر موجود نہیں تھا۔

یہ تو مختصری باتیں ہیں جو میں نے تحریر کی ہیں۔ متعدد اشخاص سے ہم نے جو بیانات لئے تھے وہ ایک واضح تصویر پیش کرتے تھے۔ اے ایس آئی اقبال شاہ میری تائید کر رہا تھا۔ میں اس کے تجربے کا قائل تھا۔ آخر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ سیدو بی بی کو زیر دفعہ 54 ضابطہ فوجداری گرفتار کر لیا

جائے۔ چنانچہ ہم نے سیدو بی بی کو باقاعدہ بلا کر اطلاع دے دی کہ اب وہ ہماری حراست میں ہے۔ اسے حوالات میں بند کرنے کی بجائے گاؤں میں ہی اپنی حراست میں رکھ لیا۔

اس طرح کی ہوئی گرفتاری کی اطلاع فوری طور پر علاقہ مجسٹریٹ کو دینی پڑتی ہے اور ریمانڈ لینا ہوتا ہے۔ میں نے اقبال شاہ کو دوڑایا کہ وہ علاقہ مجسٹریٹ کو تحریری اطلاع بھی دے دے اور 14 دنوں کا ریمانڈ بھی لے لے۔ مجسٹریٹ نے 14 کی بجائے سات دنوں کا ریمانڈ دیا۔ میں نے جو تمباکو کی راکھ اور ذرا سا صحیح تمباکو کیمیکل ایگزامینر کے پاس بھیجا تھا اس کی رپورٹ کا بھی انتظار تھا۔

سیدو بی بی نے اپنی گرفتاری کی اطلاع کراچی اپنے بیٹے کو بھجوا دی اور وہ بھی آ گیا۔ میں نے اسے اجازت دے دی کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ میں نے ماں بیٹے کو اکٹھے بٹھا کر صاف صاف بتایا کہ اب تک ہمارے سامنے بے شمار لوگوں نے مل کر کیا تصویر پیش کی ہے۔

"تم دونوں ایک بات سوچو"___ میں نے انہیں کہا___ "میں نے اب تک تفتیش بڑی شرافت سے کی ہے۔ کوئی تھانیدار اتنی شرافت سے کام نہیں لیا کرتا۔ کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ اگر تم لوگوں نے ابھی بھی سچی بات چھپانے کی کوشش کی تو میں پولیس والا دوسرا طریقہ استعمال کروں گا۔ سیدو بی بی کو یہاں رکھنے کی بجائے حوالات میں بند کر دوں گا"۔

میں دیکھ رہا تھا کہ سیدو بی بی بہت ہی پریشان اور بے چین تھی۔ میرا اور اے ایس آئی اقبال شاہ کا تجربہ بتاتا تھا کہ اس عورت کی پریشانی کا ڈاکہ زنی ساتھ کوئی تعلق نہیں کہ وہ لٹ گئی ہے بلکہ یہ کوئی اور ہی پریشانی ہے۔ اب سیدو بی بی کی نفسیات اور اس کا ضمیر اسے پریشان اور بے چین کر رہا تھا۔ کسی قتل کو دینا تو آسان ہوتا ہے لیکن انسان کے لیے انسان کا خون ہضم کر لینا ممکن نہیں ہوتا۔ سیدو بی بی کا ضمیر اسے بچھو کی طرح ڈنک مار رہا تھا۔

مجھے تجربہ حاصل تھا کہ کسی مشتبہ کو بیان دینے پر کس طرح آمادہ کیا جاتا ہے۔ میں نے کچھ باتیں کیں تو سیدو بی بی بول پڑی۔ اس نے کہا کہ اس کے ہوش و حواس قائم نہیں اور قتل کے بعد کئی راتوں سے وہ سو نہیں سکی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی ایسا کیوں ہوا"___ سیدو بی بی نے کہا___ "جب سے آپ نے مجھے حراست میں لیا ہے میرے دل اور دماغ سے بوجھ اتر گیا ہے۔ میں صرف یہ اجازت چاہتی ہوں کہ آج مجھے آرام کرنے دیا جائے اور میں کل اپنا بیان دوں گی"۔

میں نے اسے اس کی درخواست کے مطابق آرام کرنے کی اجازت دے دی اور اس کے گھر پر مسلح پہرہ کھڑا کر دیا۔

اگلے روز میں نے سیدو بی بی کا بیان اے ایس آئی اقبال شاہ اور نمبردار ملک یارن خان کی موجودگی میں لیا۔

"میں صرف ایک عرض کروں گی"___ سیدو بی بی نے کہا___ "میرے بیان کو غلط رنگ نہ دیا جائے نہ غلط کارروائی کی جائے۔ میں غیرت مند عورت ہوں اور جو کچھ کیا ہے وہ غیرت مندی میں کیا ہے۔ میں نے بڑے ڈھنگ کھیل کر سیدن شاہ سے اپنی بہو کی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے"۔

ملک یارن خان نے اسے کہا کہ سب اس کی غیرت مندی کو سمجھتے ہیں پھر میرے بارے میں کہا کہ یہ خان صاحب خاندانی آدمی ہیں اور بڑی غیرت والے ہیں اس لیے وہ بے خوف ہو کر بیان دے۔

میں نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ میں اس کی غیرت کا احترام کروں گا اور یہ لکھوں گا کہ سیدو بی بی کی سیدن شاہ کے ساتھ کوئی خاندان دشمنی نہیں تھی۔ سیدو بی بی نے سیدن شاہ کو غیرت میں آ کر قتل کیا ہے۔

سیدو بی بی نے اپنا بیان شروع کیا۔ اس نے وہی واقعہ سنایا کہ اس کی بہو نے کھیتوں سے آ کر اسے بتایا کہ سیدن شاہ نے اس کی بے حرمتی کی ہے اور پھر یہ سینہ زوری دکھائی ہے کہ اس کے سر سے دوپٹہ اتار لیا ہے۔ سیدو بی بی نے کہا کہ غصے نے اسے پاگل کر دیا لیکن اس نے بہو سے کہا کہ وہ کسی کو یہ بات نہ بتائے کیونکہ اپنے رشتہ داروں کو پتہ چل گیا تو گاؤں میں زبردست خون خرابہ ہو گا اور ایک دو آدمی مارے بھی جائیں گے۔

اتنے میں اس کا بیٹا رحمداد کراچی سے آ گیا۔ سیدو بی بی نے اسے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کر کے کراچی بھیج دیا اور خود دن رات اس سوچ میں کھو گئی کہ سیدن شاہ سے کس طرح انتقام لے۔ میں نے بہو سے کہہ دیا تھا کہ وہ اب زیادہ باہر نہ نکلا کرے اور گھر سے زیادہ دور نہ جایا کرے۔

سیدو بی بی نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے سیدن شاہ سے انتقام کا ارادہ اتنا پختہ کر لیا تھا کہ اب وہ اس سے ٹل نہیں سکتی تھی۔ اس کی خالی زمینوں میں سردیوں میں کابلی پٹھان آ کر خیمے لگا لیتے تھے اور سردیاں یہیں گزار کر واپس چلے جاتے تھے۔ اب سردیوں کا موسم تھا اور کابلی پٹھان آئے ہوئے تھے۔ ایک روز سیدو بی بی ان میں سے ایک پٹھان سے ملی جس کا نام شلولی خان تھا۔

سیدو بی بی کو غالباً معلوم تھا کہ ان لوگوں کے پاس درے کا بنا ہوا اسلحہ ہوتا ہے۔ سیدو بی بی نے شلولی خان سے کہا کہ وہ گھر میں اکیلی ہوتی ہے، چوروں ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا ہے اس لیے وہ اپنے گھر میں پستول اور گولیاں رکھنا چاہتی ہے۔

شلولی خان نے اسے بتایا کہ اس کے پاس پستول بھی ہے اور گولیاں بھی ہیں جو وہ اسے پچاس روپے پر دے دے گا۔ یہ کوئی غلط بات نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت درے کا بنا ہوا پستول آسانی سے پچاس روپے پر مل جاتا تھا۔ سیدو بی بی نے یہ سودا قبول کر لیا لیکن شلولی خان سے یہ کہا کہ وہ پستول چلانا نہیں جانتی اور وہ اسے سکھا دے۔

شلولی خان نے اسے کہا کہ جب لوگ شام کو اپنے مویشی وغیرہ لے کر گھروں میں چلے جاتے ہیں اس وقت وہ اس کے پاس آ جایا کرے اور وہ ساتھ والی پہاڑوں کے اندر لے جا کر اسے پستول چلانا سکھا دے گا...... سیدو بی بی نے پستول بمعہ گولیاں لے لیا پھر چند دن شلولی خان کے ساتھ پہاڑیوں میں جا کر پستول چلانا سیکھ لیا۔

اب سیدو بی بی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ سیدن شاہ کو اپنے جال میں کس طرح لائے۔ سیدن شاہ سیدو بی بی کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا کہ اس کی بیہودہ حرکت کے اتنے دنوں بعد تک سیدو بی بی نے نہ کوئی ردِعمل ظاہر کیا تھا نہ اس نے کوئی اور احتجاجی کارروائی کی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ بات آئی گئی ہو گئی ہے۔ ایک روز سیدو بی بی معمول کے مطابق بھٹیارن سے مکئی کے دانے بھنوانے گئی تو سیدن شاہ اُدھر سے گزرا۔ سیدو بی بی نے یہ جرأت کی کہ آگے ہو کر سیدن شاہ کے ساتھ سلام دعا کی۔ سیدن شاہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ وہ بڑا بدمعاش اور چالاک آدمی بنا ہوا تھا، وہ سیدو بی بی کے جھانسے میں آ گیا۔

ایک روز اسی بھٹی پر سیدو بی بی نے سیدن شاہ کو بھنے ہوئے دانے پیش کئے جو اس نے ہنس کر لے لئے۔ سیدو بی بی نے اسے کہا کہ وہ اس وقت روزانہ بھٹی پر آتی ہے۔ چنانچہ سیدن شاہ نے بھی روزانہ ادھر سے گزرنا شروع کر دیا۔ یہ بھٹی بھٹیارن کے گھر کے اندر نہیں تھی بلکہ باہر تھی۔ سیدو بی بی سے ہر روز سیدن شاہ بڑی بے تکلفی سے دانے لیتا رہا۔ سیدو بی بی کے بیان کے مطابق ان دونوں میں کچھ خوشگوار سی بات بھی ہو جاتی تھی۔ اس طرح سیدن شاہ سیدو بی بی کے پھندے میں آ گیا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ اپنے دماغ پر عورت کو سوار کر لیتے ہیں وہ اسی طرح بڑی آسانی سے دھوکے میں آتے ہیں۔

سیدو بی بی نے یہ بھی بتایا کہ اس نے پہا تو مراثن سے تعویذ کروائے تھے کہ سیدن شاہ مر جائے۔ یہ اس نے اس لیے کروائے تھے کہ قتل کے جرم سے بچ جائے اور سیدن شاہ تعویذ سے ہی مر جائے لیکن اس کے اندر انتقام کی آگ اتنی زیادہ بھڑک رہی تھی کہ وہ سیدن شاہ کو بہت جلدی اور اپنے ہاتھوں قتل کرنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

آگے چل کے سیدو بی بی نے اپنے بیان میں کہا کہ بہت دنوں سے وہ سیدن شاہ سے تقریباً روزانہ مل رہی تھی اس لیے گاؤں میں لوگ اس کے بارے میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ زیادہ باتیں اس وجہ سے بنتی تھیں کہ ایک طرف سیدن شاہ نے سیدو بی بی کی بہو پر دست درازی کی تھی اور دوسری طرف سیدو بی بی سیدن شاہ کے ساتھ دوستی لگائے ہوئے تھی۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ سیدو بی بی بوڑھی لگتی ہی نہیں تھی۔ کھاتے پیتے گھرانے کی عورت تھی جس وجہ سے اس کی صحت جوانوں جیسی اور شکل صورت بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ یہ بات کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ سیدو بی بی اور سیدن شاہ کے تعلقات جائز اور شریفانہ نہیں ہو سکتے۔

سیدو بی بی عقل مند عورت تھی۔ وہ سمجھتی تھی اور اسے احساس تھا کہ گاؤں میں اس بدنامی ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس نے سیدن شاہ کو جلدی سے جلدی دنیا کے تختے سے اٹھا دینے کی سکیم تیار کرنی شروع کر دی۔

میں نے نفسیاتی نقطہ نگاہ سے جو سوچا وہ یہ تھا کہ یہ عورت عقل مند اور بیدار مغز تو ضرور تھی لیکن اس میں غیرت مندی اور انتقام کا جذبہ اس قدر زیادہ تھا کہ یہ جذبہ اس کی عقل اور ہوشمندی پر غالب آ گیا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ اسے یہ سکیم بناتے خیال آیا کہ سیدن شاہ آخر مرد ہے۔ اسے سیدو بی بی نے اپنے گھر بلانا تھا لیکن اسے یہ خدشہ نظر آیا کہ پستول نکالتے نکالتے سیدن شاہ اس پر جھپٹ کر پستول چھین سکتا ہے۔ اس صورت میں اس کی ساری سکیم دھری رہ جاتی۔

اس کا سیدو بی بی نے یہ علاج سوچا کہ ایک سنیاسی سے مشورہ کیا۔ یہ سنیاسی کبھی کبھی اس کے گھر آیا کرتا تھا۔ یہاں میں آپ کو سنیاسیوں کے بارے میں کچھ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ انگریزوں کے وقتوں میں سنیاسیوں کا پورا گروہ کسی آبادی کے قریب خیمے لگا لیتا اور کچھ دن یہ لوگ وہاں قیام کرتے تھے۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا تھا کہ ان کے پاس ہر مرض کی دوا ہے اور ان کے پاس ایسی دوائی بھی ہے جو آبِ حیات کا اثر رکھتی ہے۔ بے اولاد عورتوں کا بھی علاج کرتے تھے۔ ان کے زیادہ تر مریض ہندو ہوا کرتے تھے۔ ہندو عورتیں خصوصاً بے اولاد عورتیں ان کی زیادہ مرید

ہوتی تھیں۔

ان کا حلیہ اور لباس سادھوؤں اور فقیروں جیسا ہوتا تھا۔ پاکستان وجود میں آ گیا، ہندو سکھ چلے گئے تو سنیاسی بھی بہت ہی تھوڑے رہ گئے۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ کچھ مسلمانوں نے سنیاسی بن کر نوسر بازی شروع کر دی اور دیہات میں گھومنے پھرنے لگے۔ یہ لوگ خانہ بدوشوں جیسی زندگی گزارتے تھے۔ آج یہاں کل وہاں۔ دیہاتیوں پر اپنی نوسر بازی چلا کر خاصے پیسے بٹور لیتے تھے۔

ایسا ہی کوئی سنیاسی کبھی کبھار سیدو بی بی کے گھر آتا تھا۔ ایک روز اس نے باتوں باتوں میں سنیاسی سے مذاق کے رنگ میں پوچھا کہ کسی کو کچھ دیر کے لیے بے ہوش کرنا ہو تو اس کے لیے کیا کرنا چاہئے۔ سنیاسی نے اسے بتایا کہ اگر دھتورے کی بیج کسی کو پلا دیئے جائیں تو وہ خاص دیر کے لیے بے ہوش رہے گا۔

سیدو بی بی کو یاد آیا کہ دھتورے کے بارے میں اس نے پہلے بھی ایسی باتیں سنی ہیں لیکن اس نے کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ اس سنیاسی سے دھتورے کا یہ اثر سنا تو اسے خیال آیا کہ اس علاقے میں دھتورا جگہ جگہ اکا ہوا مل جاتا ہے۔ اسی روز وہ باہر نکل گئی اور ایک پودے سے دھتورے کے بیج لے آئی۔ یہ بیج گھر لا کر اس نے لکڑی کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں رکھ دیئے اور پھر ڈبے میں تمباکو ڈالا اور تمباکو اور بیجوں کو ہاتھوں سے مل مل کر ملا دیا۔

ایک روز سیدو بی بی نے سیدن شاہ کو کہا کہ شب برأت کی رات وہ گھر میں بالکل اکیلی ہو گی، اس کی بہو میکے چلی جائے گی اور وہ یعنی سیدن شاہ عشاء کے بعد بچ بچا کر اس کے گھر آئے اور وہ اسے مرغ اور حلوہ کھلائے گی۔

یہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اپنی بہو کو سیدو بی بی نے کس طرح اس کے میکے بھیجا تھا۔ اس نے بہو کو کہا تھا کہ وہ رات کو عبادت کرے گی اس لیے اکیلی رہنا چاہتی ہے۔ عشاء کے بعد سیدہ بی بی سیدن شاہ کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے مرغ اور حلوہ پکا کر رکھ لیا تھا اور پستول لوڈ کر لیا تھا اور اسے کرسی کی گدی کے نیچے رکھ دیا۔ ساتھ نواری پیڑھی رکھی اور چلم میں دھتورا ملا تمباکو ڈال کر چلم قریب ہی رکھ لی۔ دیہات میں تقریباً ہر مرد چلم پیتا تھا اور سیدن شاہ جیسے آدمی تو حقہ نوشی کے نشئی ہوتے تھے۔

میں اس عورت کی عقل پر کچھ حیران بھی ہوا۔ اس نے جو سکیم بنائی تھی اس میں چھوٹی چھوٹی

باتوں کا خیال رکھا تھا لیکن اس کی بدقسمتی یہ کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی عقل پولیس والوں کی عقل کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ حیران میں اس بات پر ہوا کہ سیدو بی بی نے بیان میں کہا کہ اس نے دروازے کا ایک کواڑ پہلے ہی اکھاڑ لیا تھا اور اس کی جگہ پر رکھ دیا تھا۔ اس نے یہ اہتمام یہ سوچ کر کیا تھا کہ اپنی اس واردات کو ڈاکہ زنی کا رنگ دینا تھا۔

سیدن شاہ آ گیا۔ سیدو بی بی نے اس کا والہانہ استقبال کیا اور کمرے میں لا کر دروازہ بند کیا اور سیدن شاہ کو نواری پیڑھی پر بٹھایا۔ پھر اس نے اس کے آگے کھانا رکھا۔ کھانے کے بعد اسے چلم پیش کی۔ سیدن شاہ نے ماچس کی تیلی جلا کر تمباکو پر رکھی اور کش لگایا۔ دوسرا کش لگایا تو اس کا سر ڈولنے لگا۔ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

سیدو بی بی نے گدی کے نیچے سے بڑی تیزی سے پستول نکالا اور نالی سیدن شاہ کے سر کی طرف کر کے گولی چلا دی۔ سیدو بی بی نے بتایا کہ اس نے اسی وقت دیکھ لیا تھا کہ گولی سیدن شاہ کے سر میں لگی ہے اور اس کے مغز کا تھوڑا سا حصہ دوسری طرف سے باہر آ گیا۔ ایک ہی گولی کام کر گئی۔ سیدن شاہ کی لاش ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ سیدو بی بی نے اسے ٹھوکر مار کر پیڑھی سے نیچے گرا دیا پھر چلم کی ٹوپی سے جلا ہوا تمباکو وہیں فرش پر انڈیل دیا جیسا کہ دیہاتی عام طور پر کیا کرتے ہیں۔ چلم دیوار کے ساتھ رکھ دی۔

اس کے بعد سیدو بی بی نے اپنی سکیم کے دوسرے حصوں پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ پہلے یہ کام کیا کہ جو کواڑ اس نے اکھاڑ کر ویسے ہی دروازے کی چوکھٹ میں رکھ دیا تھا۔ وہ گرا دیا۔ پھر ہتھوڑی لی اور ٹرنکوں کے تالے اور کنڈے توڑے اور زیورات اور رقم نکال کر ایسی جگہ چھپا دی جہاں یہ مال کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا اور پھر بڑے آرام سے لیٹ گئی۔ وہ مطمئن تھی۔ اب وہ نصف شب گزرنے کے انتظار میں تھی۔ غور فرمائیں کہ یہ عورت کس قدر دلیر اور غیرت مند تھی کہ ذرا سا بھی نہ ڈری کہ رات کا وقت اور یہ تنہا اور گھر میں ایک غیر مرد کی خون میں ڈوبی لاش پڑی ہے۔ وہ ڈرنے کی بجائے خوش تھی کہ اس نے بے عزتی کا انتقام لے لیا ہے۔ یقین جانیں کہ ایسی غیرت مندی ہر دیہاتی مرد اور عورت میں ہوتی تھی مگر شہروں سے تو یہ غائب ہو گئی ہے البتہ دیہات میں ابھی پائی تو جاتی ہے لیکن وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلمی گانے اور ٹی وی دیہاتی علاقوں میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ یہی غیرت تو مسلمانوں کی پہچان ہوتی تھی۔

کہانی پڑھنے والے شاید یہ سوچیں کہ ایک گاؤں میں رات کے وقت پستول فائر ہوا اور یہ

دھماکہ کسی نے نہ سنا۔ پھر سیدو بی بی ہتھوڑی سے صندوقوں کے تالے توڑتی رہی اور اس کی آواز بھی پڑوسیوں کو سنائی نہ دی۔ اس وجہ یہ تھی کہ سردیوں کا موسم تھا۔ لوگ کمروں میں دروازے بند کر کے اور لحاف اوڑھ کر سوتے تھے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ دیہات کے لوگ دن بھر محنت مشقت کر کے اتنے تھکے ہوتے تھے کہ عشاء سے بہت پہلے بے ہوشی کی نیند سو جاتے تھے۔ سیدو بی بی نے بند کمرے میں گولی چلائی تھی۔ ان وجوہات کی بنا پر گولی چلنے کا دھماکہ کوئی نہ سن سکا۔ اگر لوگ سن لیتے تو کوئی نہ کوئی مجھے بتا دیتا کہ گولی کا دھماکہ عشاء کے کچھ بعد سنا گیا تھا مگر سیدو بی بی کہتی تھی کہ ڈاکہ آدھی رات کے وقت پڑا تھا۔

سیدو بی بی جاگتی رہی اور جب اس کے اندازے کے مطابق رات آدھی گزر گئی تو اس نے صحن میں نکل کو شور مچا دیا کہ اس کے گھر ڈاکہ پڑا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس واویلے پر جاگ اٹھے اور سیدو بی بی کے گھر پہنچنے لگے۔ نمبردار ملک یارن خان بھی آ گیا۔ سیدو بی بی نے سب کو بتایا کہ ڈاکو اس کا صندوق توڑ کر سب کچھ لوٹ لے گئے ہیں اور ان کا ایک ساتھی اندر مرا پڑا ہے۔ معلوم نہیں اس کے ساتھی اسے دانستہ قتل کر گئے ہیں یا وہ اتفاقیہ چلنے والی گولی سے مرا ہے۔

کسی نے بھی واردات والے کمرے کے اندر جا کر نہ دیکھا کہ لاش کس کی ہے اور کون سے صندوق ٹوٹے ہیں۔ اگر نمبردار نہ آ جاتا تو کئی لوگ اندر چلے جاتے اور رات کو ہی انہیں پتہ چل جاتا کہ مرنے والا ان کے اپنے ہی گاؤں کا آدمی سیدن شاہ ہے۔ نمبردار نے سب کو اندر جانے سے روک دیا تھا۔ یہ اس لیے کہ وہ جانتا کہ موقعۂ واردات پر پولیس کو کوئی نہ کوئی سراغ مل جاتا ہے اور اگر دوسرے لوگ پہلے ہی وہاں پہنچ جائیں تو کھرا کھوج مٹ جاتا ہے پھر پولیس کو اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں۔ یہی سوچ کر نمبردار ملک یارن خان خود بھی اندر نہ گیا بلکہ دروازہ اس طرح بند کر دیا کہ اکھڑا ہوا کواڑ بھی اپنی جگہ رکھ دیا۔ اس نے تمام لوگوں کو گھر سے نکال دیا۔

سیدو بی بی نے اقبالی بیان تو دے دیا اور ظاہری طور پر میری تفتیش کامیابی سے ختم ہو گئی لیکن اصل مشکل کام اب شروع ہوا جو یہ تھا کہ ملزمہ کو سزا دلانے کے لیے ٹھوس شہادت اور عینی شہادت کوئی نہیں تھی۔ شہادت جو میرے سامنے آئی تھی وہ واقعاتی شہادت Circumstanial Evidence تھی۔ میرا مشکل ترین کام یہ تھا کہ اس شہادت کو ٹھوس اور قابلِ اعتماد بنانا تھا۔ مجھے ایک انگریزی کا مقولہ یاد آیا جس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ انسان جھوٹ بول سکتا ہے، واقعات جھوٹ نہیں بولا کرتے۔

اس موقعہ پر میرا وہ کانسٹیبل واپس آ گیا جسے تمباکو کی راکھ دے کر کیمیکل ایگزامینر کی رپورٹ حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ تمباکو کی رپورٹ یہ تھی کہ اس میں دھتورا یا کوئی نشہ آور چیز شامل ہے جو فوری طور پر اثر کرتی ہے...... اس رپورٹ نے میری تفتیش کو خاصی تقویت دے دی۔

میں نے نمبردار ملک یارن خان کو اور ایک اور معزز آدمی کو ساتھ لیا اور شلولی خان کابلی پٹھان کے خیمے پر چھاپہ مارا۔ وہاں سے درے کی بنی ہوئی ایک رائفل برآمد ہوئی جو بابلا لائسنس تھی۔ میں نے یہ رائفل دونوں گواہوں کی موجودگی میں برآمد کر کے قبضے میں لی اور مطلوبہ تحریر لکھ کر شلوخان۔ ملک یارن خان اور معزز آدمی کے دستخط اور انگوٹھے لگوا لئے۔ شلولی خان کو باقاعدہ اسلحہ ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا۔

شلولی خان نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ طورخم کا رہنے والا ہے اور سردیوں کے موسم میں ہر سال اپنے بال بچوں اور دو چار ساتھیوں کے ساتھ اس علاقے میں آ جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس کے علاقے میں سردی اتنی زیادہ ہو جاتی تھی جوان لوگوں کے لیے نا قابل برداشت ہوتی تھی۔ یہ لوگ اپنے ساتھ کپڑا، کشمش، بادام وغیرہ اور گرم شالیں لے آتے اور بیچتے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ ہر سال سیدو بی بی کے کسی خالی کھیت میں خیمے لگا کر رہتے ہیں اس لیے سیدو بی بی کے ساتھ اس کے اچھے مراسم تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سیدو بی بی نے بڑی بے تکلفی سے اس سے پستول خریدا اور اسی سے چلانا بھی سیکھا تھا۔

شلولی خان نے سیدو بی بی کے اقبالی بیان کی تصدیق کر دی۔ اس نے بتایا کہ سیدو بی بی نے اس سے پچاس روپے میں پستول اور گولیاں لی تھیں اور پھر اس نے سیدو بی بی کو پہاڑیوں کے اندر لے جا کر پستول چلانا سکھایا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے بالکل ہی معلوم نہیں تھا کہ سیدو بی بی اس پستول سے کسی کو قتل کرے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ گاؤں میں ایک آدمی قتل ہو گیا ہے پھر یہ پتہ چلا کہ اس آدمی کو سیدو بی بی نے پستول سے قتل کیا ہے۔ اس اطلاع پر شلولی خان بہت گھبرایا کہ وہ پکڑا جائے گا۔ وہ اب وہاں سے بھاگ جانے کی سوچ رہا تھا لیکن میں جا پہنچا۔

شلولی خان نے بیان دے دیا جو سیدو بی بی کے خلاف کامیابی سے استعمال ہو سکتا تھا۔

شلولی خان نے منت سماجت شروع کر دی کہ اسے معافی دے دی جائے۔ وہ پردیسی ہے اور یہ رائفل وہ اپنی حفاظت کے لیے ساتھ رکھتا ہے اور اگر اسے معافی دے دی جائے تو وہ پھر کبھی پاکستان میں قدم نہیں رکھے گا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ قتل کا کیس ہے اور جس پستول سے قتل ہوا

ہے وہ اس نے بیچا ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ اسے معافی گواہ بنا لیا جائے۔ میں نے اس سے بھی انکار کر دیا کیونکہ پوری واردات میں وہ شامل نہیں تھا اور پھر مجھے وعدہ معاف گواہ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے اس کے خلاف اسلحہ ایکٹ کے تحت الگ مقدمہ درج کر لیا۔

سیدو بی بی کا اقبالی بیان زیر دفعہ 164 ایک مجسٹریٹ سے قلمبند کروانا تھا لیکن سیدو بی بی اس کے لیے آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مقدمہ اتنی تیزی سے چلے کہ بہت جلدی فیصلہ ہو جائے ورنہ وہ سال دو سال کورٹوں میں خوار ہوتی پھرے گی۔ ایسے موقع پر ملزم کو ڈرایا بھی جاتا ہے اور لالچ بھی دیے جاتے ہیں۔ میں نے اور نمبردار ملک یارن خان نے اسے سمجھایا کہ اس کے خلاف شہادت مل چکی ہے اور اس نے اگر مجسٹریٹ کو اقبالی بیان نہ دیا تو پھر میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا اور اسے زیادہ سے زیادہ سزا ملے گی اور اگر وہ مجسٹریٹ سے بیان قلمبند کروا دے تو میں اسے کم سے کم سزا دلواؤں گا۔

ملک یارن خان نے اسے کہا کہ وہ معزز خاندان کی عورت ہے اور سب جانتے ہیں کہ اس نے غیرت پر سیدن شاہ جیسے آدمی کو قتل کیا ہے، اس لیے وہ گھبرائے نہیں، اس کی کوئی بے عزتی نہیں ہو گی بلکہ لوگ اسے خراجِ تحسین پیش کریں گے، بہتر یہ ہے کہ وہ پستول اور مال برآمد کرا دے۔

وہ رضامند ہو گئی اور ہمیں مویشیوں والے کمرے میں لے جا کر سیمنٹ کی بوریوں کے نیچے سے پستول نکال دیا۔ اس کے ساتھ نو گولیاں بھی تھیں۔ ملک یارن خان اور ایک معزز آدمی میرے ساتھ بطور گواہ برآمدگی تھے۔ میں نے پستول کی برآمدگی کی تحریر لکھ کر متعلقہ افراد کے دستخط لے لیے۔ پھر اس نے زیورات اور رقم بھی برآمد کروا دی۔

میں نے پستول اور وہ سکہ جو اس پستول کی نالی سے فائر ہوا تھا۔ واردات والے کمرے سے برآمد کر لیا تھا، دونوں چیزیں الگ پارسل بنا کر اور سر بمہر کر کے ایک کانسٹیبل کے حوالے کیا اور اسے فلوریسنک لیبارٹری کو برائے رپورٹ بھیج دیا۔ وہاں سے یہ رپورٹ آئی تھی کہ یہ گولی اسی پستول سے چلی ہے۔

سیدو بی بی کو اے ایس آئی اقبال شاہ کے ساتھ مجسٹریٹ کے پاس بھیج دیا کہ وہ اس کا اقبالی بیان قلمبند کرے۔ مجسٹریٹ اقبال جرم کرنے والے ملزموں کو پہلے ہی بتا دیتے ہیں کہ وہ اگر اپنی مرضی سے بیان نہیں دینا چاہتا یا کسی تشدد یا لالچ کے ذریعے اس سے بیان لیا جا رہا ہے تو وہ بیان دینے سے انکار کر سکتا ہے اور پھر اسے پولیس کے حوالے کرنے کی بجائے جیل کی حوالات میں بھیج دیا جائے گا۔ سیدو بی

بی نے مجسٹریٹ کو بتایا کہ وہ اپنی رضا و رغبت سے بیان دے رہی ہے۔ آخر مجسٹریٹ نے اس کا اقبالی بیان قلمبند کر لیا پھر اسے جوڈیشل حوالات یعنی جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔

دو دنوں بعد کانسٹیبل فلوریسنک لیبارٹری کی رپورٹ لے آیا جس میں لکھا تھا کہ چلی ہوئی گولی کا یہ سکہ اسی پستول سے فائر ہوا تھا۔ یہ رپورٹ بھی میرے کیس کو تقویت دیتی تھی۔

میں نے بڑی محنت سے مقدمہ تیار کیا اور چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے اپنے مقدمے میں یہ تاثر پیدا کیا تھا کہ اس عورت نے یہ قتل غیرت مندی میں کیا ہے کیونکہ ایک بدکردار شخص نے اس کی بہو کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ مجھے خدشہ یہ نظر آ رہا تھا کہ سیدو بی بی سیشن کورٹ میں جا کر اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے گی لیکن وہ کوئی جرائم پیشہ عورت نہیں تھی اس لیے اس نے اپنے مقدمے کو خراب نہ ہونے دیا۔ سیشن جج نے اس سے پوچھا کہ وہ اپنے اقبالی بیان پر قائم ہے یا اسے جھٹلانا چاہتی ہے۔ سیدو بی بی نے بڑی جرأت مندی سے کہا کہ وہ اس قتل کو جرم سمجھتی ہی نہیں اور یہ اس نے اپنی عزت کی خاطر کیا ہے۔

آپ سن کر حیران ہوں گے کہ سیشن جج نے اسے صرف چار سال سزا سنائی۔

سیشن جج نے اپنے لمبے چوڑے فیصلے میں لکھا کہ سیدن شاہ بدکردار اور مجرمانہ ذہنیت کا آدمی تھا اور اس نے ایک باعزت خاندان کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ سیشن جج نے یہ بھی لکھا کہ مقتول اس قدر بدکردار تھا کہ ملزمہ نے اسے گھر بلایا تو وہ بڑی دلیری سے اس نامحرم عورت کے گھر چلا گیا اور ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ اگر ملزمہ اسے قتل نہ کر دیتی تو مقتول کسی بہت ہی بری حرکت کا ارتکاب کر گزرتا۔

سیشن جج نے دراصل یہ نکتہ سامنے رکھا تھا کہ ملزمہ اپنی بہو کی بے عزتی پر مقتول کے خلاف اشتعال کی حالت میں تھی۔ میں نے وہ گواہ بھی پیش کر دیے تھے جنہوں نے مقتول کو ملزمہ کی بہو روشن بی بی پر دست درازی کرتے دیکھا تھا۔ بے شک یہ فوری اشتعال والا کیس نہیں تھا لیکن اشتعال موجود تھا۔ بہر حال قانون سے الگ ہٹ کر سوچیں تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ سیدو بی بی غیرت مند عورت تھی، اس کی نیت بڑی صاف تھی اور اس نے مقتول کو بدکاری کی خاطر اپنے گھر نہیں بلایا تھا اس لیے اللہ نے اپنا قانون چلا کر سیدو بی بی کو صحیح انصاف دیا ورنہ اسے عمر قید بھی مل سکتی تھی۔

سارو کی سُندری اور ریشمی گجرے

اپنی سروس کے دوران بے شمار کیسوں کی تفتیش کی۔ ان میں بعض کیس بہت دلچسپ اور سبق آموز تھے۔ ایسے ہی ایک کیس کی تفتیش پیش کر رہا ہوں۔ یہ پاکستان بننے سے تین سال پہلے یعنی 1944ء کا واقعہ ہے۔ میں ان دنوں ضلع سرگودھا کے ایک تھانے میں تھانیدار تھا۔

ایک صبح تھانے میں چند آدمی آئے۔ وہ شکل وصورت اور لباس سے خانہ بدوش لگ رہے تھے۔ وہ اپنے ایک آدمی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے آئے تھے۔ رپورٹ درج کروانے کے لیے گمشدہ شخص کا بھائی آیا تھا جس کا نام گوئندہ تھا۔ جس کی گمشدگی کی وہ رپورٹ درج کروانے آیا تھا اس کا نام سارو تھا۔ رپورٹ درج کرنے کے بعد میں نے گوئندہ سے کچھ باتیں پوچھیں۔

گوئندہ سے جو تفصیل معلوم ہوئی اس کے مطابق یہ لوگ نٹوں کے ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دنوں ان کے قبیلے نے ایک نزدیکی گاؤں ساہنا کے قریب ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے گاؤں کا نمبردار شاہو بھی ساتھ آیا تھا۔

یہاں میں نٹوں کے متعلق تھوڑا سا بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ خانہ بدوش لوگ ہیں جس میں نٹ، سانسی اور پکھی داس وغیرہ قومیں ہوتی ہیں۔ یہ پتہ نہیں کہ یہ لوگ کس مذہب اور عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بہت جفاکش اور مضبوط بدن کے مالک تھے۔ اب کہیں کم ہی نظر آتے ہیں۔

یہ قبیلوں کی صورت میں رہتے اور خانہ بدوش زندگی گزارتے تھے۔ آج یہاں کل وہاں۔ کچھ عرصہ ایک مقام پر خیمے لگاتے پھر نقل مکانی کر جاتے۔ ان کی عورتیں بڑی خوبصورت اور تیز و طرار ہوتی ہیں۔ عام طور پر مٹی کے کھلونے گھگھو گھوڑے وغیرہ بنا کر ارد گرد کے علاقوں میں بیچتی ہیں۔ یہ چاندی کا زیور پہنتی تھیں۔ گھاگھرے کے اوپر چست قمیض پہنتی اور بال گوندھ کر رکھتی تھیں۔ ان کی اپنی ایک خاص زبان ہوتی ہے لیکن گاہکوں کے ساتھ پنجابی بولتی ہیں۔

ان کے مرد مضبوط اور چھریرے بدن کے ہوتے ہیں۔ یہ عام طور پر جسمانی کرتب دکھا کر پیسے کماتے تھے۔ ان کا رسے پر چلنے کا کرتب بڑا مشہور تھا۔ موقع ملنے پر یہ لوگ چوری چکاری سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ریچھ، کتے اور بندر پال کر ان کو سدھا کر تماشہ دکھاتے تھے۔ یہ لوگ خاص قسم کے کتے پالتے ہیں جو بہت خونخوار اور وحشی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہر قسم کے جانور کا گوشت کھا جاتے ہیں۔

اب میں اصل واقعہ کی طرف آتا ہوں۔ میں نے گمشدہ آدمی سارو کے بھائی، باپ اور اور ماں سے ان کے بیان لئے۔ ان سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ مختصراً سنا دیتا ہوں۔ سارو کے باپ اور بھائی کا خیال تھا کہ سارو کو قتل کر دیا گیا ہے اور شک میں وہ قبیلے ہی کے ایک آدمی اکرا کا نام لے رہے تھے۔ اکرا سارو کا چچازاد بھائی تھا۔ شک کی وجہ یہ بتائی گئی کہ سارو کی منگنی قبیلے کی سب سے حسین لڑکی سندری سے ہوئی تھی اور وہ دونوں اس سے بہت خوش تھے۔

دوسری طرف اکرا بھی سندری کو پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کا خواہشمند تھا لیکن سندری کو اکرا پسند نہیں تھا اس لیے اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا تھا کہ اکرا کو جواب دے کر اس کی منگنی سارو سے کر دے۔ اکرا کو اس بات کا بہت رنج تھا۔ اس بات پر کئی بار سارو اور اکرا میں لڑائی جھگڑا ہو چکا تھا اور اکرا نے سارو کو دھمکی دی تھی کہ وہ اسے زمین سے اٹھا دے گا۔

''ہمارے قبیلے میں ایسا واقعہ پہلی بار ہوا ہے'' ___ سارو کے بوڑھے باپ گوہرو نے کہا ___ ''ہم لوگ آپس میں لڑائی جھگڑا نہیں کرتے۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو قبیلے کے بڑے صلح صفائی کروا دیتے ہیں۔ قتل تو بہت بڑی بات ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہمارے قبیلے میں پولیس آئی ہے''۔

میں تفتیش کے لئے خانہ بدوشوں کے ڈیرے پر چلا گیا۔ ڈیرے کے نزدیک ایک نہر بہتی تھی۔ سایہ دار درختوں کے نیچے دس بارہ خیمے لگے ہوئے تھے۔ ہم جب ڈیرے میں داخل ہوئے تو چالیس پچاس مرد، عورتیں اور بچے اکٹھے ہو گئے۔ وہ خوفزدہ نظروں سے پولیس والوں کو دیکھ رہے تھے۔ ڈیرے کے سردار نے سب کو وہاں سے خیموں میں جانے کا حکم دیا تو سب وہاں سے کھسک گئے۔

ان کے خیمے کافی کشادہ تھے۔ ان کے اندر سونے کے لیے زمین پر چٹائیاں اور گھاس پھونس بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف چند گدھے بندھے ہوئے تھے اور ان کے قریب ہی دو خونخوار کتے

بند ھے غرارہے تھے۔عورتیں گندھی ہوئی مٹی اور رنگین کاغذوں سے کھلونے وغیرہ بنارہی تھیں۔

میں نے مختلف لوگوں سے بیان لیے جن میں سارو کے قریبی دوست بھی شامل تھے۔سب کے بیانات سے یہی بات سامنے آئی کہ سارو اور اکرا کا سندری پر اکثر جھگڑا ہوتا رہتا تھا اور سارو کی گمشدگی میں اکرا کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔قرائن اور شواہد اکرا کو مشتبہ نمبر ایک ثابت کررہے تھے۔لہٰذا میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر اکرا کو حراست میں لینا ضروری سمجھا۔

میں نے اکرا کی بابت پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ قبیلے کے دوسرے بازیگروں کے ساتھ قریبی دیہات میں کرتب دکھانے کے لیے گیا ہوا ہے اور شام سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔معلوم ہوا کہ اکرا رسے پر چلنے کا ماہر ہے اور چند دوسرے کرتب بھی بڑی مہارت سے کرلیتا ہے۔میں نے اکرا کے باپ سے کہا کہ اکرا جس وقت بھی واپس آئے وہ اسے تھانے بھیج دے۔چند ضروری کارروائیاں کر کے میں واپس تھانے آ گیا۔

اس کیس میں بظاہر کوئی پیچیدگی نظر نہیں آرہی تھی۔بظاہر یہی نظر آرہا تھا کہ ایک نوجوان نے دوسرے کو ایک خوبصورت لڑکی کی خاطر قتل کر دیا ہے۔میں نے سارو کے متعلق جو تفصیلات حاصل کی تھیں ان کے مطابق سارو سانولے رنگ کا اونچے لمبے قد کا خوبصورت جوان تھا۔اس کے بال گھونگریالے تھے۔گمشدگی کے وقت اس نے سفید رنگ کی دھوتی اور نیلے رنگ کی پھولدار قمیض پہن رکھی تھی۔اس کے سر پر جوگیا رنگ کی مایا لگی پگڑی تھی۔

سارو بڑا شوقین مزاج نوجوان تھا۔اس نے لمبے بال رکھے ہوئے تھے جو اس کے صحت مند جسم پر جچتے تھے۔دائیں ہاتھ میں رنگین ریشمی دھاگوں سے بنے ہوئے گجرے پہنے رکھتا تھا جو بہت خوبصورت تھے۔سارو کے پاس ایک بڑی خوبصورت بانسری تھی جو وہ ہر وقت ساتھ رکھتا تھا۔اس نے بانسری کے اوپر بہت خوبصورت دھاگوں سے ڈیزائن بنا رکھے تھے۔اسے بانسری بجانے میں کمال حاصل تھا۔میں نے اس کا حلیہ لکھوا کر اشتہار شوروغوغا جاری کر دیا۔

مغرب کے کچھ بعد اکرا تھانے آ گیا۔اسے میرے سامنے پیش کیا گیا۔وہ درمیانے قد کا سانولا سا لڑکا تھا۔صاف نظر آرہا تھا کہ وہ ڈرا اور سہما ہوا ہے۔میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر اس سے تفتیش کا آغاز کر دیا۔

''سارو کے ساتھ تمہارا جھگڑا کیوں ہوتا تھا؟''___ میں نے اس سے پوچھا۔

''سندری کی وجہ سے''___ اس نے کہا___ ''وہ مجھے سندری کو ملنے سے منع کرتا تھا''۔

''تم سندری سے شادی کرنا چاہتے تھے؟''___ میں نے پوچھا۔

''ہاں!''___ اس نے جواب دیا___ ''لیکن سندری نہیں مانتی تھی''۔

''تم نے سارو کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی''___ میں نے کہا___ ''تم نے کہا تھا کہ تم اسے زمین سے اٹھا دو گے''۔

''وہ تو غصے میں کہہ دیا تھا''___ اس نے میری بات کا مطلب سمجھ کر سہم کر کہا۔

''اور پھر غصے میں ہی اسے قتل بھی کر دیا''___ میں نے اسے کہا اور پوچھا___ ''لاش کہاں چھپائی ہے؟''

وہ تڑپ اٹھا اور میرے پیروں کو پکڑ کر کہنے لگا کہ اس نے سارو کو قتل نہیں کیا۔اس نے یہ بھی کہا کہ سارو اس کا چچازاد بھائی ہے اور اسے سارو کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

''ہم غریب لوگ ہیں''___ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا___ ''اتنا بڑا جرم کرنے کی ہمت نہیں ہے''۔

میں نے اس کے ساتھ بہت وقت لگایا اور پینترے بدل بدل کر اس سے سوال پوچھے مگر اس سے کچھ حاصل نہ ہوا۔وہ میری بات کا جواب کم دیتا تھا اور روتا زیادہ تھا۔کوئی راہ نہ پا کر میں نے مجبوراً اسے زیر دفعہ 54 گرفتار کر لیا اور ریمانڈ کے لیے مجسٹریٹ کے پاس بھجوا دیا۔اس کے بعد میں نے ساہنا کے نمبردار شاہو کو ساتھ لے کر ارد گرد کے دیہات ڈیرہ راٹھاں، ڈھولن اور گدی شاہ وغیرہ کے نمبرداروں کو سارو کی گمشدگی کے متعلق بتایا اور انہیں کہا کہ وہ سارو کی تلاش میں پولیس کی مدد کریں۔

دوسرے دن جو دو کانسٹیبل اکرا کو ریمانڈ کے لیے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کے لیے لے گئے، ریمانڈ لے کر واپس آ گئے۔مجسٹریٹ نے بہت تعاون کیا تھا۔اس نے تھانہ ہیڈکوارٹر سے بہت دور ہونے کی وجہ سے اور قتل کے مقدمے کو پیش نظر رکھتے ہوئے چودہ دنوں کا ریمانڈ دے دیا تھا۔ملزم کو حوالات میں بند کر کے میں نے اپنے اسسٹنٹ رؤف خان کو اس سے پوچھ گچھ پر مقرر کر دیا۔

میں بہت بری طرح تھک چکا تھا،اس لیے تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے میں گھر چلا گیا۔سارو کی گمشدگی کو دو دن گزر چکے تھے اور اس کا سراغ نہیں ملا تھا۔ابھی مجھے لیٹے تھوڑی دیر ہی گزری ہوگی کہ تھانے سے ایک کانسٹیبل آ گیا۔اس نے جو خبر سنائی اس نے مجھے پریشان کر دیا۔

میں نے فوراً وردی پہنی اور تھانے چلا گیا۔

تھانے میں نمبردار شاہو، سارو کا باپ گوہرو اور سندری کی ماں موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سندری کی ماں نے بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا کہ سندری صبح سے غائب ہے اور اب شام ہونے پر بھی واپس نہیں آئی۔ ان کی عورتیں گھگو گھوڑے وغیرہ بیچنے قریبی دیہات تک جاتی رہتی تھیں۔

''کیا سندری پہلے بھی کبھی اتنی دیر تک غائب رہی ہے؟'' ___ میں نے سندری کی ماں سے پوچھا۔

''نہیں سرکار!'' ___ اس نے روتے ہوئے کہا ___ ''وہ ہمیشہ سورج ڈھلنے سے پہلے گھر واپس آجاتی ہے''۔

''کیا وہ اکیلی گئی تھی؟'' ___ میں نے پوچھا ___ ''یا قبیلے کی کوئی عورت اس کے ساتھ تھی؟''

''بستی سے تو دو عورتوں کے ساتھ ہی نکلی تھی'' ___ سندری کی ماں نے کہا ___ ''مگر ان عورتوں نے بتایا ہے کہ بستی سے کچھ دور جا کر تینوں الگ الگ سمت میں چلی گئی تھیں''۔

نمبردار شاہو ان دو عورتوں کو بھی ساتھ ہی لے آیا تھا جو سندری کے ساتھ نکلی تھیں۔ یہ اس نے بڑی عقلمندی کی تھی۔ میں نے ان عورتوں کو بلا لیا اور ان سے پوچھا کہ سندری جب ان سے الگ ہوئی تھی تو اس کا رخ کس طرف تھا۔

''سندری ڈیرہ راٹھاں کی طرف گئی تھی'' ___ ایک عورت نے کہا ___ ''وہ زیادہ تر اسی طرف جانا پسند کرتی تھی''۔

''وہ اس طرف زیادہ کیوں جاتی تھی؟'' ___ میں نے پوچھا ___ ''کسی کے ساتھ اس کا کوئی چکر ہوگا!''

''چکر کا تو ہمیں پتہ نہیں'' ___ ایک عورت نے کہا ___ ''یہ پتہ ہے کہ ڈیرہ راٹھاں کے کسی گھر سے اسے بہت پیسے اور تحفے ملتے تھے، اسی لئے وہ صرف اسی طرف جاتی تھی''۔

''کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کس کا گھر ہے؟'' ___ میں نے پوچھا۔

''نہیں جی!'' ___ دوسری عورت نے کہا ___ ''ہمیں معلوم نہیں نہ اس نے کبھی ہمیں بتایا تھا''۔

میں نے ان عورتوں سے اور بھی بہت سی باتیں پوچھیں لیکن مجھے مزید کچھ حاصل نہ ہوا۔

میں نے گمشدگی کا پرچہ درج کر لیا۔ سندری کے غائب ہو جانے کی وجہ سے کیس کا رخ بالکل ہی بدل گیا تھا۔ اس سے پہلے اکرا پر شک تھا لیکن سندری کی گمشدگی بتا رہی تھی کہ جو کچھ میں سمجھ رہا ہوں کیس اس کے مطابق نہیں ہے۔ میں شروع میں اس کیس کو جتنا سیدھا سادہ سمجھ رہا تھا اب وہی کیس ایسا الجھتا جا رہا تھا کہ کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

میرے تھانے میں عملہ بہت کم تھا۔ میں نے اس واقعے کی رپورٹ لکھ کر اپنے ایس پی کو بھجوا دی اور اس کے ساتھ فوری طور پر ریزرو گارد بھی طلب کر لی۔ اسی شام کو گارد آ گئی۔ اس گارد کا انچارج انسپکٹر مرزا غلام قادر میرا بڑا اچھا دوست اور بہت ہی قابل تفتیشی افسر تھا۔ اس کے آنے سے مجھے اطمینان ہو گیا۔

اس زمانے میں ایسی سنگین وارداتیں کم ہی ہوتی تھیں۔ میرے علاقے میں اوپر تلے دو وارداتیں ہونے سے بھونچال سا آ گیا۔ ایس پی خود ہمارے تھانے میں آیا اور مقدمات کی نگرانی کی۔ ہم نے تفتیش کا دائرہ وسیع کرنا شروع کر دیا۔ دو دن اور گزر گئے لیکن سندری کا سراغ نہ ملا۔ ساہنا، ڈھولن، گدی شاہ دی، ڈیرہ راٹھاں، گلیانی اور ارد گرد کی دیگر آبادیوں میں تلاش جاری رہی۔

میرا دھیان بار بار ڈیرہ راٹھاں کی طرف جاتا تھا اور میں نے وہاں اپنے مخبر بھی چھوڑ رکھے تھے لیکن ابھی تک کوئی کام کی خبر نہ ملی تھی۔ اس بات کا بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ سندری ڈیرہ راٹھاں کے کس گھر زیادہ جاتی تھی جہاں سے اسے پیسے اور تحفے ملتے تھے۔

سندری کی گمشدگی کے دوسرے روز رات کو ایک ایسی اطلاع آئی جس نے سارے مسائل حل کر دیئے۔ آدھی رات کے کچھ بعد کا وقت ہوگا کہ جب تھانے سے ایک کانسٹیبل نے مجھے گھر آ کر سوتے سے جگا دیا۔ اس نے بتایا کہ شاہو نمبردار اور سارو کا باپ گوہرو تھانے آئے بیٹھے ہیں اور وہ کوئی بہت اہم اطلاع لے کر آئے ہیں۔

اس دور میں تھانیدار تفتیش میں بڑی جان مارتے تھے اور بد دیانتی نہیں کرتے تھے۔ اگر کبھی بد دیانتی ہو بھی جاتی تو برائے نام ہی ہوتی تھی۔ میں نے فوراً منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور تیار ہو کر تھانے چلا گیا۔ شاہو نے بتایا کہ سندری ڈیرے پر پہنچ گئی ہے۔ یہ سنتے ہی میرے جسم سے ساری سستی بھاگ گئی اور میں ان دونوں کو اور گارد کو ساتھ لے کر اسی وقت نٹوں کے ڈیرے پر چلا گیا۔

وہاں جا کر دیکھا تو سندری پریشان حال بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے گیلے تھے۔ میں نے سندری سے پوچھا کہ وہ کہاں چلی گئی تھی اور کیا اسے کسی نے اغوا کر لیا تھا۔ اس کے جواب میں اس نے جو بات سنائی اسے سن کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ایک لمحہ بھی مزید ضائع کئے بغیر سندری کو ساتھ لے کر ڈیرہ راٹھاں پر چڑھ دوڑا۔ سندری نے جس مکان کی نشاندہی کی، اسے سپاہیوں نے گھیر لیا۔

میں اور غلام قادر چار کانسٹیبل لے کر دروازے کی طرف سے گئے دروازہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ یہ سندری نے کھولا تھا۔ سندری کو یہاں قید رکھا گیا تھا اور وہ یہاں سے بھاگ کر آئی تھی۔ اس کی تفصیل آگے بیان کروں گا۔ اندر گئے تو ایک کمرے میں ایک ادھیڑ عمر مرد سو رہا تھا۔ اسے اٹھایا تو پولیس کو دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا۔ اسے حراست میں لے لیا گیا۔ دوسرے کمروں سے ایک نوجوان لڑکا اور ایک ادھیڑ عمر عورت ملے، ان کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ دوسرے کمروں سے ایک نوجوان لڑکا اور ایک ادھیڑ عمر عورت ملے، ان کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔

یہ بہت بڑا اور عالیشان حویلی نما مکان تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ادھیڑ عمر مرد کا نام رحماں راٹھ ہے اور وہی اس مکان کا مالک ہے۔ عورت اس کی دوسری بیوی ہے اور نوجوان اس کا سوتیلا بیٹا ہے جس کا نام خانو ہے۔

ابھی اس چھاپے کا ایک مرحلہ باقی تھا۔ میں نے جس مقصد کے لیے اتنی پھرتی دکھائی تھی اس میں کامیاب رہا تھا اور گھر والوں کو سوتے میں جا لیا تھا۔ میں سندری کی رہنمائی میں اوپر چلا گیا۔ اوپر بھی تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ دو ذرا بڑے تھے اور ساتھ ساتھ تھے۔ تیسرا کمرہ نسبتاً چھوٹا تھا اور ان دو کمروں سے ذرا ہٹ کر بنا ہوا تھا۔

اس سے پہلے میں نے گاؤں کے دو معزز آدمی گھروں سے جگا کر بلوا لئے تھے۔ انہیں میں نے گواہ بنانا تھا۔ یہ قانونی طریقہ ہوتا ہے۔ میں نے سندری کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو سندری نے چھوٹے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ میں اسے ساتھ لے کر اس کمرے میں کی طرف گیا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں، سندری اور دونوں گواہ اندر چلے گئے۔ کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی درمیان میں ایک پلنگ پڑا ہوا تھا۔ کمرے کی شمالی دیوار میں کھڑکی تھی جس کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔

سندری کے کہنے پر میں نے پلنگ کے اوپر پڑا ہوا تکیہ اٹھایا تو اس کے نیچے ایک خوبصورت

بانسری اور رنگین خوبصورت دھاگوں سے بنے ہوئے تین گجرے پڑے تھے۔ یہ بانسری اور گجرے سارو کے تھے۔ میں نے برآمدگی کے کاغذات تیار کئے۔ دونوں معزز گواہوں سے اس پر دستخط کروائے۔

اس تمام کارروائی کے بعد میں نے رحماں راٹھ کو باقاعدہ گرفتار کر لیا اور اس کے سوتیلے بیٹے اور دوسری بیوی کو بھی حراست میں لے لیا۔ اس کے بعد میں نے حویلی کو بند کر کے دو کانسٹیبل پہرے پر کھڑے کر دیئے۔ تھانے پہنچ کر ملزموں کو حوالات میں بند کر کے خود میں تھوڑا آرام کرنے کے لیے گھر آ گیا۔ میں نے اپنے اے ایس آئی کو ہدایت کر دی تھی کہ کسی ملزم کو سونے نہ دے۔ میرا ارادہ صبح پوچھ گچھ کرنے کا تھا۔

صبح میں جلدی تیار ہو کر تھانے پہنچ گیا۔ یہاں میں آپ کو سندری کا بیان مختصر کر کے سنا دیتا ہوں۔ سندری نے کچھ پنجابی اور کچھ اپنی خانہ بدوشوں والی ملی جلی زبان میں بڑا لمبا بیان تھا۔ اس دوران میں اس سے سوال بھی پوچھتا گیا۔ سندری کے بیان اور میرے سوالوں کے جواب ملا کر جو بات سامنے آئی وہ میں ایک ترتیب سے پیش کر دیتا ہوں۔

سندری بھی اپنے ڈیرے کی دوسری عورتوں کی طرح مٹی کے کھلونے اور کاغذی گھوڑے وغیرہ بیچنے کے لیے اردگرد کے دیہات اور بستیوں میں جاتی رہتی تھی۔ اسی سلسلے میں اس کا ڈیرہ راٹھاں میں بھی آنا جانا ہونے لگا تھا۔

ایک دن وہ ڈیرہ راٹھاں میں کھلونے بیچ رہی تھی۔ جب وہ رحماں راٹھ کی حویلی کے قریب پہنچی تو رحماں راٹھ حویلی سے نکلا اور اسے کھلونے دکھانے کو کہا۔ رحماں راٹھ نے سندری سے بہت سے کھلونے لیے اور خاصے پیسے دیئے اس کے بعد جب بھی وہ ڈیرہ راٹھاں جاتی، رحماں راٹھ اسے روک کر حویلی کے اندر لے جاتا اور کھلونے لے کر اسے کبھی پیسے، کبھی آٹا اور کبھی کپڑے دیتا۔ ایک دو بار اس نے سندری کو مکئی کا آٹا، مکھن اور لسی بھی دی۔

جب سندری کی ماں اور سارو کو اس بات کا پتہ لگا تو دونوں نے اسے منع کر دیا کہ آئندہ وہ ڈیرہ راٹھاں نہ جایا کرے۔ سندری کے منگیتر سارو کا خیال تھا کہ حویلی والے آدمی کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ سندری نے اس کی بات مان لی اور اس طرف جانا بند کر دیا۔ وہ اگر ڈیرہ راٹھاں جاتی تھی تو حویلی کی طرف نہ جاتی۔

ایک روز وہ کھلونے بیچ کر آ رہی تھی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ جدھر سے وہ آ رہی تھی، واپسی پر

ڈیرہ راٹھاں راستے میں پڑتا تھا۔ سندری ڈیرہ راٹھاں کے قریب سے گزر رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ سامنے سے رحماں راٹھ ایک آدمی کے ساتھ آ رہا تھا۔ سندری نے کترا کر گزر جانا چاہا لیکن رحماں راٹھ سندری کو دیکھ چکا تھا۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا سندری کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ اب وہ حویلی کیوں نہیں آتی۔ سندری نے اسے بتایا کہ اس کا منگیتر سارو اس بات کو پسند نہیں کرتا۔

رحماں راٹھ نے سندری سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ حویلی چلے۔ وہاں اس نے سندری کے لیے نئے کپڑے اور پیسے رکھے ہوئے ہیں۔ سندری نے انکار کر دیا اور راستہ کاٹ کر آگے کو چل پڑی۔ کچھ آگے جا کر اس نے مڑ کر دیکھا تو رحماں راٹھ اور وہ آدمی آپس میں کچھ بات کر رہے تھے۔ ان کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے رحماں راٹھ اپنے ساتھی کو کچھ ہدایات دے رہا ہے۔ وہ آدمی تیزی سے ایک طرف بھاگ اٹھا اور رحماں سندری کے پیچھے چل پڑا۔ یہ دیکھ کر سندری گھبرائی اور تیز تیز چلنے لگی۔ اس نے دیکھا رحماں راٹھ نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔

آگے جا کر ایسا علاقہ آ جاتا تھا جو بالکل ویران تھا۔ ہر طرف جھاڑیاں، درخت اور سرکنڈے پھیلے ہوئے تھے۔ سورج ڈھل چکا تھا اور اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ سندری کو خوف محسوس ہونے لگا اور اس نے آہستہ آہستہ بھاگنا شروع کر دیا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے ایک سایہ سا اپنے پیچھے آتا دکھائی دیا۔ سائے کے ڈیل ڈول سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ احمال راٹھ ہے۔

سندری نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ اچانک ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ سے ایک آدمی اٹھا اور اس نے پلک جھپکتے میں سندری کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔ سندری کی چیخ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ سندری بڑا تڑپی، زور لگایا لیکن پکڑنے والے کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اس دوران رحماں راٹھ بھی وہاں پہنچ گیا۔ دونوں نے مل کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور پھر منہ پر بھی ایک کپڑا مضبوطی سے باندھ دیا۔

سندری کی حالت ایسی ہو گئی کہ اس پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ دونوں اسے اٹھا کر ایک طرف کو چل پڑے۔ کچھ آگے جا کر انہوں نے سندری کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی۔ کچھ دیر وہ اسے لے کر چلتے رہے۔ پھر ایسے لگا جیسے وہ کسی مکان میں داخل ہوئے ہوں۔ دروازہ کھلنے کی آواز اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ اس کے بعد اسے ایک چارپائی پر ڈال دیا گیا۔ اس کی آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔

سندری نے دیکھا، سامنے رحماں راٹھ اور وہی آدمی کھڑا تھا جو راستے میں رحماں راٹھ کے ساتھ تھا۔

''چپ چاپ پڑی رہو'' ـــــ رحماں اٹھ نے سندری سے کہا ـــــ ''میں تمہارے منہ سے کپڑا کھول رہا ہوں۔ ذرا بھی آواز نکلی تو تمہاری زبان کاٹ دوں گا''۔

اس کے بعد رحماں کے ساتھی نے رحماں کے اشارے پر آگے بڑھ کر اس کے منہ سے کپڑا کھول دیا اور پھر ہاتھ پاؤں بھی کھول دیے۔ آزاد ہوتے ہی سندری رحماں کے پاؤں پر گئی اور دبی دبی آواز میں منتیں کرنے لگی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔

''دریا کے کنارے میری بے شمار زمین ہے'' ـــــ رحماں راٹھ نے کہا ـــــ ''میری دولت کا کوئی حساب نہیں ہے۔ میں اس علاقے کا بہت بڑا زمیندار ہوں...... اگر زندگی چاہتی ہو تو میرے ساتھ شادی کر لو عیش کرو گی۔ یہاں آرام سے رہو اور اچھی طرح سوچ کر جواب دو''۔

وہ دن اور اس سے اگلا دن اسی طرح گزر گیا۔ دوسرے دن کا واقعہ ہے جب رحماں راٹھ حسب معمولی سندری کو شادی کے لیے قائل کر رہا تھا۔ اس وقت باہر سے اس کا ملازم آیا اور آہستہ آہستہ رحماں راٹھ سے کچھ کہنے لگا۔ ملازم کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ پولیس سندری کی تلاش میں سرگرمی دکھا رہی ہے اور اردگرد کے دیہات کے علاوہ ڈیرہ راٹھاں میں بھی پولیس اور مخبر پھر رہے ہیں (یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے سندری کی تلاش میں ہر طرف پولیس کے جوان اور مخبر پھیلا دیئے تھے)

رحماں راٹھ یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ دونوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور سندری کو اوپر ایک کمرے میں لے جا کر باہر سے کنڈی لگا دی۔ رحماں نے گاؤں میں پولیس کی آمد و رفت سے گھبرا کر یہ قدم اٹھایا تھا۔ سندری نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں مردانہ کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اسے اسی کمرے میں شام کا کھانا دیا گیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔

رات آئی تو سندری سونے کی نیت سے پلنگ پر پڑی چادر اور گدا درست کرنے لگی۔ اس نے تکیہ اٹھایا تو اس کے نیچے ایک خوبصورت بانسری اور تین ریشمی گجرے نظر آئے۔ سندری پہلی نظر میں پہچان گئی کہ یہ بانسری اور گجرے سارو کے ہیں۔ اس سے سندری نے انداہ لگایا کہ سارو بھی یہیں کہیں قید ہے یا اسے اس حویلی میں لایا گیا ہوگا۔ سندری کو اس کمرے میں شمالی دیوار پر

ایک کھڑکی نظر آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھولنے کی کوشش کی لیکن کھڑکی باہر سے بند تھی۔

سندری نے دیکھا کھڑکی اتنی مضبوط نہیں لگ رہی تھی۔ بوسیدہ سی لکڑی لگی ہوئی تھی۔ سندری کوئی نرم و نازک لڑکی نہیں تھی۔ وہ خانہ بدوش قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا جسم مضبوط اور طاقت والا تھا۔ اس نے پاؤں کی چند ضربیں لگائیں تو کھڑکی باہر کی طرف کھل گئی۔ اس نے جھانک کر نیچے دیکھا تو نیچے اسے چھت نظر آئی۔ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ یہاں سندری کی بازیگروں والی صلاحیتیں کام آئیں اور با آسانی چھت پر اتر گئی۔

اس نے دیکھا یہ رحماں راٹھ کی وہی حویلی تھی جہاں وہ آتی جاتی رہتی تھی۔ یہاں سے نکلنا اب اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ حویلی سے نکل کر وہ اپنے ڈیرے کی طرف بھاگ اٹھی۔ راستے اسے سارے معلوم تھے۔ اپنے ڈیرے تک پہنچنے کے لیے اسے نہر پار کرنی تھی۔ نہر کا پل ذرا دور تھا اور عام حالات میں وہ پل سے ہی آتی جاتی تھی لیکن اس رات خوف اور وہشت کی وجہ سے اس نے پل کی طرف جانا مناسب نہ سمجھا اور وہیں سے نہر میں کود کر تیرتے ہوئے نہر پار کر لی۔

جب وہ ڈیرے میں پہنچی تو اس کی ماں اور کچھ دوسرے لوگ جاگ رہے تھے۔ وہ ماں سے لپٹ گئی۔ پھر اس نے اپنی آپ بیتی سنائی جسے سن کر گوہروا اور سندری کی ماں فوراً ساہنا گاؤں پہنچے اور وہاں کے نمبردار شاہو کو جگا کر ساری صورت حال بتائی۔ شاہو ان کو ساتھ لے کر تھانے آ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور میں نے جو کارروائی کی وہ بیان ہو چکی ہے۔

میں نے سب سے پہلے رحماں راٹھ کو بلایا۔ وہ میرے کمرے میں آیا تو میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد اور مضبوط جسم اس کی خوشحالی ظاہر کر رہا تھا۔ اس کی مونچھیں بڑی بڑی اور سروں سے اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے کندھوں تک لمبے بال رکھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس نے بڑے مہنگے کپڑے پہن رکھے تھے۔

ساہنا گاؤں کے نمبردار شاہو نے بتایا تھا کہ یہ اس علاقے کا بہت بڑا زمیندار ہے اور اس کی بڑی لمبی چوڑی برادری ہے۔ شاہو نے یہ بھی بتایا کہ یہ لوگ رسہ گیری اور دوسرے جرائم کرنے سے ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ میں نے رحماں راٹھ سے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سارو کی بانسری اور ریشمی گجرے نکال کر میز پر رکھ دیئے اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی خوف یا پریشانی نہیں تھی۔ وہ بڑا مضبوط آدمی تھا۔

"سندری کو کیوں اغوا کیا تھا؟" — میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ مجھے اچھی لگتی تھی" — رحماں راٹھ نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا — "میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اس لیے اسے اٹھا لیا"۔

"سارو کہاں ہے؟" — میں نے پوچھا اور کہا — "جھوٹ نہ بولنا۔ اس کی بانسری اور ریشمی گجرے تمہاری حویلی سے برآمد ہوئے ہیں"۔

"میں ایک عزت دار آدمی ہوں" — اس نے کہا — "سارا معاملہ آپ پر کھل چکا ہے۔ اگر آپ میری عزت رکھیں اور میری مدد کریں تو میں ہر بات ٹھیک ٹھیک بتا دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ جو خدمت کہیں گے، کروں گا"۔

میں نے اس کے ساتھ جھوٹا وعدہ کر لیا کہ میں اس کی پوری پوری مدد کروں گا اور اس کو اس کیس سے صاف نکال لوں گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سندری کے اغوا کے وقت اس کے ساتھ کون آدمی تھا۔

"وہ میرا ملازم باطی تھا" — اس نے کہا — "آپ ایسا کریں سارا ملبہ باطی پر ڈال دیں۔ میں باطی کے گھر والوں کو بہت زیادہ پیسے دے دوں گا"۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ایسا ہی کروں گا بشرطیکہ وہ اپنا مکمل بیان دے دے۔ وہ بیان دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے بڑا طویل بیان دیا تھا جو اختصار کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ یہ بیان میں رحماں راٹھ کی زبانی پیش کر رہا ہوں۔

ڈیرہ راٹھاں کا نام ہماری راٹھ برادری کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ میری پہلی بیوی مر گئی ہے۔ اس سے میری ایک بیٹی ہے۔ مجھے بیٹے کی بڑی خواہش تھی۔ میں نے بیٹا حاصل کرنے کے لیے اپنی برادری کی ہی ایک بیوہ عورت نیامت بی بی سے شادی کر لی۔ اس کا پہلے خاوند سے ایک بیٹا ہے جس کا نام خانو ہے۔

نیامت بی بی سے ابھی تک کوئی اولاد نہیں پیدا ہوئی جبکہ میری بیٹے کی خواہش شدید ہوتی گئی۔ مجھے اپنی جائیداد کے لیے اور میرا نام زندہ رکھنے کے لیے ایک نر بچے کی ضرورت تھی۔

انہی دنوں خانہ بدوشوں کی یہ لڑکی سندری ہمارے گاؤں میں آنے جانے لگی۔ میری اس پر نظر پڑی تو یہ مجھے پسند آ گئی۔ میں نے بہانے سے اسے پیسے، کپڑے اور آٹا وغیرہ دینا شروع کر دیا۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ غریب لوگوں کی لڑکی ہے اور میں اس کے ماں باپ کو معقول رقم دے کر خرید

لوں گا۔

خانہ بدوشوں کا ایک لڑکا ہمارے گاؤں کے لڑکوں کا دوست بن گیا تھا۔ وہ بڑے چمکیلے اور بھڑکیلے کپڑے پہنتا تھا اور بانسری بجانے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اس کی بانسری بہت خوبصورت تھی جس کے اوپر اس نے بڑے خوبصورت ڈیزائن بنا رکھے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کلائی میں ریشمی دھاگوں کے بنے ہوئے تین بڑے خوبصورت گجرے پہنتا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ اس کا نام سارو ہے اور یہ سندری کا منگیتر ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اسی کی وجہ سے سندری کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔

میرے دل میں سارو کے لیے رقابت اور نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہ بڑا چھیل چھبیلا اور بانکا نوجوان تھا۔ اپنے گاؤں میں اسے دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا۔ میں نے اسے بلا کر ڈیرہ راٹھاں میں آنے اور بانسری بجانے سے منع کر دیا۔ اس نے میری بات کو بڑی لاپرواہی سے سنا اور چلا گیا۔ اس کے انداز میں خودسری اور میرے لیے حقارت صاف محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے اپنے خاص ملازم باطی کو سندری کی ماں کے پاس بھیجا کہ وہ سندری کی شادی میرے ساتھ کر دیں اور جتنی رقم چاہیں لے لیں۔ باطی نے آ کر بتایا کہ سندری کی ماں نے کہا کہ سندری کی منگنی سارو کے ساتھ ہو چکی ہے اس لیے ایسا ممکن نہیں ہے۔ اگر سارو خود یہ منگنی توڑ دے تو وہ سندری کو اپنی مرضی سے جہاں چاہیں دے سکتے ہیں۔

یہ جواب سن کر سارو میرے آنکھوں میں بری طرح کھٹکنے لگا۔ میں سندری کو پا لینے کی خواہش میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ میں نے خود سارو سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور باطی کو بھیج کر اسے اپنی حویلی میں بلا بھیجا۔ سارو آ گیا۔ اس نے حسبِ معمول چمکیلے بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور بانسری اس کے ہاتھ میں تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے غصہ آنے لگا۔

"یہ بھڑکیلے کپڑے پہن کر گاؤں میں نہ آیا کرو" ___ میں نے اسے کہا۔

"میں خود نہیں آیا ہوں" ___ اس نے اطمینان سے کہا ___ "تمہارا ملازم لے کر آیا ہے۔ میرے کپڑوں کی فکر چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کیوں بلایا ہے؟"

"تم سندری کو چھوڑ دو" ___ میں نے کہا۔

"کیوں چھوڑ دوں؟" ___ سارو نے کہا ___ "وہ میری منگ ہے"۔

"میں سندری کو خرید لوں گا" ___ میں نے کہا ___ "اور اس سے شادی کروں گا۔ تمہیں

جتنی رقم کی ضرورت ہے مجھ سے لے لو اور کسی اور لڑکی سے شادی کر لو۔ اگر تمہاری کوئی اور بھی شرط ہے تو میں وہ بھی پوری کر دوں گا"۔

"ہاں، میری ایک شرط ہے" ___ سارو نے کہا۔

"جلدی بتاؤ کیا ہے وہ شرط" ___ میں نے بے تابی سے کہا ___ "میں تمہاری ہر شرط پوری کرنے کو تیار ہوں"۔

"تم مجھے غریب آدمی سمجھ کر ایسی بات کر رہے ہو" ___ سارو نے غصے سے کہا ___ "میری شرط یہ ہے کہ تم سندری کے بدلے میں اپنی چھوہری (بیٹی) مجھے دے دو"۔

سارو نے بڑی سخت بات کہہ دی تھی۔ ہم دیہاتی لوگ ایسی باتوں پر قتل کر بھی دیتے ہیں اور قتل ہو بھی جاتے ہیں۔ سارو تو چلا گیا لیکن جاتے جاتے وہ جو آگ میرے اندر بھڑکا گیا تھا، وہ مجھے بری طرح جلانے لگی۔ مجھے کسی پل قرار نہ تھا۔ میں نے اپنے وفادار ملازم باطی کو بلایا اور اسے کہا کہ سارو کو جلد از جلد اس زمین کے اوپر سے زمین کے نیچے پہنچا دو۔

باطی کو پتہ تھا کہ شام کو سارو ایک مخصوص جگہ پر بیٹھ کر بانسری بجاتا ہے۔ یہ جگہ قبرستان سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ میں اور باطی اسی طرح کو اس جگہ چلے گئے۔ بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ بانسری کی مسحورکن آواز ہماری راہنمائی کر رہی تھی۔ ہم ذرا آگے گئے تو سارو نظر آنے لگا۔ وہ ایک بہت بڑے پتھر پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔

اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ پھر سارو نے بانسری بجانی بند کی اور ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ ہم پہلے ہی ایک مناسب جگہ دیکھ کر گھات میں بیٹھ گئے تھے۔ سارو چلتا ہوا ہمارے قریب پہنچا اور پھر آگے نکل گیا۔ باطی کے پاس موٹا ڈنڈا تھا۔ وہ دبے پاؤں سارو کے پیچھے گیا اور ڈنڈے سے اس کے سر پر ایک زوردار ضرب لگائی۔ سارو لڑکھڑا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

باطی نے اسے اٹھا کر کندھے پر لاد لیا اور ہم اسے قبرستان لے گئے۔ دیہات میں لوگ سرِ شام گھروں میں گھس جاتے ہیں اور باہر کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ وہ تو علاقہ ہی ایسا تھا کہ قبرستان ساتھ تھا اس لیے اس طرف کسی کے آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

قبرستان پہنچ کر ہم نے ایک گہرا گڑھا کھودا۔ اس مقصد کے لیے کدال ہم نے پہلے ہی وہاں گھنی جھاڑیوں میں چھپا دی تھی۔ جب گڑھا تیار ہو گیا تو میں نے سارو کا گلا دبا دیا۔ وہ تھوڑا سا تڑپا اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ ہم نے لاش کو گڑھے میں ڈال کر اوپر مٹی ڈال دی اور سطح برابر

کے اس کے اوپر خشک جھاڑیاں اور درختوں کے پتے وغیرہ ڈال دیئے۔

ہم نے سارو کو ایسی صفائی سے قتل کیا تھا اور اس کی لاش غائب کی تھی کہ کسی کو ہمارے خلاف ذرا سا شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ قبرستان اور اس کے ارد گرد کا علاقہ ایک قسم کا جنگل ہے۔ ہم اطمینان سے گھر آ گئے۔ سارو کی لاش دفن کرنے سے پہلے ہی میں نے اس کے بازو سے تین ریشمی گجرے اتار لیے اور اس کی بانسری اٹھا کر جیب میں رکھ لی تھی۔

میرا سوتیلا بیٹا خانو جب بھی سارو کو دیکھا تھا تو مجھ سے فرمائش کرتا تھا کہ سارو جیسی بانسری اور گجرے اسے بھی لا کر دوں۔ میں نے سارو کی بانسری اور گجرے خانو کو دے دیئے اور کہا کہ یہ میں اس کے لیے میلہ بابا بخی شاہ سے لایا ہوں۔ خانو بانسری اور گجرے لے کر بہت خوش ہوا۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ بانسری اور گجرے باہر بالکل نہ لے کر جائے ورنہ میں اس سے دونوں چیزیں واپس لے لوں گا۔

پھر سارو کی گمشدگی کی خبر پھیل گئی۔ پولیس بھی بڑی سرگرمی سے اسے تلاش کرنے لگی لیکن سارو زمین کے اوپر ہوتا تو ملتا۔ وہ تو دنیا کی نظروں سے اوجھل زمین کے اندر تھا۔ میں نے پھر سندری کی ماں سے بات کی کہ وہ سندری کو میرے حوالے کر دے۔ میں نے جواب بھیجا کہ میں تو تیار ہوں لیکن سندری نہیں مانتی۔

اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا۔ سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلتے دیکھ کر میں نے انگلیاں ٹیڑھی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے باطی سے بات کی اور ہم نے منصوبہ بنا لیا کہ سندری کو اٹھا لیں گے۔ ایک شام میں اور باطی کہیں سے آ رہے تھے کہ سامنے سے سندری آتی نظر آئی۔ جگہ اور وقت مناسب دیکھ کر ہم نے اسی وقت سندری کو پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ سندری نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ ہم سے کترا کر راستہ بدلنا چاہتی تھی لیکن ہم تیز رفتاری سے اس کے قریب پہنچ گئے۔

میں نے سندری کو حویلی چلنے کا کہا اور بڑے لالچ دیئے کہ اسے عیش کراؤں گا اور وہ ملکہ بن کر رہے گی لیکن سندری نہ مانی اور آگے کو چل پڑی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کس راستے سے جا رہی ہے اور وہ کہاں کہاں سے گزرے گی۔ میں نے باطی کو کہا کہ وہ بھاگ کر جائے اور لمبا چکر کاٹ کر راستے میں فلاں جگہ جا کر چھپ جائے اور جب سندری اس کے قریب سے گزرے تو وہ پیچھے سے اسے پکڑ لے۔ میں خود سندری کے پیچھے چل پڑا مجھے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر سندری نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

سندری اس جگہ پہنچی جہاں باطی پہلے سے چھپا ہوا تھا۔ باطی نے سندری کو قابو کر لیا اور ہم دونوں نے اس کے ہاتھ پاؤں اور منہ باندھ کر اٹھا لیا۔ آگے جا کر ہم نے اس کی آنکھیں بھی باندھ دیں۔ وہاں سے سندری کو ہم کھیتوں میں لے گئے جہاں مویشیوں اور بھوسے کے لیے چھوٹا سا مکان بنا ہوا تھا۔ وہاں ہم رات گہری ہونے تک رکے رہے۔ اندھیرا زیادہ ہو گیا تو ہم بڑی احتیاط سے سندری کو حویلی میں لے آئے۔

میں سندری کو شادی کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا لیکن وہ مان ہی نہیں رہی تھی۔ اس دوران پولیس نے بڑی سرگرمی سے سندری کی تلاش شروع کر دی۔ ہمارے گاؤں ڈیرہ راٹھاں میں بھی پولیس آنے جانے لگی۔ باطی نے مجھے بتایا کہ پولیس کے مخبر سندری کی خوشبو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ یہ سن کر میں خوفزدہ ہو گیا۔ باطی نے مشورہ دیا کہ سندری کو حویلی کے اوپر والے کمرے میں رکھا جائے تو بہتر ہوگا، نچلے حصے میں خطرہ زیادہ ہے۔

میں نے سندری کو اوپر والے کمرے میں بند کر دیا۔ پتہ نہیں وہ وہاں سے کیسے نکلنے میں کامیاب ہو گئی اور آپ تک پہنچ گئی۔

رحماں راٹھ کا بیان لینے کے بعد اس سے دستخط کروائے اور اسے تھانے کی حوالات میں بھیج دیا۔

''اپنا وعدہ نہ بھولنا آغا جی!''___ حوالات جانے سے پہلے رحماں راٹھ نے کہا___ ''میں عزت دار آدمی ہوں۔ آپ میری عزت رکھیں گے تو میں آپ کو مالا مال کر دوں گا''۔

میں نے اسے جھوٹی تسلی دے کر مطمئن کر دیا۔ غور کریں، وہ ایک معصوم نوجوان کو صرف اس وجہ سے قتل کر چکا تھا کہ اس کی خوبصورت منگیتر پر قبضہ کر سکے۔ پھر اپنی نفسانی خواہش کے زیر اثر ایک نوجوان لڑکی کو راہ چلتے اٹھا لیا تھا۔ اب بھی وہ اپنے آپ کو عزت دار سمجھ رہا تھا اور اپنے گناہوں کی سزا اپنے ملازم باطی کو دلوانا چاہتا تھا۔

اس نے قتل بڑی صفائی سے کیا تھا اور سندری کو اغوا کرنے میں بھی بڑی استادی دکھائی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا ذہن مجرمانہ ہے۔ آپ نے جرم و سزا کی کہانیوں میں پڑھا ہو گا کہ مجرم جتنا بھی چالاک ہو، اس سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ پکڑا جاتا ہے۔ ایسی ہی غلطی رحماں راٹھ سے بھی ہو گئی۔ سارو کو زمین میں دفن کرتے وقت اس کی نظر بانسری اور ریشمی گجروں پر پڑی تو اسے اپنے سوتیلے بیٹے خانو کی خواہش یاد آ گئی جو اس سے بار بار ایسی ہی

بانسری اور گجروں کے لیے فرمائش کر چکا تھا۔ اس کی عقل ایسی ماری گئی کہ اس نے یہ دونوں چیزیں اٹھالیں اور خانو کو دے دیں۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ سارو کی بانسری اور ریشمی گجرے ہر طرف مشہور ہیں اور خانو کے پاس یہ چیز دیکھ کر کوئی بھی بہ آسانی شناخت کر سکتا تھا۔

جب اس نے پولیس سے خوفزدہ ہو کر سندری کو اوپر والے کمرے میں بند کیا تو پھر غلطی کر گیا۔ اس نے سندری کو اس کمرے میں بند کر دیا جو خانو کے زیر استعمال تھا اور خانو نے بانسری اور ریشمی گجرے پلنگ پر تکیئے کے نیچے رکھے ہوئے تھے جو سندری نے دیکھ لئے۔

دراصل اللہ جب کسی کی دراز رسی کو کھینچنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے لیے اسباب بھی خود ہی پیدا کر لیتا ہے۔ میں نے فوری طور پر سارو کی نعش برآمد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے میں اپنے اسٹاف کے علاوہ ڈیرہ راٹھاں کے دو معززین کو ساتھ لے کر اس جگہ گیا جہاں رحماں راٹھ کے کہنے کے مطابق انہوں نے سارو کی لاش دفن کی تھی۔ رحماں راٹھ ہمارے ساتھ تھا۔

اس سے پہلے میں نے اپنے اے ایس آئی کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ رحماں کے ملازم باطی کو گرفتار کر کے تھانے لے آئے۔ اے ایس آئی دو کانسٹیبل لے کر چلا گیا تھا۔ باطی کی گرفتاری بہت ضروری تھی۔

رحماں راٹھ کی راہنمائی میں ہم قبرستان تک پہنچ گئے۔ وہاں جا کر رحماں راٹھ نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں انہوں نے سارو کو قتل کر کے دبایا تھا۔ گواہوں کی موجودگی میں رحماں راٹھ نے لاش برآمد کروا دی۔ میں نے موقعہ پر جو کارروائی کرنی تھی، وہ کر کے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی اور ہم واپس تھانے آ گئے۔

تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ وہ اے ایس آئی واپس آ گیا جو باطی کو گرفتار کرنے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ باطی لاپتہ ہے اور گاؤں میں کہیں بھی نہیں ملا۔ میں نے رحماں راٹھ کر بلا کر اس سے باطی کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ آپ کو دریائے چناب کے کنارے ایک مکان سے مل جائے گا۔ میں نے اس سے پتہ پوچھ کر اے ایس آئی کو بتایا کہ وہاں چھاپہ مارے۔ اے ایس آئی فوری طور پر باطی کی گرفتاری کے لیے چلا گیا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزرا ہو گا جب اے ایس آئی باطی کو لے کر آ گیا۔ وہ تقریباً چالیس سال عمر کا مضبوط شخص تھا۔ وہ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا کہ اس کو حوالات میں بند رحماں راٹھ کا نظارہ کروا کے لاؤ۔ اے ایس آئی نے ایسا ہی کیا اور اسے حوالات کا چکر لگوا کر

میرے پاس لے آیا۔

"تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "بہتر ہے اقبالی بیان دے دو۔ اگر خود بیان دو گے تو فائدے میں رہو گے"۔

باطی نے فوراً بیان دے دیا۔ اس کا بیان رحماں راٹھ سے مختلف نہیں تھا بلکہ اس نے رحماں راٹھ کے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔ یہاں میں باطی کا بیان لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ خوامخواہ بوریت ہو گی۔ میں نے اپنی ضرورت کے تحت باطی کو وعدہ معاف گواہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ باطی کو اس بات کا پتہ لگا تو وہ بخوشی وعدہ معاف گواہ بننے پر تیار ہو گیا۔ اس نے کہا کہ وہ عدالت میں ٹھونک بجا کر بیان دے گا۔

اس کے بعد میں نے رحماں راٹھ کی دوسری بیوی نیامت بی بی کا بیان لیا۔ اس نے اپنے بیان میں بتایا کہ اسے سارو کے قتل کے بارے میں بالکل علم نہیں تھا البتہ سندری کے اغوا کے متعلق وہ جانتی تھی۔ اس نے بتایا کہ رحماں راٹھ عورتوں کا شکاری ہے اور جو عورت اسے پسند آ جاتی کسی نہ کسی طرح اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے بعد میں نے رحماں کے سوتیلے بیٹے خانو کا بیان لیا۔ اس نے بھی ماں کی طرح وہی باتیں بتائیں جو وہ بتا چکی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے سوتیلے باپ نے اسے بانسری اور ریشمی گجرے دیئے تھے اور کہا تھا کہ یہ چیزیں وہ میلہ تخی شاہ سے لایا ہے۔ میں شروع میں اس مقدمے میں جتنا پریشان ہوا تھا، آگے جا کر اللہ تعالیٰ نے میری اتنی ہی مدد کی اور سب کچھ روزِ روشن کی طرح میرے سامنے آ گیا۔ میں نے مقدمہ تیار کر کے کورٹ میں بھیج دیا۔ احمال راٹھ اور باطی کو میں نے جوڈیشل لاک اپ میں بند کر دیا۔ علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں اس مقدمے کی سماعت ہوئی۔ باطی اور خانو نے رحماں راٹھ کے خلاف بیان دیئے۔ نیامت بی بی کا بیان بھی رحماں راٹھ کے خلاف جاتا تھا۔ اصل اہمیت باطی کے بیان کی تھی۔ واقعاتی شہادت اور وعدہ معاف گواہ کے بیان کی وجہ سے کیس بالکل صاف ہو گیا اور مجسٹریٹ کو فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

عدالت نے رحماں راٹھ کو سزائے موت سنا دی۔ باطی کو وعدہ معاف گواہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا اور خانو اور اس کی ماں کو بھی بری کر دیا گیا۔ ان پر کوئی الزام نہیں تھا۔

❋ ❋ ❋

زمین کا بھید

مَیں نے بڑی بھرپور اور ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہے۔ پولیس کی نوکری جتنی محنت طلب تھی اتنی ہی دلچسپ بھی۔ اپنی سروس کے دوران بھانت بھانت کے انسانوں سے واسطہ پڑا۔ شیطان صفت انسان بھی دیکھے اور فرشتہ خصلت بھی۔ جہاں مکار اور چکر باز انسانوں سے واسطہ پڑا، وہیں بیوقوفی کی حد تک سادہ لوح انسان بھی دیکھے۔ غیرت مند بھی ملے اور بے غیرت بھی۔ ان مجرموں میں مردوں کی تعداد زیادہ تھی اور عورتوں کی کم۔ ایسی زندگی گزارنے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے عام لوگوں کے مقابلے میں زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھا اور برتا ہے۔

آج میں 80 کے پیٹے میں ہوں اور زندگی کی شام ہونے کو آئی ہے۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جب گھر والے بھی بوڑھا سمجھ کر ہر قسم کے فرائض سے سبکدوش کر دیتے ہیں اور ایسے شخص کے لیے فراغت ہی فراغت ہوتی ہے۔ مجھے بھی ایسی ہی فراغت مل گئی تو میں پریشان ہو گیا کیونکہ فراغت مجھے راس نہیں آئی۔ جس شخص نے اتنی بھرپور زندگی گزاری ہو وہ فارغ کیسے رہ سکتا ہے۔ میں نے اس کا حل ڈھونڈ لیا۔ میں پولیس سروس کے دوران شاعری کرتا رہا ہوں اور اب بھی یہ شوق جاری ہے۔ ایک تھانیدار اور شاعری کچھ عجیب اور ناقابل یقین سا لگتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے۔ میں نے اتنے برسوں میں جو شاعری کی تھی اس کا مواد اکٹھا کیا تو اچھا خاصا ڈھیر لگ گیا۔ میرا پہلا مجموعہ ـــ ''اندازِ جنوں'' ـــ کے نام سے چھپ چکا ہے اور دوسرا ''ریزۂ الماس'' کے نام سے۔

عنایت اللہ مرحوم کا میں بڑا مداح ہوں۔ انہوں نے میری فراغت کو دیکھتے ہوئے مجھے تفتیشی کہانیاں لکھنے کی طرف راغب کیا۔ اب سوچتا ہوں جب تک زندہ ہوں مرحوم کی خواہش پر لکھتا رہوں گا۔

ایک کیس کی تفتیش پیش کر رہا ہوں۔ یہ وسطی پنجاب کے علاقے کے چوہدریوں کا واقعہ ہے۔ اس کی تفصیلات میرے ذہن میں محفوظ ہیں حالانکہ اس واقعہ کو 40 سال سے زائد عرصہ گزر

چکا ہے۔ میں ان دنوں تھانیدار تھا۔ ان وقتوں میں اندھے اور پیچیدہ قتل بہت کم ہوتے تھے۔ اگر کبھی کوئی ایسی واردات ہو جاتی تو پولیس سخت محنت کرتی تھی اور تھانیدار جان لڑا دیتے تھے۔ بعض اوقات تو کئی کئی سال پرانے کیسوں کا سراغ بھی مل جاتا تھا۔ ویسے ان وقتوں میں اور آج کے حالات میں بڑا فرق بھی ہے۔

اب تو قتل و غارت کی اس قدر بہتات ہے کہ انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی اور نہ کوئی پُرسان حال ہے کہ کس نے کس کو اور کیوں قتل کیا ہے۔ آج کل قتل کرنے کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں، بس اسلحہ ہونا ضروری ہے۔ چوریاں، ڈکیتیاں روزمرہ کا معمول ہے۔ آبادی بے تحاشا بڑھ گئی ہے۔ افغان مہاجرین کی آمد سے ایک دوسرے کی شناخت بھی ختم ہو گئی ہے۔ پولیس بے بسی اور ناکامی کی تصویر بن کر رہ گئی ہے۔

یہ رنگپورہ کا واقعہ ہے۔ وہاں کا چوہدری خاندان خاصاً خوشحال تھا اس کے علاوہ وہاں ارائیں، گوجر، کھوکھر، اعوان، رانجھے، راجپوت اور گوندل برادری کے لوگ آباد تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی ذاتوں کے لوگ تھے۔ یہ لوگ برادری سسٹم کے بڑے پابند تھے اور برادری سے باہر شادی بیاہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی اگر کسی کے ساتھ دشمنی چل پڑتی تھی تو نسل در نسل چلتی تھی۔ دیہاتی زندگی دیکھنے میں جتنی سادہ اور آسان نظر آتی ہے اندر سے اتنی ہی پُر پیچ بھی ہے۔

رنگپورہ کے بڑے چوہدری کے بیٹے چوہدری نثار نے اس زمانے میں نائب تحصیلداری کا امتحان پاس کر لیا اور نائب تحصیلدار لگ گیا۔ ان وقتوں میں نائب تحصیلدار ہونا بڑے اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔ چوہدری نثار علی پور میں تعینات ہوا۔ میں بھی ان دنوں علی پور تھانے میں تعینات تھا۔ چوہدری نثار سے میرا پہلے بھی میل جول تھا لیکن ایک ہی جگہ تعیناتی کے بعد ہمارے تعلقات مزید اچھے اور بے تکلفی والے ہو گئے۔

چوہدری نثار کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ یہ اس کے تحصیلدار بننے سے پہلے کا واقعہ تھا۔ اس کی تفصیلات چوہدری نثار نے مجھے سنائی تھیں جو میں مختصراً آپ کو سنا دیتا ہوں۔ چوہدری نثار کی ماں جہاں بی بی نے چوہدری نثار کا رشتہ اپنی سگی بہن رحمت بی بی کی بیٹی کے ساتھ چھوٹی عمر میں ہی طے کر رکھا تھا۔ اس لڑکی کا نام ناز تھا۔ ناز اونچے قد کی خوش شکل لڑکی تھی اور وہ چوہدری نثار کو پسند بھی کرتی تھی۔

ناز کی ایک سہیلی اختری بیگم تھی۔ اس کا ناز کے گھر بہت آنا جانا تھا۔ اختری بیگم ناز سے

بہت زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کا تعلق بھی چوہدری خاندان سے تھا وہ غریب لوگ تھے۔ اللہ نے ان کو دولت تو نہیں دی تھی لیکن اختری بیگم کو حسن کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ چوہدری نثار اکثر اپنی خالہ کے گھر یعنی ناز کے ہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ وہیں اس کی ملاقات اختری بیگم سے ہوئی اور وہ پہلی ملاقات میں ہی دل ہار بیٹھا۔ وہ اختری بیگم کی زلفوں کا ایسا اسیر ہوا کہ ناز کو نظر انداز کرنے لگا۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ اس نے ناز کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اختری بیگم سے شادی کی خواہش ظاہر کر دی۔

چوہدری نثار کی اس بات سے بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اگر چوہدری نثار کی ماں ناز کا رشتہ چھوڑ دیتی تو اس کی بہن ناراض ہو جاتی۔ ماں نے بیٹے کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ کسی صورت نہ مانا اور ماں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ماں کے بعد چوہدری نثار نے اپنے باپ کو بھی اس رشتے پر قائل کر لیا۔ اس طرح چوہدری نثار کا رشتہ اختری بیگم سے طے پا گیا۔ پھر شادی بھی ہو گئی۔ یوں ایک غریب لڑکی چوہدری نثار کی بیوی بن کر بڑے گھر میں آ گئی۔

دوسری طرف چوہدری نثار کی خالہ رحمت نے سر توڑ کوشش کر ڈالی کہ یہ رشتہ قائم رہے لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ ناز بجھ کر رہ گئی اور اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ وہ ساری عمر شادی نہیں کرے گی۔ ناز نے اپنی اتنی بڑی حویلی میں بالکل الگ تھلگ رہائش اختیار کر لی۔ کچھ عرصے بعد اس کے دونوں بھائیوں کی شادی ہو گئی اور گھر میں دو بھابیاں آ گئیں۔ ناز کی اور بھابیوں کی آپس میں نہ بن سکی اور چخ چخ رہنے لگی۔ بھائیوں نے اپنی بیویوں کا ساتھ دیا۔

ناز نے حویلی کے اس الگ تھلگ حصے میں اپنا باورچی خانہ بھی الگ کر لیا اور بالکل ہی دوسروں سے الگ رہنے لگی۔ اس دوران اختری بیگم سے اس کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا اور نہ ہی اس نے اپنے رویئے سے ظاہر ہونے دیا کہ وہ اختری بیگم سے ناراض ہے۔ اختری بیگم جب بھی اپنے ماں باپ سے ملنے آتی تو ناز کے پاس ضرور آتی تھی اور اس کے پاس ایک دو دن رہتی بھی تھی۔

اس دوران اختری بیگم کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی، پھر دو سال بعد ایک بیٹا پیدا ہوا۔ چوہدری نثار کو ان دونوں کے ملنے جلنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں بڑی گہری سہیلیاں ہیں اور ان میں بہت پیار ہے۔ چوہدری نثار اور اختری بیگم کی شادی کو پانچ سال گزر گئے تھے۔ اس وقت ان کی بچی جس کا نام انوری تھا تین سال کی تھی جب اختری بیگم ناز کے پاس آ کر

ٹھہری۔ چوہدری نثار اسے چھوڑ گیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ دو دنوں بعد وہ آ جائے۔

دو کی بجائے چار دن گزر گئے مگر اختری بیگم گھر نہ پہنچی۔ چوہدری نثار پریشان ہو کر علی پور سے چھٹی لے کر رنگپورہ اسے لینے کے لیے ناز کے پاس آیا۔ اس وقت تک چوہدری نثار نائب تحصیلدار بن چکا تھا۔ اس نے ناز سے اختری بیگم کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ تو دو دنوں سے غائب ہے۔

''میں اسے یہاں چھوڑ کر گیا تھا''۔۔۔ چوہدری نثار نے ناز سے پوچھا۔۔۔ ''وہ گھر بھی نہیں پہنچی تو کہاں چلی گئی؟''

''مجھے کیا پتہ وہ کہاں گئی ہے''۔۔۔ ناز نے رکھائی سے کہا۔۔۔ ''مجھے بتا کر نہیں گئی''۔

''وہ تمہاری عزیز سہیلی ہے''۔۔۔ چوہدری نثار نے کہا۔۔۔ ''تمہیں ضرور پتہ ہو گا کہ وہ کہاں ہے''۔

''وہ میری سہیلی ضرور تھی''۔۔۔ ناز نے کہا۔۔۔ ''مجھے پتہ لگا تھا کہ اس کی کسی کے ساتھ آشنائی ہے۔ میرے خیال میں وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر باہر نکلی اور اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہو گی۔ وہ اپنی بچی کو یہیں چھوڑ گئی ہے''۔

یہ سن کر چوہدری نثار بڑا پریشان ہو گیا۔ اس نے بچی کو ناز کے پاس ہی چھوڑا اور خود اختری بیگم اور اپنے بیٹے کو تلاش کرنے لگا۔ اس نے ہر طرف اپنے مزارعے دوڑائے مگر کہیں سے کوئی اطلاع نہ ملی۔ یہ بات ہر طرف پھیل گئی کہ چوہدری نثار کی بیوی بیٹے کو لے کر کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اس سے چوہدریوں کی بدنامی ہونے لگی۔

چوہدری نثار نے تھانے میں رپورٹ بھی درج کرا دی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ ناز نے تھانیدار کو بھی یہی بیان دیا تھا کہ اختری بیگم کی کسی کے ساتھ آشنائی تھی اور اسی کے ساتھ وہ بھاگ گئی ہو گی۔ گاؤں کے لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔

چوہدری نثار نے واپس اپنی ڈیوٹی پر آنا تھا۔ اس دوران اس کی بیٹی ناز کے ساتھ گھل مل گئی تھی، اس لیے گھر والوں کے کہنے پر وہ اسے ناز کے پاس چھوڑ آیا۔

تین مہینے گزر گئے مگر اختری بیگم کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اب ناز کی ماں نے میدان صاف دیکھا تو اپنی بہن سے بات چلائی کہ چوہدری نثار ناز بی بی سے شادی کر لے۔ اس نے اپنی بہن کے آگے رو رو کر کہا کہ ناز کہیں بھی شادی کرنے پر تیار نہیں ہے لیکن نثار سے شادی کرنے پر آمادہ ہو

جائے گی۔ چوہدری نثار کی ماں اپنی بہن کی بات ٹال نہ سکی اور بیٹے سے پوچھ کر ہاں کر دی۔ اس طرح چوہدری نثار اور ناز کی شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد چوہدری نثار اپنی نئی بیوی اور بیٹی کو لے کر علی پور آ گیا۔ اس طرح چوہدری نثار کی سابقہ منگیتر اس کی بیوی بن گئی۔

دوسری شادی کے کچھ دنوں بعد ایک دن چوہدری نثار نے میرے ساتھ اپنی سابقہ گمشدہ بیوی اختری بیگم کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ میں نے شروع سے آخر تک ساری بات سنانے کو کہا۔ اس نے مجھے ہر بات اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیل سنا دی۔ میں ساری تفصیل سن کر اس نتیجے پر پہنچا کہ اختری بیگم کی گمشدگی مشکوک ہے۔

''برا نہ ماننا چوہدری!'' ــــ میں نے اس سے کہا ــــ ''اس سارے معاملے میں تمہاری دوسری بیوی ناز کا کردار مشکوک نظر آتا ہے''۔

''شک تو مجھے بھی ہے'' ــــ چوہدری نے جواب دیا ــــ ''مجھے لگتا ہے کہ ناز کچھ نہ کچھ چھپا رہی ہے لیکن میں بغیر کسی ثبوت کے کچھ کہہ نہیں سکتا''۔

''خود ہی غور کرو چوہدری!'' ــــ میں نے کہا ــــ ''اختری بیگم کا تعلق غریب گھرانے سے ہے۔ اس نے تمہارے ساتھ محبت کی شادی کی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ عیش و آرام اور تم جیسے خوبرو جوان کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ بھاگ جائے!...... یہ بھی ناقابلِ فہم بات ہے کہ وہ بچہ اپنے ساتھ لے گئی اور بچی کو چھوڑ گئی''۔

چوہدری نثار نے مجھے بتایا کہ وہ مجبور ہے کہ کھل کر بات نہیں کر سکتا کیونکہ برادری کا مسئلہ ہے۔ میں نے سارے حالات پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اختری بیگم اور بچے کو قتل کر دیا گیا ہے لیکن ایک بات مجھے الجھن میں ڈال رہی تھی اور وہ یہ کہ تین سالہ بچی کیسے بچ گئی۔ میں اس معاملے پر جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا چلا جاتا۔ میں جتنا بھی سوچتا، گھوم پھر کر میری سوئی ناز پر آ کر اٹک جاتی۔ تمام حالات و واقعات اسے مشتبہ ثابت کر رہے تھے۔

میں قیاس کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ جب کوئی بات میرے سامنے واضح نہ ہوتی تو میں یہی کرتا تھا اور اس کے نتیجے میں کوئی نہ کوئی راستہ سوجھ جاتا تھا۔ سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اختری بیگم اور بچے کی گمشدگی کا سراغ ناز اور تین سالہ بچی کے ذریعے سے ہی ملے گا۔

میں نے ایک سکیم سوچ لی اور چوہدری نثار کو ساری بات سمجھائی۔ چوہدری اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے ایک تجربہ کار اور قابلِ اعتبار عورت کو بلایا جو اکثر میرے کام آتی رہتی

تھی۔ وہ ایک قسم کی تھانے کی مخبر بھی تھی۔ بڑی ہی چالاک اور ہوشیار عورت تھی۔ ایسی عورتیں تھانے والوں کے بہت کام آتی ہیں اور گھروں کے اندر سے بھی راز کی باتیں نکال لاتی ہیں۔ سکیم کے مطابق چوہدری نثار نے اس عورت کو بطور ملازمہ اپنے گھر رکھنا تھا۔ آگے اس عورت کا کام تھا کہ وہ کام کی باتیں معلوم کرتی۔

تھوڑی دیر بعد وہ عورت آ گئی۔ اس کا نام تو ریشم تھا لیکن وہ ریشو کے نام سے مشہور تھی۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر اچھی طرح سمجھایا کہ اس نے کیا کرنا ہے اور کس طرح ناز کے ساتھ بے تکلفی اور دوستی پیدا کرنی ہے۔ وہ خرانٹ عورت تھی اس لیے وہ میرا مدعا سمجھ گئی اور اسے زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہ پڑی۔ میں نے اس کو صاف بتا دیا تھا کہ مجھے ناز پر شک ہے کہ اس نے اختری بیگم کو غائب کیا ہے یا اس میں کا ہاتھ ضرور ہے۔

ناز پر شک کی وجہ بڑی صاف اور واضح تھی۔ چوہدری نثار اس کی خالہ کا بیٹا تھا اور دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے سے منسوب تھے۔ بڑے ہونے پر ناز اس کو پسند کرنے لگی اور پھر اس کی پسند محبت میں بدل گئی۔ ان کی شادی میں بظاہر کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی لیکن اختری بیگم نے اپنے حسن و جوانی سے چوہدری نثار کا دل موہ لیا اور اس کے پیچھے لگ کر چوہدری نے اپنی بچپن کی منگ چھوڑ کر اختری بیگم کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ ایسی بات تھی جس پر دیہات میں خون خرابہ ہو جاتا ہے اور قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

ان حالات میں ناز کا انتقامی رویہ اپنانا قدرتی بات تھی۔ اس کو ایسا ہی کرنا چاہئے تھا لیکن یہ بات مجھے الجھن میں ڈال رہی تھی کہ اگر ناز نے انتقامی وار کرنا ہی تھا تو فوراً کرتی، اتنا عرصہ انتظار نہ کرتی۔ اس کے برعکس اس نے اختری بیگم سے نہ صرف دوستی برقرار رکھی بلکہ خود کو اس کے بچوں کی خالہ بھی قرار دیتی رہی۔ مجھے واضح طور پر کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی اور میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔

میرے منصوبے کے مطابق چوہدری نثار ریشو کو اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے ریشو کو سمجھا دیا تھا کہ وہ اپنی رپورٹ موقع پا کر چوہدری نثار کو دے دیا کرے اور اگر بہت ہی ضروری ہو تب میرے پاس آئے۔

اگلے روز چوہدری نثار میرے پاس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی ناز ریشو کو بطور ملازمہ گھر میں رکھنے پر تیار نہیں ہو رہی تھی۔ ناز نے کہا تھا کہ میں گھر کے سارے کام خود کر لیتی

ہوں تو ملازمہ کی کیا ضرورت ہے لیکن چوہدری نے اسے یہ کہہ کر قائل کر لیا کہ وہ نائب تحصیلدار کی بیوی ہے اس لیے خود گھر کا کام کرتی اچھی نہیں لگتی۔

پھر چوہدری روزانہ رپورٹ دینے لگا۔ اس نے بتایا کہ ریشو نے ناز پر اپنا اعتماد بٹھا لیا ہے اور بچی بھی اس کے ساتھ مانوس ہوتی جا رہی ہے لیکن پتہ نہیں کیوں ناز اس بات کا بھروسہ نہیں کرتی کہ بچی کو ریشو کے پاس اکیلے چھوڑ دے۔ اس طرح پندرہ بیس دن گزر گئے اور کام کی کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ چوہدری اب اس کھیل سے بیزار ہونے لگا تھا اور اس پر مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔ ناامید تو میں بھی ہو رہا تھا لیکن میں مایوس نہیں تھا۔

"آغا صاحب!"___ ایک روز چوہدری کا صبر جواب دے گیا اور اس نے مجھ سے کہا___ "یہ میرے ساتھ کیا تماشہ ہو رہا ہے۔ ناز میری سگی خالہ کی بیٹی ہے۔ اس وجہ سے میں کھل کر اس پر کوئی الزام بھی نہیں لگا سکتا۔ اختری بیگم اور ناز میں بڑا پیار تھا۔ اسی وجہ سے وہ اس بچی کے ساتھ بہت زیادہ پیار کرتی ہے اور اسے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی...... اب ناز امید سے ہے۔ مجھے بتائیں ان حالات میں، میں کیا کروں؟"

میں چوہدری نثار کی ذہنی حالت سمجھ سکتا تھا۔ اسے اختری بیگم اور اپنا بچہ یاد آتا تھا۔ اسے دونوں سے بڑی محبت تھی۔ اب ناز سے شادی کرنے کے بعد اس کے دل میں ناز کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں کے درمیان جو رنجش تھی وہ شادی کے بعد دور ہو گئی۔ چوہدری نثار ناز کی محبت میں ڈوب کر اختری بیگم اور بچے کو بھول جانا چاہتا تھا لیکن میں نے ناز پر شک کا اظہار کر کے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ اب ناز کو بھی نہیں کھونا چاہتا تھا مگر کھل کر اس بات کا اظہار نہیں کرتا تھا۔

"دیکھو چوہدری!"___ میں نے اس سے کہا___ "مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے بچے اور اختری بیگم کی گمشدگی کے پیچھے ناز کا ہاتھ ہے۔ میں نے جتنا بھی سوچا ہے، گھوم پھر کر شک ناز پر ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ تمہاری بیوی نہ ہوتی تو میں اسے تھانے بلا کر اور ڈرا دھمکا کر اصل بات اگلوا لیتا۔ میں صرف تمہاری وجہ سے یہ طریقہ اختیار کر رہا ہوں۔"

پھر میں نے چوہدری نثار کو تسلی دی کہ جب تک کوئی واضح ثبوت سامنے نہ آ جائے گا میں کوئی ایسا اقدام نہیں کروں گا جس سے اس کی گھریلو زندگی پر کوئی برا اثر پڑے یا اس کے خاندان کی بدنامی کا باعث ہو۔ میں نے چوہدری سے یہ بھی کہا کہ صرف دس بارہ دن اور انتظار کروں گا پھر ریشو کو اس کے گھر سے ہٹا دوں گا اور کوئی اور طریقہ سوچوں گا۔

میں نے چوہدری کو تسلی دلاسہ دے کر رخصت کر دیا لیکن خود سوچ میں پڑ گیا کہ یہ مسئلہ کس طرح حل ہو سکتا ہے۔ میری ساری امیدیں ریشو کے ساتھ وابستہ تھیں۔ مجھے امید تھی کہ وہ ضرور کوئی نہ کوئی کام کی بات معلوم کر لے گی۔ مجھے کسی اشارے یا سراغ کی ضرورت تھی پھر میرے لیے آگے بڑھنا مشکل نہ ہوتا۔

میرے پیش نظر یہی ایک کیس نہیں تھا۔ تھانے میں اور بھی کئی کیس تھے۔ میں ان میں مصروف ہو گیا۔ اسی مصروفیت میں چار دن اور گزر گئے۔ میرے ذہن سے چوہدری نثار بالکل ہی نکل گیا۔ اسی مصروفیت میں تھانے میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے آ کر اطلاع دی کہ ریشو آئی ہے اور اسی وقت مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ ریشو کا نام سن کر ایکدم میرے ذہن میں چوہدری نثار والا کیس تازہ ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور ریشو نے کوئی سراغ یا کام کی بات معلوم کر لی ہو گی تبھی وہ خود آ گئی ہے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ ریشو کو فوراً اندر بھیج دے۔ کانسٹیبل چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ریشو اندر آ گئی۔ جوش سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی اہم اطلاع لے کر آئی ہے۔ میں نے اسے اندر بلا کر بٹھایا۔

"ہاں ریشو!"___ میں نے اس سے پوچھا___ "کیا کر کے آئی ہو؟"

"کام ہو گیا حضور!"___ ریشو نے غلامانہ انداز سے کہا___ "آپ سنیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔"

"صرف کام کی بات بتاؤ ریشو!"___ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا___ "میں بہت مصروف ہوں، اس لیے غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرو۔"

"آپ اپنے کوارٹر میں پہنچیں"___ ریشو نے کہا___ "میں چوہدری کی بچی کو لے کر وہیں آ رہی ہوں۔ ساری تفصیل وہیں آپ کو سناؤں گی۔"

میں نے اسے کہا کہ وہ فوراً کوارٹر میں آ جائے، میں آ رہا ہوں۔ ریشو کو بھیج کر میں اسی وقت تھانے سے ذرا فاصلے پر واقع اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ مجھے وہاں پہنچ کر زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور ریشو آ گئی اس نے گود میں چوہدری نثار کی بچی اٹھا رکھی تھی۔ بچی نے کپڑے کا بنا ہوا ایک گڈا پکڑا ہوا تھا۔ ایسے گڑیاں اور گڈے عورتیں گھروں میں خود بنا لیتی ہیں۔ ان کے اندر روئی بھر کے اوپر رنگین دھاگوں سے چہرے کے نقوش کاڑھ لیتی ہیں۔ اس بچی کا نام انوری تھا۔

ریشو نے بچی کو ایک چارپائی پر بٹھا دیا۔ وہ کپڑے سے بنے ہوئے گڈے سے کھیلنے لگی۔

بچی پریشان نہیں لگ رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ریشو کے ساتھ اچھی طرح مانوس ہوگئی ہے۔ ریشو نے مجھے جو بات بتائی وہ سن کر مجھے اطمینان ہوگیا کہ میرا اندازہ درست تھا۔ ریشو نے ہر بات اور دن بہ دن کی رپورٹ بڑی تفصیل سے سنائی تھی۔ میں آپ کو یہ ساری بات اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔

ریشو چوہدری کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے گئی تو شروع شروع میں ناز اس سے کھچی کھچی رہی لیکن پھر ریشو نے اس پر اپنا اعتماد بٹھا لیا۔ بچی کے معاملے میں وہ بڑی حساس تھی اور ایک لمحہ بھی اسے اکیلا ریشو کے پاس نہ چھوڑتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ ریشو پر اعتماد کرنے لگی لیکن پھر بھی وہ بچی کو ریشو کے پاس چھوڑ کر زیادہ دیر کے لیے اِدھر اُدھر نہیں ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ ریشو کو مشکوک سا لگتا تھا اس لیے وہ ہر وقت بچی پر نگاہ رکھنے لگی۔

جب قدرت کی طرف سے کسی کام کو ہونا ہوتا ہے تو وہ اس کے اسباب بھی خود ہی پیدا کر دیتی ہے۔ ناز کے ساتھ والے گھر میں قرآن پاک کے ختم کا اہتمام تھا۔ ناز کا وہاں جانا ضروری تھا۔ اس نے بچی کو ریشو کے حوالے کیا اور تاکید کی کہ اس کا بہت خیال رکھے اور باہر نہ نکلنے دے۔ ناز ہمسائے کے گھر چلی گئی۔ بچی اس وقت کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ اس کے پاس دو تین کھلونے تھے جن میں کپڑے کا ایک گڈا بھی تھا۔ اس گڈے کا نام بچی نے منا رکھا ہوا تھا اور وہ زیادہ تر اسی کے ساتھ کھیلتی تھی اور اپنی معصوم زبان سے اس گڈے کے ساتھ باتیں بھی کرتی رہتی تھی۔

اس وقت بھی بچی گڈے کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ ریشو اس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

''مت رو منے!'' ___ بچی گڈے سے باتیں کرتی ہوئی کہہ رہی تھی ___ ''ورنہ خالہ تمہیں جان سے مار دے گی''۔

یہ سن کر ریشو چونکی اور اس نے کرید کرید کر بچی سے اختری بیگم اور بچے کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا۔ بچی نے ریشو کو بتایا کہ امی اور منے کو خالہ نے مار دیا ہے۔ خالہ بڑی ظالم ہے۔ پھر بچی نے سہم کر رونا شروع کر دیا۔ ریشو نے بچی کو پیار سے بہلایا اور گود میں اٹھا لیا اور چوہدری نثار کے چپراسی سے کہا کہ وہ بچی کو میلہ دکھانے کے لیے لے جا رہی ہے۔ یہ چپراسی گھر کے کام کاج کے لیے وہیں رہتا تھا۔

ریشو بچی کو لے کر باہر آ گئی اور میلے میں جانے کی بجائے اپنے گھر لے گئی۔ اسی دوران اس نے بچی سے مزید معلومات لیں۔ اس نے بتایا کہ بچی اس کھلونے کو، جس کا نام اس نے منا رکھا ہوا تھا، رات اپنے ساتھ سلاتی تھی۔ اس کے گمشدہ بھائی کا پیار کا نام منا تھا۔

میں نے فوراً ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ وہ چوہدری نثار کے دفتر جا کر اسے بلا لائے۔ چوہدری نثار جلدی آ گیا۔ میں نے اسے تمام تفصیل سنائی اور اسے کہا کہ اب اس کی نئی بیگم ناز کی گرفتاری ضروری ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ فی الحال بچی ریشو کے پاس رہے گی۔

میری اب بات سن کر چوہدری نثار گھبرا گیا اور اول فول بولنے لگا۔ میں نے اسے حوصلہ دے کر کہا کہ وہ مرد بنے اور میرے ساتھ تعاون کرے۔ میں چوہدری نثار کو ساتھ لے کر اس گھر چلا گیا۔ چوہدری مجھے سیدھا اندر ہی لے گیا۔ ہم گھر میں داخل ہوئے تو ناز کو پریشانی کی حالت میں دیکھا۔ اس نے اپنے شوہر کے ساتھ مجھے دیکھا تو اس کا اتنا اچھا رنگ ایک دم اُڑ گیا۔ میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر اس پر سیدھا حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

''آپ سے غلطی ہوگئی ہے بھابی!'' ___ میں نے ناز سے کہا ___ ''جو غلطی ہوگئی سو ہو گئی، اب اس کا کوئی حل سوچا جائے۔ جو کچھ بھی ہوا، آپ سچی بات بتا دیں تاکہ ہم کوئی راستہ نکال سکیں''۔

''یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں'' ___ ناز نے کہا ___ ''میں انوری (بچی) کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ ریشو اسے لے کر پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے''۔

''بچی ہمارے پاس تھانے میں محفوظ ہے'' ___ میں نے کہا ___ ''اس نے سب کچھ بتا دیا ہے...... بہتر ہوگا کہ آپ ساری بات خود ہی سنا دیں''

''آپ کس بنیاد پر مجھ پر الزام لگا رہے ہیں؟'' ___ ناز نے گھبرا کر کہا ___ ''ایک معصوم بچی کے کہنے پر!'' ___ پھر خود ہی راز کی بات کہہ دی ___ ''بھلا میں اپنی جان سے زیادہ عزیز سہیلی اور معصوم بھتیجے کو کیوں قتل کرتی؟ اگر قتل کرتی تو یہ انوری کیوں بچ جاتی...... ہمارے کسی شریک نے بچی کو غلط پٹی پڑھا دی ہے''۔

غور کریں، جب قدرت کا نادیدہ ہاتھ حرکت میں آتا ہے تو انسان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ میں نے ناز کو یہ بالکل نہیں کہا تھا کہ بچی نے کیا بتایا ہے۔ وہ مجرم تھی اور قتل جیسا بھیانک جرم کر چکی تھی۔ خون بڑے بڑے مجرموں کو بھی ہضم نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک گھریلو عورت تھی جو انتقام کے

جوش میں جرم کر بیٹھی تھی۔ میں تو اسے بھی اس کا کارنامہ سمجھتا ہوں کہ اتنے دنوں تک اس نے یہ راز اپنے سینے میں دبائے رکھا۔ اب میرے کہے بغیر ہی اس نے اختری بیگم اور بچے کے قتل کا ذکر کر دیا تھا حالانکہ ابھی تک میں نے اپنے منہ سے ایک بار بھی قتل کا لفظ نہیں نکالا تھا۔

"تم خود اپنے الفاظ پر غور کرو ناز!"___ اب میں نے اسے آپ کہنے کا تکلف ختم کرتے ہوئے کہا___ "میں نے تم پر کوئی الزام نہیں لگایا۔ تم نے خود ہی سب کچھ بتا دیا ہے۔ بچی نے ہر بات بتا دی ہے۔ میرے کانسٹیبل رنگپورہ تمہارے گھر چلے گئے ہیں اور جلدی ہی میرے حکم پر سب سے پیچھے واقع سٹور کے کچے فرش کی کھدائی شروع ہو جائے گی...... بہتر ہے خود ہی سارا بیان دے دو تا کہ تمہاری بچت کا کوئی راستہ نکال سکوں"۔

میری بات سن کر ناز نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔ چوہدری نثار میرے پاس ہی کھڑا تھا۔ غصے اور غم سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ ناز کے منہ پر مارا۔ تھپڑ اس قدر زوردار تھا کہ وہ الٹ کر پیچھے کو گری اور اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ غالباً منہ کے اندر سے گوشت پھٹ گیا تھا۔

"یہ مگرمچھ کے آنسو بند کر کتی!"___ چوہدری نے دانت پیس کر کہا___ "میں تجھے جان سے مار دوں گا"۔

یہ کہہ کر چوہدری نے آگے بڑھ کر ناز کی گردن پکڑ کر دبانی شروع کر دیا۔ ناز کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر کو ابل آئے۔ میں نے آگے بڑھ کر بڑی مشکل سے اس کے ہاتھوں سے ناز کی نرم و نازک گردن چھڑائی اور اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

چوہدری کو دوسرے کمرے میں بھیج کر میں ناز کے پاس آ گیا۔ وہ ابھی تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے چوہدری باہر نکلا تھا۔ غالباً اسے چوہدری کی طرف سے اس قسم کے سلوک کی امید نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اگرچہ اس نے بڑا بھیانک جرم کیا تھا لیکن مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ انتقام کی آگ میں جل کر وہ دو جانیں لے چکی تھی، اس بات کا احساس اسے اب ہو رہا تھا کہ وہ کیا کر بیٹھی ہے۔

"سب کچھ مجھے بتا دو ناز!"___ میں نے اس سے کہا___ "میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں کم سے کم سزا ہو"۔

"لیکن میں پوری پوری سزا لوں گی"___ ناز نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا___ "میں اب

زندہ نہیں رہنا چاہتی...... جسے حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کیا وہی اپنا نہ رہا تو جی کر کیا کروں گی...... مجھے سولی چڑھا دو"۔

ناز نے بڑی تفصیل سے بیان دیا۔ درمیان میں، میں ضرورت کے مطابق اس سے سوالات پوچھتا رہا۔ اس دوران وہ کئی بار بے قابو ہو کر روئی تھی۔ اس طرح ڈیڑھ دو گھنٹے میں اس کا بیان مکمل ہوا۔ میں اس کا بیان غیر ضروری تفصیلات حذف کر کے آپ کو سنا دیتا ہوں۔ میں بات وہاں سے شروع کرتا ہوں جہاں چوہدری نثار نے اس سے منگنی ختم کر کے اختری بیگم سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی۔

چوہدری نثار بڑا خوبرو اور وجیہہ جوان تھا۔ ناز اس سے باقاعدہ محبت کرنے لگی تھی۔ پھر چوہدری نے اختری بیگم کو دیکھا تو اس کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ اختری بیگم ناز کے مقابلے میں بہت زیادہ خوبصورت اور پُرکشش تھی۔ اختری کے حسن کے سامنے ناز بجھی بجھی سی نظر آتی تھی۔ چوہدری نثار نے اختری سے شادی کا فیصلہ کر لیا تو ناز پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا۔ پھر اس نے سوچا رونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ چوہدری سے بھی بات کرے گی اور اپنی سہیلی اختری سے بھی۔

چند دنوں بعد ناز کو چوہدری سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے چوہدری کو اختری بیگم سے ہٹانے کی پوری کوشش کر ڈالی لیکن چوہدری پر اختری کے عشق کا بھوت بری طرح سوار تھا۔ ناز نے اس کے آگے ہاتھ بھی جوڑے مگر چوہدری نہ مانا۔ ناز اونچے گھر کی عزت دار لڑکی تھی۔ اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چوہدری کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور اس کی منت سماجت بھی کی تھی لیکن چوہدری کے انکار کے بعد وہ اپنی توہین محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کی انا کو زبردست ٹھیس لگی تھی۔

اس کے بعد اس نے اپنی عزیز سہیلی اختری سے بھی بات کی اور اس سے کہا کہ وہ چوہدری اور اس کے درمیان سے نکل جائے اور شادی سے انکار کر دے۔ اختری نے صاف انکار تو نہ کیا بلکہ یہ کہا کہ چوہدری خود انکار کر دے تو اسے کوئی اعتراض نہیں۔ اختری نے یہ بھی کہا کہ وہ ناز کی خاطر سب کچھ کر سکتی ہے لیکن چوہدری کو انکار نہیں کر سکتی۔ اب بات اس کے بس سے باہر ہو گئی ہے اور وہ دل کے ہاتھوں اور چوہدری کی محبت کے سامنے مجبور ہے۔

چوہدری کے بعد اختری سے بھی انکار سن کر ناز بہت مایوس ہوئی لیکن اس نے اپنے آپ پر

قابو رکھا اور اپنی خاندانی روایات کے پیش نظر خاموش ہی رہی۔ زبان سے تو وہ کچھ نہ بولی لیکن اس کے اندر غم و غصے کے جو طوفان اٹھ رہے تھے وہ کسی کو نظر نہ آ سکے۔ پھر چوہدری اور اختری کی شادی ہوگئی۔ ناز نے اپنے چہرے پر خوش اخلاقی کا خول چڑھا لیا اور اختری کے ساتھ دوستی برقرار رکھی۔ اس نے اختری کو بڑے قیمتی تحفے دیئے اور نقد رقم بھی شادی کی مبارک باد کے ساتھ دی۔

گھر والوں نے ناز کو شادی کے لیے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ شادی نہیں کرے گی اور آئندہ کوئی اسے شادی کے لیے مجبور نہ کرے۔ ماں باپ نے ناز کی طرف سے مایوس ہو کر بیٹوں کی شادیاں کر دیں۔ باپ نے ناز کا غم لگا لیا اور اسی غم سے مر گیا۔ ناز کی اپنی بھابیوں کے ساتھ بن نہ سکی۔ اس میں ناز کے چڑچڑے پن کا بڑا دخل تھا۔ روز روز کی بک بک سے تنگ آ کر ناز حویلی میں ایک دور افتادہ اور بالکل الگ تھلگ حصے میں منتقل ہوگئی اور گھر والوں سے بالکل ہی ناتہ توڑ لیا۔ اس نے کھانا پینا بھی گھر والوں سے الگ کر لیا۔

اس دوران اختری سے اس کی دوستی جاری رہی۔ وہ اختری کو اکثر اپنے پاس ایک دو دنوں کے لیے ٹھہرا بھی لیتی تھی۔ چوہدری نثار اس پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔ جس حصے میں ناز رہتی تھی، اس میں دو کمرے تھے اور سب سے پچھلے حصے میں ایک اسٹور تھا جس کا فرش کچا تھا۔ اس عرصے میں اختری کی بچی تقریباً تین سال کی ہو چکی تھی اور اس کا ایک بیٹا پیدا ہو چکا تھا۔

ناز نے مجھے بیان دیتے ہوئے بتایا کہ کبھی تو وہ انتقام کو بالکل ہی بھول جاتی اور کبھی انتقام کا جذبہ ایسی شدت سے ابھرتا کہ اس پر پاگل پن طاری ہو جاتا۔ اس کیفیت میں اس کا دل چاہتا کہ وہ اختری کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور ہر چیز کو آگ لگا دے۔ جب وہ نارمل ہوتی تو وہ اختری کے بچوں سے پیار سے پیش آتی۔ وہ کہتی تھی کہ یہ میری بھانجی اور بھانجہ ہیں اور میں ان کی خالہ ہوں۔ جب وہ اکیلی ہوتی اور سوچتی کہ اختری نے اس کے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے تو دل ہی دل میں انتقام کے منصوبے بنانے لگتی۔

آخر اس نے اختری سے انتقام لینے کا منصوبہ سوچ لیا۔ اس نے سب سے پیچھے واقع سٹور کے کچے فرش میں ایک گہرا گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔ وہ روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے کام کرتی۔ علاقہ نہری تھا اور زمین نرم تھی۔ اسے زیادہ محنت نہ کرنی پڑی۔ ایک ہفتے کی محنت کے بعد اس نے اچھا خاص گہرا اور چوڑا گڑھا تیار کر لیا۔ گڑھے سے نکلنے والی مٹی وہ سٹور میں گڑھے کے کنارے پر ڈھیر کرتی رہی۔ اس کا رہائشی حصہ اتنا الگ تھلگ تھا کہ کسی کو کھدائی کے متعلق علم نہ ہو سکا۔

گڑھا تیار ہوگیا تو وہ انتقام کے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اختری کو زمین کے تختے سے اٹھا دے گی اور چوہدری کو ایسا زخم لگائے گی کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے۔ انہی دنوں اختری اپنے والدین کے گھر آئی ہوئی تھی۔ جب وہ ناز سے ملنے آئی تو ناز نے اسے مجبور کر کے دو تین دنوں کے لیے اپنے گھر ٹھہرا لیا۔ اختری اپنی موت سے بے خبر ناز کے پھیلائے ہوئے جال میں آ گئی۔ سردیوں کے دن تھے۔ ناز نے اختری کو سٹور کے ساتھ والے کمرے میں سلایا۔

ناز کے گھر والے دوسرے حصے میں سو رہے تھے۔ اختری ناز والے حصے میں بے خبر سو رہی تھی۔ پورا گاؤں میٹھی نیند سو رہا تھا۔ صرف ناز جاگ رہی تھی اور اس کے اندر عورت کا انتقام جاگ رہا تھا۔ جب آدھی رات کا وقت ہوا تو ناز چپکے سے اٹھی اور اس نے تیز دھار ٹوکہ پکڑا اور اختری والے کمرے میں چلی گئی۔ عورت کا انتقام مشہور ہے۔ قتل کو ایک لمحے کا پاگل پن کہا جاتا ہے جو غلط نہیں ہے۔ ناز عورت تھی اور انتقامی جذبے کے ساتھ اس ایک لمحے کے پاگل پن میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے بڑی مہارت سے سوئی ہوئی اختری کی شہ رگ تڑ وار کیا۔ ٹوکہ اتنا تیز اور وار کرنے میں اتنا قہر تھا کہ اختری کی گردن صاف کٹ گئی۔ اس کا جسم تڑپنے لگا۔ اس دوران اختری کی تین سالہ بیٹی انوری جاگ گئی۔ ناز نے انتہائی سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرا وار معصوم بچے پر کیا۔ وہ بے چارہ تڑپے بغیر ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

جب ناز بیان کے اس حصے پر پہنچی تو اس نے چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دیا اور اپنے منہ پر دوہتھڑ مارنے لگی۔ میں نے اسے بالکل نہ روکا۔ جب اس کی جذباتی کیفیت میں کمی ہوئی تو اس نے باقی بیان سنایا۔

بچے کو مارنے کے بعد وہ بچی کی طرف بڑھی۔ اس کے بیان کے مطابق اس وقت وہ ہوش و حواس میں نہیں تھی اور اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ انتقام کے جذبے کے زیر اثر وہ اندھی ہو چکی تھی۔

"مجھے نہ مارو ماسی!" ـــــ اسے بچی کی آواز سنائی دی ـــــ "مجھے نہ مارو...... ماسی، مجھے نہ مارو" ـــــ یہ آوازیں اسے دیوانگی سے نکال کر ہوش و حواس میں لے آئیں۔ اس نے دیکھا کہ تین سالہ بچی ہاتھ جوڑ کر کھڑی اس سے زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

ناز کا اٹھا ہوا ٹوکے والا ہاتھ وہیں رک گیا۔ اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اس نے

بتایا کہ اسے ایسا لگا جیسے کسی اَن دیکھی طاقت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا ہو۔ اس نے بچی کو مارنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے ڈرایا دھمکایا کہ کسی کو بتائے گی تو اسے بھی قتل کر دے گی۔ اس کے بعد اس نے اختری کی لاش گھسیٹ کر پہلے سے تیار گڑھے میں ڈالی پھر اس کے سینے پر معصوم بچے کی لاش کو لٹا دیا اور اس کے اوپر خون آلود بستر ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے اِردگرد سے خون صاف کیا پھر اپنا خون آلود لباس اتارا اور گڑھے میں ڈال دیا۔ سب سے آخر میں اس نے ٹوکہ گڑھے میں پھینکا اور اس کے بعد اس نے گڑھے میں مٹی ڈال کر سطح برابر کر دی اور اچھی طرح صفائی کر دی۔

صبح ہونے کے قریب اس نے سارا کام مکمل کر لیا۔ دن کے دقت اس نے باریک بینی سے جائزہ لیا اور ہر طرح سے مطمئن ہو کر اس نے گاچنی مٹی کا لیپ تیار کر کے سٹور کے فرش کی لپائی کر دی۔ اس قسم کی لپائی ان وقتوں میں عام تھی۔ اس نے سارا کام بڑی صفائی سے کر لیا اور مطمئن ہو گئی۔ یوں دو بے گناہوں کے قتل کا بھید زمین کے اندر دفن ہو گیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس نے چوہدری کو اختری کے متعلق بتایا تھا کہ وہ اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہو گی۔ اس نے چوہدری نثار کو اور پولیس کو بڑے وثوق سے بتایا کہ اختری کے کسی نوجوان کے ساتھ تعلقات تھے اور وہ اکثر اس سے ملنے جاتی تھی۔ بہرحال یہ معاملہ الجھ گیا اور بات واضح نہ ہو سکی۔ ناز اپنی جگہ مطمئن تھی اور اس نے بچی پر بڑی سخت نگرانی رکھی ہوئی تھی اور گاہے گاہے اسے ڈراتی بھی رہتی تھی۔

پھر جب دنیا کے قانون بے بس ہو گئے تو قدرت کا قانون حرکت میں آ گیا اور تین سالہ بچی نے ریشو کے سامنے دوہرے قتل کا راز بے نقاب کر دیا۔ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

بعد میں ناز نے اپنے بیان کے آخر میں کہا کہ اب اسے معلوم ہوا ہے کہ اسے بچی کو قتل کرنے سے روکنے کے لیے جس اَن دیکھے ہاتھ نے روکا تھا وہ قدرت کا ہاتھ تھا۔ قدرت نے بچی کو اسی لیے زندہ رکھا تھا کہ وہ زمین میں دفن بھید کو کھول دے اور گناہگار کو سزا مل سکے۔ ورنہ ناز نے ایسی مہارت اور صفائی سے دوہرے قتل کی واردات کی تھی اور لاشیں آلۂ قتل سمیت ایسی جگہ دبائی تھیں کہ کسی کو علم نہ ہوتا۔ کچھ عرصے بعد لاشیں مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتیں اور زمین کا بھید زمین کے سینے میں ہی غائب ہو جاتا۔

میں نے ناز کو باقاعدہ گرفتار کر لیا اور اپنے عملے کو بلوا لیا۔ پھر میں نے چوہدری نثار، انوری

اور ریشو کو ساتھ لیا اور رنگپورہ جا پہنچا۔ وہاں سے میں نے گاؤں کے دو معززین کو ساتھ لیا اور ناز کے گھر چلے گئے۔ ناز ہمارے آگے آگے تھی۔ جس الگ تھلگ حصے میں وہ رہتی تھی، وہاں جا کر وہ ہمیں پچھلے سٹور میں لے گئی اور اس جگہ کی نشاندہی گواہوں کے سامنے کی جہاں اختری اور بچے کی لاشیں دفن تھیں۔ اس نے بتایا کہ آلۂ قتل ٹوکہ بھی اس جگہ دفن ہے۔

میں نے وہاں سے کھدائی کروائی۔ لاشیں برآمد ہو گئیں۔ اس دوران میں نے ایک کانسٹیبل بھیج کر اختری کے والدین کو بھی بلوا لیا تھا۔ گو لاشیں گلنا شروع ہو گئی تھیں مگر اس کے والدین نے فوراً شناخت کر لیں۔ بچے کی لاش کے پاؤں میں چاندی کا ایک کڑا تھا جو غالباً کسی منت کی وجہ سے پہنایا گیا تھا۔ اختری کے گلے میں سونے کا تعویذ تھا۔ بازوؤں میں سونے کا ایک ایک کڑا اور کانچ کی چوڑیاں تھیں جن میں سے بیشتر ٹوٹ چکی تھیں۔ چوہدری نثار نے بھی فوراً شناخت کی تصدیق کر دی۔

اپنی جوان لڑکی اور اس کے معصوم بچے کی لاشیں دیکھ کر اختری کی ماں کی دھاڑیں نکل گئیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ اختری کا باپ بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور رونے لگا۔ بڑی مشکل سے ان کو باہر بھیجا گیا۔

میں نے شہادت ایکٹ زیر دفعہ 27 لاشیں اپنے قبضے میں لے کر فرد مرتب کی۔ ٹوکے اور خون آلود لباس اور بستر کا الگ پارسل بنا کر سربمہر کیا۔ معززین گواہوں سے برآمدگی پر دستخط کرائے اور ناز کا انگوٹھا لگوایا اور تمام قانونی تقاضے پورے کر لئے۔

اب میں بات مختصر کر کے سنا دیتا ہوں تاکہ دفتری کارروائیوں اور دیگر تفصیلات سے وقت ضائع نہ ہو۔ میں اپنے عملے کے ساتھ لاشیں برآمد کر کے باہر نکلا تو پورا گاؤں مکان کے باہر جمع ہو چکا تھا۔ لوگ کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کر رہے تھے۔ زیادہ تر عورتیں رو رہی تھیں۔

میں نے لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیں اور خود مقدمے کی تیاری میں لگ گیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ گئی۔ اس میں موت کی وجہ تیز دھار آلے کا وار لکھی گئی تھی۔ میں نے ناز کا بیان قلمبند کروایا گیا اور اس نے اقبال جرم کر لیا۔

میں نے بڑی محنت سے مقدمہ تیار کیا اور سیشن کورٹ میں پیش کر دیا۔ مقدمہ بالکل سیدھا اور صاف تھا۔ ناز اپنے اقبالی بیان پر قائم رہی۔ چوہدری نے بھی اس کے خلاف گواہی دی۔ سیشن جج نے ناز کو عمر قید کی سزا سنائی۔ اسے سزائے موت اس لیے نہ دی گئی کہ وہ حاملہ تھی۔

اس سے کچھ عرصہ بعد چوہدری نثار نے تیسری شادی کر لی۔ وہ افسر مال بن گیا تھا۔ بعد میں، میں نے سنا تھا کہ جیل میں ناز کی بیٹی پیدا ہوئی اور وہیں پلی پڑھی۔ رہائی کے بعد ناز اپنی بیٹی کو لے سیدھی چوہدری نثار کے گھر چلی گئی۔ وہ ایک ٹرک ساتھ لے کر گئی تھی۔ اس نے اپنا جہیز کا سارا سامان ٹرک میں لدوایا اور رنگپورہ اپنے گھر لے آئی۔

یہاں دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جب چوہدری نثار کی تیسری بیوی کو پتہ لگا کہ آنے والی ناز ہے تو وہ خوفزدہ ہو کر اوپر والی منزل پر چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ چوہدری کو پتہ لگا تو اس نے ناز کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ اس نے کہا کہ وہ ناز کو طلاق دے چکا ہے اور اب اس خطرناک عورت سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا چاہتا۔

❋ ❋ ❋

کوٹھری میں قتل

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اندرون پنجاب کے ایک علاقے میں بطور افسر انچارج تعینات تھا۔ میرے علاقے میں جو گاؤں آتے ہیں، ان میں سے ایک کا نام سعادت پور تھا۔ ایک دن سعادت پور کا نمبردار تھانے میں آیا۔ اس کے ساتھ ایک جوان آدمی تھا جو لباس اور حلیئے سے کھاتے پیتے گھر لگتا تھا۔ نمبردار سے پتا چلا کہ اس جوان آدمی کا نام سانول ہے اور وہ خوشحال زمیندار ہے۔

میرے پوچھنے پر نمبردار نے بتایا کہ سانول کی گھر والی کل سے لاپتہ ہے۔ تفصیل پوچھنے پر معلوم ہوا کہ لاپتہ ہونے والی لڑکی کی عمر بائیس تیئیس برس ہوگی اور اس کا نام گل بہار تھا لیکن وہ گلو کے نام سے پکاری جاتی تھی۔

''تمہاری گھر والی کل سے لاپتہ ہے'' ــــ میں نے غصے سے کہا ــــ ''اور تم آج اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آئے ہو''۔

''عزت غیرت کا مسئلہ تھا آغا جی!'' ــــ سانول نے شرمندہ سے لہجے میں کہا ــــ ''پہلے ہم اپنے طور پر تلاش کرتے رہے۔ پھر اس کے بعد گلو کے والدین کے گھر سے پتہ کیا۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا بلکہ الٹا میرے اوپر الزام لگا دیا کہ ان کی بیٹی کو میں نے خود غائب کیا ہے''۔

''شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟'' ــــ میں نے پوچھا۔

''صرف تین ماہ ہوئے ہیں سرکار!'' ــــ اس نے کہا۔

''کسی سے دشمنی ہوگی تمہاری؟'' ــــ میں نے کہا۔

''نہیں آغا جی!'' ــــ سانول نے ذرا اکڑ کر کہا ــــ ''آپ کی دعا سے پورے علاقے میں کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ مجھ سے دشمنی رکھ سکے''۔

''کسی قسم کا کوئی شک؟''

"ہاں سرکار!" ـــ اس نے فوراً کہا ـــ "مجھے شک ہے کہ گلو شادی سے پہلے کسی اور کو پسند کرتی تھی اور موقع ملنے پر اس کے ساتھ بھاگ گئی"۔

"اس شک کی کوئی وجہ؟" ـــ میں نے پوچھا۔

"میرا اسرال بہلول پور میں ہے" ـــ سانول نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا ـــ "تین ماہ پہلے میں گلو کو بیاہ کر لایا تھا۔ شادی کے کچھ دنوں بعد بھی وہ چپ چپ اور اداس لگتی تھی۔ کسی نے خاص طور پر توجہ نہ دی کیونکہ اکثر لڑکیاں ماں باپ کا گھر چھوڑنے کے بعد کچھ دن اداس اور خاموش رہتی ہیں۔ اس رویے کو شرم وحیا بھی سمجھا جاتا ہے لیکن جب گلو کی اداسی اور کم سخنی طویل ہوتی گئی تو گاؤں کی عورتیں طرح طرح کی باتیں کرنے لگیں۔ بعض صاف لفظوں میں کہنے لگیں کہ گلو اس شادی سے خوش نہیں لگتی"۔

"گھر سے کوئی رقم وغیرہ غائب ہوئی ہے؟" ـــ میں نے پوچھا۔

"میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا" ـــ سانول نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ـــ "اس کے پاس جتنا زیور تھا اور ریشمی کپڑے جس ٹرنک میں تھے وہ غائب ہے۔ اس کے پیروں میں سونے کی وزنی جھانجر بھی تھی جو میں نے اسے پہنائی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے آشنا سے شادی کے بعد بھی رابطہ رکھا ہوا تھا۔ وہ باقاعدہ پروگرام بنا کر غائب ہوئی ہے"۔

میں نے گلو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر لی اور اسی وقت گمشدہ لڑکی کا حلیہ نوٹ کر کے اشتہار شور وغوغا جاری کر دیئے۔ اس کے بعد میں نے نمبر دار میاں خان اور سانول کو جانے کی اجازت دے دی اور کہا کہ ضرورت پڑنے پر میں ان کو تھانے بلوا لوں گا۔ وہ دونوں چلے گئے تو میں اس کیس پر غور کرنے لگا۔ میں جوں جوں غور کرتا گیا، مجھے صاف نظر آنے لگا کہ یہ عشق ومحبت کا جذباتی ڈرامہ ہے جو گلو نے اپنے آشنا سے مل کر کھیلا ہے۔

میں نے ضروری سمجھا کہ گلو کے والدین سے بھی پوچھ گچھ کر لوں۔ یہی سوچ کر میں نے ایک کانسٹیبل کو بہلول پور بھیجا کہ وہ گلو کے والدین کو تھانے لے آئے۔ کانسٹیبل چلا گیا اور کچھ وقت بعد گلو کے والدین کو ساتھ لے آیا۔ دونوں خاصے گھبرائے ہوئے اور پریشان نظر آ رہے تھے۔ میں نے ان کو تسلی دلاسہ دیا اور آرام سے بٹھایا۔ گلو کی ماں کا نام سرداراں تھا اور باپ کا کرماجٹ۔

میں نے ان سے ان کی بیٹی گلو کی گمشدگی کے بارے میں کچھ باتیں کیں اور پھر انہیں بتایا کہ گلو کے خاوند سانول نے یہ الزام لگایا ہے کہ وہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور اس

کے شادی سے پہلے ہی تعلقات تھے۔

"یہ الزام غلط ہے" ـــ گلو کی ماں نے کہا ـــ "ہماری لڑکی کو سانول نے خود کہیں غائب کرا دیا ہے۔ گلو زبان کی ذرا تیز تھی اور ان لوگوں کے گھر میں معمولی معمولی باتوں پر بیویوں کو بے رحمی سے مارنے کا رواج ہے۔ ہو سکتا ہے گلو کو کوئی مہلک چوٹ لگ گئی ہو جو جان لیوا ثابت ہوئی ہو۔ سانول نے میری بیٹی کو کہیں دبا دیا ہو"۔

مجھے یہ سن کر حیرانی ہوئی کہ گلو کی ماں کہہ رہی تھی کہ گلو زبان کی ذرا تیز تھی جبکہ اس کا خاوند سانول مجھے بتا گیا تھا کہ وہ خاموش رہتی تھی۔ میں نے گلو کے والدین سے اپنے مطلب کی کچھ اور باتیں پوچھیں اور انہیں یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ وہ اپنے طور پر گلو کا سراغ لگانے کی کوشش کریں اور جونہی کوئی ایسی بات معلوم ہو جو ان کی بیٹی گلو کی بازیابی میں مدد دے سکے، فوراً مجھے اطلاع دیں۔ میں نے انہیں خوب تسلی دے کر بھیج دیا۔

میرا ہیڈ کانسٹیبل سعد اللہ بڑا تجربہ کار آدمی تھا۔ وہ تفتیشی معاملات کی خاصی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ اپنے طور پر اس بات کا سراغ لگانے کی کوشش کرے۔ معاملہ چونکہ خاصا سنگین تھا، اس لیے میں نے اپنے اے ایس آئی چوہدری کرم الٰہی کو بھی ضروری ہدایات دے کر اس کام پر لگا دیا کہ وہ اپنے مخبروں کا جال بچھا دے۔ یوں میں نے سعادت پور اور بہلول پور کے درمیان جگہ جگہ آنکھوں اور کانوں کا جال بچھا دیا۔

میں نے خود بھی دونوں علاقوں میں جا کر سراغ لینے کی کوشش کی لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ یہ لوگ زمیندار تھے اور بااثر بھی تھے۔ لوگ ان کے متعلق کوئی بات منہ سے نکالتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اس علاقے میں یہ لوگ "بالیکے" کے نام سے مشہور تھے۔

ایک دن گزر گیا تھا اور دوسرے دن کے بارہ بجے تک میری تفتیش ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی تھی۔ میں نے جو مخبر بہلول پور میں چھوڑ رکھے تھے، ان سے کہا تھا کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ گمشدہ گلو کے وہاں کے کسی نوجوان سے تعلقات تھے۔ اگر کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے تو اس نوجوان کو تھانے لے آئیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو چھپی نہیں رہ سکے گی۔ خاص طور پر کسی گاؤں میں ایسی باتیں بالکل نہیں چھپائی جا سکتیں۔

تقریباً دو بجے کا وقت ہو گا جب بہلول پور سے ایک مخبر آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جو شکل وصورت سے بڑی گھاگ نظر آ رہی تھی۔ اس کی عمر یہی کوئی تیس بتیس سال کے لگ

بھاگ ہوگی۔ مخبر نے مجھے بتایا کہ یہ عورت گلو کے والدین کے گھر صفائی اور برتن مانجھنے کا کام کرتی ہے۔

میری مخبر نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس عورت کے ساتھ دوستی پیدا کر لی تھی اور اس سے اپنے کام کی بات اگلوالی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس عورت نے بتایا کہ گلو کے ایک نوجوان کے ساتھ تعلقات تھے اور یہ عشق و محبت والا معاملہ تھا۔ یہ معاملہ اتنی راز داری سے چل رہا تھا کہ اس عورت کے سوا کسی کو اس کی خبر نہیں تھی۔ ان کی ملاقاتیں اس عورت کے ذریعے اس کے گھر میں ہوتی تھیں۔ وہ بڑی راز داری سے اپنے گھر میں ان کی ملاقاتیں کراتی تھی اور اس کا اسے گلو سے اچھا خاص معاوضہ ملتا تھا۔

اس عورت نے گلو کے عاشق کا نام شمس بتایا۔ میں نے اس سے اپنے مطلب کی کچھ اور باتیں پوچھ کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ جانے سے پہلے اس عورت نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں نے یہ باتیں آپ کو بتائی ہیں۔ میں نے اسے تسلی دے کر بھیج دیا۔

''شمس کہاں ہے؟''ـــــ عورت کے جانے کے بعد میں نے اپنے مخبر سے پوچھا اور کہاـــــ ''اسے ساتھ لے کر کیوں نہیں آئے؟''

''شمس گاؤں میں نہیں ہے''ـــــ مخبر نے کہاـــــ ''وہ اسی دن سے غائب ہے جس دن گلو لاپتہ ہوئی ہے۔ اس کے گھر والوں کو بھی نہیں پتہ کہ وہ کہاں ہے''۔

یہ سن کر میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ گلو اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ نکل گئی ہے۔ میں نے اپنے مخبر سے کہا کہ وہ بہلول پور میں ہی رہے اور اپنی آنکھیں کھلی رکھے۔ شمس کے گھر پر خاص نظر رکھے۔ جونہی وہ نظر آئے فوراً تھانے اطلاع کر دے۔

مخبر چلا گیا۔ میں اس کیس پر غور کرنے لگا۔ اب میری تفتیش کا سارا دار و مدار مخبروں کی کارگزاری اور اشتہار شور و غوغا پر تھا۔ مخبر شمس اور گلو کا سراغ لگا لیتے یا اشتہار شور و غوغا کے نتیجے میں کسی اور علاقے کے تھانے سے ان دونوں کے بارے میں کوئی اطلاع آ جاتی۔ ایسی ہی کسی اطلاع کے انتظار میں دوسرا دن بھی گزر گیا۔

اور پھر تیسرے دن اطلاع آ گئی مگر یہ بڑی عجیب و غریب اطلاع تھی۔ دوپہر کا وقت تھا اور میں تھانے میں بیٹھا ایک لڑائی جھگڑے کے معاملے کو نمٹا رہا تھا کہ قریبی گاؤں دتووال کا نمبردار سارو خان آ گیا۔

اس کے ساتھ دو نوجوان تھے جن کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ وہ تھانے کے ماحول سے خاصے خوفزدہ دکھائی دے رہے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ انہوں نے مل کر ایک جستی ٹرنک اٹھا رکھا تھا۔ ٹرنک کو تالا نہیں لگا تھا۔ نمبردار کے کہنے پر انہوں نے وہ ٹرنک نیچے رکھ دیا اور بازو ہلا ہلا کر تھکاوٹ اتارنے لگے۔

میں نے نمبردار سے پوچھا کہ یہ دونوں کون ہیں اور اس ٹرنک میں کیا ہے۔ نمبردار نے بتایا کہ یہ دونوں بھائی ہیں۔ بڑے کا نام روشن اور چھوٹے کا زین ہے۔ باقی بات یہ خود سنائیں گے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے دونوں بھائیوں کو دیکھا تو بڑے بھائی روشن نے بولنا شروع کر دیا جبکہ چھوٹا خاموش ہی رہا۔ اس نے جو بات سنائی وہ میں مختصراً آپ کو سنا دیتا ہوں۔

یہ دونوں بھائی دتووال کے رہنے والے تھے۔ روشن شادی شدہ تھا۔ دتووال خاص بڑا گاؤں تھا اور وہاں مختلف اشیاء کی دکانیں بہت زیادہ تھیں اور لوگوں کو خریداری میں بڑی سہولت رہتی تھی۔ اردگرد کے دیہات سے لوگ خریداری کے لیے دتووال جاتے تھے۔

گزشتہ روز جب روشن اور زین گھر میں نہیں تھے، ایک مرد اور دو عورتیں ان کے گھر آئے۔ گھر میں صرف ان کی والدہ اور روشن کی بیوی تھی۔ عورتوں نے پینے کے لیے پانی مانگا تو روشن کی والدہ نے دیہات کے رواج کے مطابق لسی سے ان کی تواضع کی۔ ان لوگوں کے پاس ایک نیا جستی ٹرنک تھا جو انہوں نے باہر رکھا ہوا تھا۔ مرد کو گھر کے اندر نہیں بلایا گیا اور وہ باہر ہی رہا۔

دونوں عورتوں نے بتایا کہ وہ شادی کا سامان خریدنے کے لیے دتووال آئے ہیں۔ اس ٹرنک کی وجہ سے خریداری میں بڑی دقت ہو رہی ہے۔ ایک عورت نے جو عمر میں بڑی تھی، روشن کی ماں سے کہا کہ وہ ان کا ٹرنک کچھ دیر کے لیے اپنے گھر رکھ لیں تو وہ خریداری کے بعد اپنا ٹرنک لے جائیں گے۔ دونوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس گاؤں سے آئی ہیں نہ روشن کی ماں نے اس سے پوچھا۔ انہوں نے ٹرنک امانت کے طور پر رکھ لیا۔

دونوں عورتیں مرد کے ساتھ چلی گئیں۔ یہ صبح کی بات تھی اور پورا دن گزر گیا مگر وہ لوگ ٹرنک لینے نہیں آئے۔ پھر شام کا اندھیرا پھیلنے لگا مگر پھر بھی ٹرنک کے مالک نہیں آئے۔ روشن اور زین شام کو گھر آئے تو ان کی ماں نے انہیں ٹرنک کے متعلق بتایا کہ دو عورتیں صبح یہ صندوق رکھ گئی تھیں اور اب رات ہونے پر بھی واپس لینے نہیں آئیں۔

یہ سن کر بڑے بھائی روشن کا ماتھا ٹھنکا اور وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے فوراً بیٹھک میں پڑا

ٹرنک دیکھا۔ اس نے قریب جا کر غور سے ٹرنک کا معائنہ کیا تو اسے کچھ عجیب سی بدبو کا احساس ہوا۔ ٹرنک کے کنڈے میں تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ اسے کچھ شک گزرا تو اس نے ٹرنک کھول لیا۔

ٹرنک کا کھلنا تھا کہ زبردست بدبو کا ایک بھبکا ان کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ ٹرنک کے اندر ایک عورت کی لاش مڑی تڑی ٹھنسی ہوئی تھی۔ سب گھر والوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ان کی ماں اور روشن کی بیوی حسناں تو تھر تھر کانپنے لگیں۔

جوں توں کر کے خوف کے عالم میں ساری رات گزاری اور صبح ہوتے ہی نمبردار کو اطلاع کی۔ نمبردار نے خود جا کر ٹرنک میں پڑی لاش کو دیکھا اور دونوں بھائیوں کو ٹرنک سمیت لے کر تھانے آ گیا۔

میں نے ٹرنک کو کھلوایا۔ ٹرنک میں ایک نہایت خوبرو لڑکی کی لاش پڑی تھی۔ لاش کے جسم پر پورے کپڑے تھے جو خاصے مہنگے تھے۔ میں نے معائنے کے لیے لاش ٹرنک سے باہر نکالی۔ یہ ایک بائیس تیئس سال کی خوبرو لڑکی تھی۔ قد درمیانہ، رنگ گورا اور گھنے سیاہ بال خاصے لمبے تھے۔ اس نے پھولدار ریشمی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں جوتی نہیں تھی۔

مجھے لاش کے بدن پر ایک ایسی چیز نظر آئی جس نے مجھے چونکا دیا۔ یہ سونے کی ایک جھانجر یا پازیب تھی جو مقتولہ کی بائیں ٹانگ میں پڑی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً گمشدہ گلو کے خاوند سانول کی یہ بات آ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو سونے کی ایک وزنی جھانجر لے کر دی تھی۔ اب اس لڑکی کی لاش کے پاؤں میں بھی جھانجر نظر آ رہی تھی۔ اس سے میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہوسکتا ہے یہ سانول کی لاپتہ بیوی گلو کی لاش ہو۔ یہ تو بعد میں تصدیق کرنے پر ہی پتہ چلنا تھا۔

میں نے لاش کا نظری معائنہ کر کے نقشہ صورتِ حال مرتب کیا۔ مقتولہ کو کسی تیز دھار آلے سے ذبح کیا گیا تھا اور اس کی شہ رگ کٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ مقتولہ کے سینے پر دل کے مقام سے ذرا ہٹ کر تیز دھار آلے کا زخم تھا جو غالباً خنجر یا لمبے پھل والے چاقو کا تھا۔

میں نے روشن سے پوچھا کہ اس کی ماں اور بیوی ٹرنک رکھ کر جانے والی عورتوں اور مردوں کو شناخت کر لیں گی؟

''میں نے یہ بات ان سے پوچھی تھی'' ـــــ روشن نے کہا ـــــ ''اس کے جواب میں دونوں ایک دوسری کا منہ تکنے لگی تھیں۔ پھر میری بیوی نے بڑی سوچ بچار کے بعد کہا کہ ان عورتوں میں جو

بڑی عمر کی تھی، اس کے ماتھے پر ایک سیاہ رنگ کا مسّہ نمایاں تھا۔ سامنے آنے پر وہ اس عورت کو پہچان لے گی''۔

میرے لیے نئی پریشانی کھڑی ہو گئی تھی۔ گمشدگی کے کیس کی تفتیش کرتے کرتے قتل کے کیس سے پالا پڑ گیا تھا۔ میں نے فوری طور پر لاش کو پوسٹمارٹم کے لیے بھجوا دیا۔ اس سے پہلے میں نے فوٹو گرافر کو بلا کر لاش کی تصویریں بنوالیں اور جسم پر موجود نشانات نوٹ کر لئے۔ میرے دو کانسٹیبل محمد حسن اور غفور لاش کے ساتھ چلے گئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے روشن اور اس کے بھائی زین کی طرف توجہ دی۔ ان دونوں کے بیان پر ہی میں نے اعتبار نہیں کرنا تھا۔ جب تک مکمل انکوائری نہ کر لیتا۔ میں نے دونوں بھائیوں کو مشتبہ بٹھا لیا اور نمبردار سے کہا کہ وہ اپنے گاؤں میں نظر رکھے اور کسی قسم کا سراغ لینے کی کوشش کرے۔

اس کے بعد میں نے روشن کی ماں اور اس کی بیوی حسناں کو بھی تھانے بلانے فیصلہ کر لیا۔ لاش چونکہ دونوں بھائیوں نے پیش کی تھی اس لیے میں نے احتیاطاً شک کی بنا پر دفعہ 54 میں انہیں گرفتار کر لیا تھا۔ یہ گرفتاری تفتیشی امکانات کو سامنے رکھ کر کی گئی تھی۔

انسان جرم کرتے وقت کتنی ہی عقلمندی کا مظاہرہ کرے، جرم چھپ نہیں سکتا۔ انسان کا قتل ہضم کرنا مشکل کام ہوتا ہے۔ میں نے پولیس سروس میں ایسے بے شمار کیسوں کی تفتیش کی ہے جن میں سگے رشتوں کا خون سفید ہو گیا اور مجرم عدالت کی سزا سے بچ گئے مگر وہ بعد میں قدرت کے قانون سے نہ بچ سکے۔

میں اس کیس پر غور کر رہا تھا اور مجھے پوسٹمارٹم رپورٹ کا بھی انتظار تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل سعد اللہ نے مجھے مشورہ دیا کہ دو دن پہلے جو آدمی اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروا کے گیا تھا، اس کو بلوا کر لاش کی شناخت کروائی جائے۔ سعد اللہ ہیڈ کانسٹیبل تھا لیکن اس کا ذہن کسی تفتیشی افسر کی طرح چلتا تھا۔ میں اس کے مشورے پر بہت خوش ہوا۔ یہ خیال مجھے بھی آ جانا تھا لیکن اگر دیر سے آتا اور لاش دفن ہو چکی ہوتی تو پھر شناخت کرانا مسئلہ بن جاتا۔

میں نے اسی وقت ایک کانسٹیبل کو سانول کے گاؤں بھیج دیا کہ وہ سانول کو اور نمبردار کو اپنے ساتھ لے آئے۔ تھوڑے وقت بعد وہ کانسٹیبل جو لاش کو پوسٹمارٹم کے لیے لے کر گئے تھے وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ لے کر آ گئے۔ ڈاکٹر نے بھی وہی دو زخم لکھے تھے جو میں بیان کر چکا ہوں۔ موت کی وجہ تیز دھار آلے سے شہ رگ کا کٹنا لکھی تھی۔ ایک نئی بات جو ڈاکٹر نے لکھی تھی وہ یہ تھی کہ

مقتولہ کنواری نہیں تھی بلکہ حاملہ تھی۔

آج اتنے برس گزر جانے کے بعد ٹھیک یاد نہیں کہ ڈاکٹر نے کتنے ماہ کا حمل بتایا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ ابھی بچے میں زندگی کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے۔ یعنی حمل کے ابتدائی مہینے تھے۔

جس کانسٹیبل کو میں نے سانول کو لانے کے لیے بھیجا تھا، وہ آ گیا۔ سانول اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ سانول گاؤں میں کہیں نہیں ملا۔ گاؤں کے ایک لڑکے نے بتایا کہ سانول کو اس نے گاؤں میں ہی دیکھا تھا۔ وہ جان بوجھ کر غائب ہو گیا تھا۔ کانسٹیبل نے اس کے گھر والوں سے سختی سے کہا کہ سانول کو فوری طور پر تھانے پیش کریں ورنہ سخت کارروائی ہو گی۔

میں نے ایک کانسٹیبل بہلول پور سانول کے سسرال بھی بھیج دیا تھا کہ وہ گلو کے والدین کو تھانے لے آئے۔ تقریباً عصر کے وقت وہ کانسٹیبل گلو کے والدین کو لے کر آ گیا۔ بہلول پور کا نمبردار بھی ساتھ تھا۔ لاش پوسٹمارٹم کے بعد آ گئی تھی۔ میں نے دونوں میاں بیوی کو لاش دکھائی۔ لاش دیکھتے ہی ماں نے سینہ کوبی شروع کر دی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''میں نہ کہتی تھی'' ___ اس نے بلکتے ہوئے کہا ___ ''کہ سانول نے میری بیٹی کو مار دیا ہو گا''۔

ماں کے دل ہلا دینے والے بین ثابت کر رہے تھے کہ یہ لاش مفقود الخبر گلو کی ہے۔ گلو کے والد اور گاؤں کے نمبردار نے بھی لاش کو شناخت کر لیا۔ چونکہ مقتولہ کا خاوند تھانے نہیں پہنچا تھا اس لیے میں نے لاش کو کاغذی کارروائی کے بعد مقتولہ کے والدین کے حوالے کر دیا تاکہ اس کے کفن دفن کا انتظام کریں۔

اگر تفتیشی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو قتل کی واردات تقریباً واضح تھی۔ ابھی اصل مرحلہ یہ تھا کہ قاتل کو پکڑ کر اس کے خلاف ثبوت بھی حاصل کرنے تھے۔ ایک خیال یہ تھا کہ گلو کو اس کے آشنا نے ہی قتل نہ کر دیا ہو لیکن اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ ہو سکتا ہے گلو کو اس کے آشنا شمس کے ورثا نے قتل کر دیا ہو۔

ایک اور بات جو الجھن کا باعث بنی ہوئی تھی، وہ لاش کا ٹرنک میں بند دتو وال کے ایک گھر سے ملنا تھا۔ اس طرح دونوں بھائی روشن اور رزین بھی مشتبہ ٹھہرتے تھے۔ میں نے انہیں دوبارہ شاملِ تفتیش کرنا تھا۔

ایک اور شخص ایسا تھا جس پر شبہ تھا۔ یہ تھا مقتولہ کا خاوند سانول۔ مجھے مقتولہ کی ماں کے بین

یاد تھے۔ اس نے روتے ہوئے کہا تھا ___ ''میں نہ کہتی تھی کہ سانول نے میری بیٹی کو مار دیا ہو گا''۔

میں جتنا اس قتل کی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا، یہ اتنی ہی الجھ جاتی۔ میں نے سب سے پہلے دونوں بھائیوں کو کھنگالنا شروع کیا جن کے گھر سے مقتولہ کی لاش ملی تھی۔ میں نے ان پر اپنی پوری تفتیشی صلاحیتیں صرف کر دیں۔ گھما پھرا کر اتنے سوالات کئے کہ خود میرا سر دکھنے لگا لیکن دونوں بھائیوں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس قتل میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں اور نہ کوئی تعلق ہے۔

اب میں نے شمس اور سانول کو سامنے رکھ لیا۔ شمس ویسے ہی لاپتہ تھا اور سانول بلانے کے باوجود نہیں آیا تھا۔ مجھے سانول پر طیش آنے لگا۔ میں نے اے ایس آئی کو بلا کر کہا کہ وہ دو کانسٹیبل ساتھ لے کر جائے اور سانول کو باقاعدہ گرفتار کر کے لے آئے۔ اس کے لیے اُسے سانول کی حویلی کی تلاشی بھی لینی پڑے تو دریغ نہ کرے۔ اس کا یوں روپوش ہونا میرے شک کو پختہ کر رہا تھا۔

اے ایس آئی سانول کو لینے کے لیے چلا گیا۔ ابھی تک بہلول پور سے گلو کے آشنا شمس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ اب تو مجھے اس بات کا بھی شک ہونے لگا تھا کہ ایسا تو نہیں کہ گلو کے خاندان والوں نے شمس اور گلو کو فرار ہوتے دیکھ لیا ہو اور دونوں کو قتل کر دیا ہو۔ مگر جو چیز مجھے اُلجھن میں ڈال رہی تھی، وہ یہ تھی کہ قاتل یا قاتلوں نے گلو کو بھی شمس کے ساتھ ہی کیوں نہ دبا دیا اور انہوں نے شمس کی لاش کو کہیں اور دبا دیا اور گلو کی لاش ٹرنک میں ڈال کر دتو وال کسی کے گھر چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟

اے ایس آئی جو سانول کو لینے گیا تھا، وہ خالی واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ سانول گاؤں میں موجود نہیں ہے۔ اس کی حویلی کی تلاشی بھی لی ہے۔ وہ وہاں بھی نہیں ملا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ آخر سانول کہاں چلا گیا۔ اس طرح تو وہ اپنے خلاف شک کو مضبوط کر رہا تھا۔ اب مجھے یہ یقین ہونے لگا تھا کہ یہ قتل سانول نے ہی کیا ہے۔ اس نے اپنی زبان سے مجھے بتایا تھا کہ اسے شک ہے کہ اس کی بیوی کے شادی سے پہلے کسی سے تعلقات ہوں گے وہ اسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ سانول نے گلو اور اس کے آشنا کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ دیہات میں ایسے جرم کی سزا موت سے کم نہیں ہوتی تھی۔ اب سانول کو گرفتار کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر ایک دو روز مزید سانول نہ ملا تو اس کے لیے بھی اشتہار شور وغوغا جاری کر دوں گا۔

لیکن اشتہار شور غوغا کی نوبت ہی نہیں آئی اور اگلے دن سانول خود ہی تھانے میں آ گیا۔ گاؤں کا نمبردار اس کے ساتھ تھا۔ مجھے سانول پر بہت غصہ تھا۔ میں بڑی مشکل سے غصے کو پی گیا اور بڑی سختی سے پوچھا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔

''میں خوفزدہ ہو گیا تھا جناب!'' — اس نے بڑی عاجزی سے کہا — ''میں تو پہلے ہی مظلوم انسان ہوں۔ میرے ساتھ بہلول پور والوں نے دھوکا کیا ہے۔ انہوں نے ایک ایسی لڑکی کا رشتہ مجھے دے دیا جس کا دل کہیں اور لگا ہوا تھا وہ تو اپنی حرکت کی وجہ سے برے انجام کو پہنچ گئی لیکن میرے لیے مصیبت کھڑی کر گئی ہے...... میں نے سنا ہے کہ اس کی ماں نے تھانے میں میرے اوپر الزام لگایا ہے کہ اس کی بیٹی کو میں نے مار دیا ہے۔ مجھے تو یہ دونوں ماں بیٹی چنڈال لگتی ہیں۔ میں تو بالکل بے گناہ ہوں''۔

میں نے اس سے زیادہ سر کھپانا مناسب نہ سمجھا اور حوالات سے روشن اور زرین کو بلا لیا۔ میں نے دونوں بھائیوں سے کہا کہ وہ اس بندے کو غور سے دیکھیں اور بتائیں کہ یہی آدمی ان کے گھر لاش والا ٹرنک چھوڑ گیا تھا۔

''ہم تو اس وقت گھر میں ہی نہیں تھے مائی باپ!'' — روشن نے کہا — ''ہم کیسے نشاندہی کر سکتے ہیں! جو عورتیں اور مرد ٹرنک رکھ کر گئے تھے ان کو صرف میری ماں اور بیوی نے دیکھا تھا۔ وہی شناخت کر سکتی ہیں۔ بہتر ہو گا آپ ان کو بلوا لیں''۔

میں نے اسی وقت ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ تانگہ لے کر دتووال جائے اور جتنی جلدی ہو سکے روشن کی ماں اور گھر والی کو ساتھ لے آئے۔ کانسٹیبل اسی وقت چلا گیا اور صرف آدھے گھنٹے بعد دونوں عورتوں کو ساتھ لے کر آ گیا۔ میں سانول پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ ان عورتوں کو دیکھ کر وہ اِدھر اُدھر یونہی گردن گھمانے لگا۔

میں نے دونوں عورتوں سے کہا کہ وہ اس آدمی کو غور سے دیکھیں اور بتائیں کہ جو عورتیں ان کے گھر ٹرنک چھوڑ گئی تھیں، یہ ان کے ساتھ تھا یا نہیں۔

''ہم نے ان کے ساتھ آدمی کو نہیں دیکھا تھا'' — روشن کی ماں نے کہا — ''دونوں عورتوں میں سے ایک عورت لسی کا گلاس باہر لے گئی تھی۔ ہم نے صرف عورتوں کو ہی دیکھا تھا''۔

عورتوں کی بات سن کر سانول کے چہرے پر رونق لوٹ آئی۔

''آپ مجھ پر خواہ مخواہ شک کر رہے ہیں آغا صاحب!'' — سانول نے کہا — ''حالانکہ

ظلم میرے ساتھ ہوا ہے''۔

''اگر وہ عورتیں سامنے آ جائیں تو ان میں سے ایک کو میں پہچان لوں گی'' — روشن کی بیوی حساں نے کہا — ''اس کی پیشانی پر موجود مسّہ ہی اس کی پہچان ہے''۔

''مجھے پانی پلا دو'' — اچانک سانول بول اٹھا — ''بڑے زور کی پیاس لگی ہے'' — پھر وہ خود کلامی کے انداز میں بولنے لگا — ''خواہ مخواہ شادی کر لی...... یہ شادی کر کے مصیبت میں پھنس گیا ہوں...... شادی نہ ہی کرتا تو اچھا تھا'' — پھر وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

میں سانول کی حرکات نوٹ کر رہا تھا۔ اس کی بے چینی اور گھبراہٹ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے یا پھر پوری دال ہی کالی ہے۔ ابھی میں اگلے اقدام کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل سعد اللہ بول پڑا۔

''آپ ایسا کیوں نہیں کرتے!'' — سعد اللہ نے کہا — ''کہ ان دونوں عورتوں کو ساتھ لے کر سعادت پور سانول کی حویلی میں چلے جائیں۔ وہاں ان عورتوں سے سانول کے گھر کی عورتوں کی شناخت کرائی جائے گی''۔

مجھے سعد اللہ کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ میں نے سعد اللہ اور چار کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور اسی وقت سعادت پور سانول کی حویلی کو روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچے تو سانول نے کہا کہ وہ حویلی کی عورتوں کو بتا دے کہ پولیس والے آئے ہیں۔ وہ حویلی میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد باہر آ گیا۔

''میرے گھر کی تمام عورتیں اندر موجود ہیں'' — سانول نے کہا — ''آپ اندر آ کر شناخت کروا لیں''۔

میں دونوں عورتوں کو لے کر اندر چلا گیا اور کانسٹیبلوں کو باہر ہی کھڑا رہنے کو کہا۔ میں نے دونوں عورتوں سے کہا کہ وہ سانول کے گھر میں موجود تمام عورتوں کو غور سے دیکھیں اور بتائیں کہ ان میں وہ عورت ہے یا نہیں۔ دونوں نے سانول کے گھر کی عورتوں کا بغور ملاحظہ کیا اور پھر نفی میں سر ہلا کر کہا کہ وہ عورت ان میں موجود نہیں ہے۔

میری ساری امیدوں اور اندازوں کی عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ اس خبر سے مجھ پر مایوسی طاری ہو گئی۔ قتل کا ایک پیچیدہ کیس حل ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ نمبردار بھی وہاں موجود تھا۔ وہ بڑا اصرار کر کے مجھے اپنے حجرے یعنی عوامی مہمان خانے میں لے گیا۔ میں وہاں ذرا ستانے کے لیے گاؤ تکیئے سے ٹیک لگا کر پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ نمبردار نے ٹھنڈی اور میٹھی لسی سے تواضع کی تو

دماغ میں سکون سا محسوس ہوا۔

میں تکئے سے ٹیک لگائے اس کیس کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ حجرے کا دروازہ میرے دائیں طرف تھا اور وہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ دروازے کے سامنے سے کوئی گزرا ہے۔ میں نے کوئی اہمیت نہ دی۔ ذرا دیر بعد پھر کوئی دروازے کے سامنے سے گزرا تو میری پولیس والی حس بیدار ہوگئی اور میں نے دروازے پر نظریں جمالیں۔ ذرا ہی دیر گزری ہوگی کہ پھر تیسری مرتبہ کوئی وہاں سے گزرا۔ اس مرتبہ میں نے صاف دیکھ لیا کہ وہ کوئی مرد ہے جس نے سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ میں بجلی کی تیزی سے اٹھا اور پلک جھپکنے میں دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ باہر ایک خوش پوش آدمی کھڑا تھا جو شکل وصورت سے معزز لگ رہا تھا۔ وہ پختہ عمر آدمی تھا اور کالے اور سفید ملے جلے بالوں کی داڑھی خوب جچ رہی تھی۔

میں نے اس کو اندر بلالیا۔ وہ اندر آ گیا تو میں نے پوچھا کہ وہ کون ہے اور مہمان خانے کے دروازے پر بار بار کیوں آتا ہے۔

''میرا نام رحمت ہے حضور!'' ــــ اس نے کہا ــــ ''میں زمیندار ہوں۔ آپ سے ایک بات کرنا چاہتا تھا مگر جھجک رہا تھا''۔

''ایسی کیا بات ہے جو تم مجھ سے کرنا چاہتے ہو؟''

''اگر آپ میرا نام راز میں رکھیں تو میں بتاؤں گا'' ــــ رحمت نے کہا ــــ ''میں کسی سے دشمنی نہیں لگانا چاہتا؟''

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں اس کا پردہ رکھوں گا اور کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ اس نے میرے ساتھ کوئی بات کی ہے۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ ہم اپنے کسی مخبر کا نام ظاہر نہیں کیا کرتے۔ اسے یقین ہوگیا میں اس کا نام ظاہر نہیں کروں گا۔

''سانول نے آپ کو دھوکہ دیا ہے'' ــــ رحمت نے کہا ــــ ''اس نے حویلی کی پچھلی دیوار سے اپنی ماں کو کسی اور کے گھر اتار دیا تھا۔ اس طرح شناخت والی عورتوں میں اس کی ماں شامل نہیں تھی۔ سانول کا اس گاؤں میں بڑا اثر ورسوخ ہے، اس لیے کسی نے آپ کو بتانے کی جرأت نہیں کی''۔

میں نے اس آدمی کا شکریہ ادا کر کے رخصت کر دیا۔ اس نے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔ گاؤں میں اکثر لوگوں کی دشمنیاں ہوتی ہیں۔ رحمت نے بھی سانول کے خلاف کوئی

دشمنی نکالی تھی۔ مگر اس سے میرا کام آسان ہوگیا تھا۔

مجھے سانول کی مکاری پر بہت غصہ تھا۔ رحمت کے جاتے ہی میں نے سانول کو حجرے میں بلوالیا۔ وہ آ گیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں اس وقت کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

''کیا تم نے اپنے گھر کی ساری عورتوں کو شناخت کے لیے پیش کر دیا تھا؟'' ــــ میں نے اس سے سخت لہجے میں پوچھا۔

''جی...... جی ہاں سرکار!'' ــــ اس نے ذرا گڑبڑا کر کہا ــــ ''آپ کو کوئی شک ہے؟''

میں ٹہلتے ٹہلتے اس کے قریب آیا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے بائیں گال پر مارا۔ میں اپنی تعریف کرنا اچھا نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اللہ نے بہت اچھی صحت اور قدبت دیا ہے۔ میرا تھپڑ کھا کر وہ فرش پر گر پڑا، ابھی وہ زمین پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے ہی لگا تھا کہ میں نے اپنا بھاری بھرکم بوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور دباؤ ڈالنے لگا۔ وہ درد کی شدت سے تڑپنے لگا۔

''تمہاری ماں کہاں مرگئی ہے؟'' ــــ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ــــ ''اسے فوراً حاضر کرو''۔

میرا سوال سن کر سانول کے چہرے پر چھائے تکلیف کے آثار حیرت میں بدل گئے اور وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

''میری بہن بیمار ہے'' ــــ سانول نے کہا ــــ ''وہ اس کی تیمارداری کے لیے گئی ہے''۔

''اپنی ماں کو پیش کردو'' ــــ میں نے اس کے ہاتھ پر سے اپنا بوٹ اٹھاتے ہوئے کہا ــــ ''ورنہ تمہاری جان نہیں چھوٹے گی''۔

''آپ میری ایک عرض سن لیں'' ــــ سانول نے کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا ــــ ''میری ماں کو نہ بلوائیں...... آپ جیسے چاہیں گے، میں آپ کو خوش کردوں گا''۔

اس کی یہ بات سن کر میں بہت خوش ہوا کہ اب یہ کیس حل ہونے والا ہے۔ آپ شاید یہ پڑھ کر حیران ہوں کہ میں کیس حل ہونے پر خوش ہو رہا تھا یا رشوت ملنے پر؟ میں آپ کو اصل وجہ بتاتا ہوں۔ یہ آج سے تقریباً اڑتالیس سال پہلے کے زمانے کی بات ہے۔ میں گھر سے زمیندار تھا۔ خوشحالی تھی۔ روپے پیسے کا کوئی لالچ نہ تھا کہ رشوت کی تمنا ہوتی۔ ویسے بھی میں ایک نوجوان لڑکی کے قتل کے مقدمے کو رشوت لے کر ہضم کرنے کے حق میں نہ تھا۔

ان وقتوں میں جو کیس ذرا پیچیدہ اور مشکل ہوتا تھا، اس کو ہم بڑی دلچسپی سے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور مشکلات سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ بعد میں ایسے کیسوں کو ہم اپنا کارنامہ خیال کرتے تھے۔ آج کل میرے ہی عزیز پولیس والے ہیں جو موٹر کاریں رکھنے کے شوقین ہو گئے ہیں۔ ہر طرف راتوں رات دولت مند بننے کی دوڑ لگی ہے۔ رشوت کا دور دورہ ہے۔ افسوس کہ میرا پیارا ملک کدھر جا رہا ہے۔

حکومت کو بھی یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے کہ پولیس والے جتنی ڈیوٹی دیتے ہیں اس کے مقابلے میں ان کی تنخواہیں بہت کم ہیں۔ یہ بھی رشوت کی ایک وجہ ہے۔

''میں تمہارا نذرانہ قبول کر لوں گا'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''پہلے تم اپنی ماں کو پیش کرو، پھر لینے دینے کی بات کریں گے''۔

میرے صاف انکار نہ کرنے پر سانول پُرامید ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ فلاں گھر میں اس کی ماں بیٹھی ہے، کسی کو بھیج کر بلوا لیں۔ میں نے کسی کانسٹیبل کو بھیجنے کی بجائے نمبردار کے گھر کی ایک ملازمہ کو بھیجا کہ وہ فلاں گھر میں جائے اور سانول کی ماں کو یہ کہہ کر ساتھ لے آئے کہ سانول بلا رہا ہے۔

ذرا دیر بعد میں وہ ملازمہ ایک ادھیڑ عمر عورت کو ساتھ لے کر حجرے میں آ گئی۔ حجرے میں ایک تھانیدار کو دیکھ کر اس کا رنگ ایک دم اڑ گیا۔ میں نے سب سے پہلے جو چیز نوٹ کی، وہ اس کی پیشانی پر موجود مسّہ تھا۔ وہ ایک بھاری بھرکم عورت تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش سے سختی اور کرختگی جھلکتی تھی۔

میں نے روشن کی ماں اور بیوی کو وہیں بلا لیا۔ جونہی وہ حجرے میں داخل ہوئیں، ان کی نظر سانول کی ماں پر پڑی تو چونک گئیں۔

''یہی ہے وہ مکار بڑھیا!'' ـــــ حسناں نے کہا ـــــ ''یہی ٹرنک ہمارے گھر میں رکھ گئی تھی۔ میرے شوہر اور دیور کو اس کمبخت کی وجہ سے حوالات میں رہنا پڑا ہے''۔

کیس مکمل ہو گیا تھا۔ راز کھل گیا تھا۔ آگے میرا کام تھا۔ میں نے سانول اور اس کی ماں کو گرفتار کر لیا اور انہیں لے کر تھانے آ گیا۔ میں نے تھانے پہنچ کر سب سے پہلا جو کام کیا وہ یہ تھا کہ فوری طور پر علاقہ مجسٹریٹ سے اجازت لے کر شک میں پکڑے گئے دونوں بھائیوں روشن اور زین کو ڈسچارج کر دیا۔ سانول اور اس کی ماں کو زیر دفعہ 54 گرفتار کر کے سات یوم کے جسمانی

ریمانڈ کے لیے علاقہ مجسٹریٹ کے پاس بھجوا دیا۔ مجسٹریٹ نے سات دنوں کا ریمانڈ دے دیا۔ میں نے تفتیش شروع کر دی۔

سانول نے مجھے رشوت پیش کر کے تقریباً اقبال جرم کر ہی لیا تھا۔ میں نے آخر وقت تک سانول کو یہ یقین دلائے رکھا کہ کچھ دے دلا کر اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ میں نے استادی طریقوں سے اسے بیان دینے پر راضی کر لیا۔ اسے چونکہ یقین تھا کہ نذرانہ دے کر وہ اپنی گردن بچا لے گا، اس لیے اس نے اقبالی بیان دے دیا۔ سانول نے جو بیان دیا وہ میں غیر ضروری تفصیلات حذف کر کے سنا دیتا ہوں۔

سعادت پور والے اور بہلول پور والے بالیکے کہلاتے تھے۔ یہ ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ بالیکے دراصل ایک مشہور قبیلہ ہے۔ یہ لوگ آپس میں بیاہ شادیاں کرتے تھے۔ سانول کی شادی بہلول پور کے کرموں جٹ نامی زمیندار کی بیٹی گلو سے ہو گئی۔ گلو بہت خوبصورت تھی مگر شادی کے بعد اس نے چپ چپ اور اداس رہنا شروع کر دیا تھا۔ کسی کے بلانے پر بولتی تھی ورنہ چپ ہی رہتی تھی۔ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی۔ پہلے تو سانول اور اس کے گھر والوں نے توجہ نہ دی مگر پھر جب گاؤں کی عورتوں نے طرح طرح کی باتیں بنانی شروع کیں تو سانول کے دل میں شک کے بچھو نے اپنے پنجے گاڑ دیئے۔ اسے شک ہونے لگا کہ اس کی بیوی گلو اسے نہیں چاہتی بلکہ شادی سے پہلے کسی اور کو چاہتی ہوگی۔

سانول نے اپنے بیان میں کہا کہ ہمارا خاندان بہلول پور والوں کی نسبت بہت زیادہ خوشحال اور دولت مند ہے۔ گلو کے گھر والوں نے بیٹی کی مرضی معلوم کئے بغیر دولت دیکھ کر اپنی بیٹی ہمارے سر منڈھ دی۔

گلو کبھی کبھار شام کو باہر بھی نکل جاتی تھی۔ وہ اکثر بغیر بتائے جاتی تھی۔ سانول کی ماں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اپنی بیوی کو سنبھالو، اس کے طور طریقے ٹھیک نہیں ہیں۔ ایک روز رات گئے سانول اپنی زمینوں کے مغربی کنارے کے قریب پہنچا تو اسے درختوں کے جھنڈ میں دو سائے نظر آئے۔ خدوخال سے صاف پتہ لگ رہا تھا کہ ایک عورت ہے اور دوسرا مرد۔ سانول کو کچھ شک گزرا اور وہ دبے پاؤں ان کی طرف بڑھنے لگا۔ ذرا قریب جا کر اس نے للکارا تو مرد نے اس پر لاٹھی سے حملہ کر دیا۔ سانول نے بڑی پھرتی سے یہ وار بچایا اور برچھی سے جوابی وار کیا جو مقابل کی ٹانگ پر لگا۔ مگر یہ وار زوردار نہیں تھا۔

وہ آدمی مقابلے پر ٹھہرنے کی بجائے بجلی کی سی تیزی سے کماد کے قریبی کھیت میں گھس گیا۔ وہ بھاگ گیا تھا۔ سانول نے عورت کو قریب جا کر دیکھا تو وہ گلو تھی جو کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے پاس ایک ٹرنک پڑا تھا جس میں تمام زیور اور قیمتی کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہو رہی تھی۔

سانول اس کو پکڑ کر گھر لے آیا اور کاٹھ کباڑ سے بھرے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ اس نے اپنی ماں کو تمام صورتِ حال بتائی۔ دونوں ماں بیٹے نے مشورہ کر کے گلو کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سانول نے ٹوکہ لے کر اس کی گردن کاٹ دی۔ گلو تڑپ رہی تھی کہ اس نے قریب پڑی برچھی اٹھا کر اس کے سینے میں اتار دی۔

اب لاش کو ٹھکانے لگانے کا مرحلہ تھا۔ یہاں آ کر ان دونوں ماں بیٹوں کی مت ماری گئی اور انہیں کچھ سمجھ نہ آیا کہ لاش کیسے چھپائیں۔ آخر سانول نے لاش کو ٹرنک میں ڈالا اور اپنی ماں اور بھاوج کو لے کر بیل گاڑی میں بیٹھ کر دتو وال چلے گئے۔ سانول کا خیال تھا کہ وہیں کہیں ٹرنک رکھ کر نکل آئیں گے مگر پھر جب وہ روشن اور زین کے گھر سے لسی پی رہے تھے تو انہوں نے ٹرنک ان کے گھر رکھوا دیا اور وہاں سے نکل آئے۔

میں نے سانول کا اقبال جرم تحریر کر کے اس پر اس کا انگوٹھا لگوا لیا۔ پھر میں نے اسے آلۂ قتل برآمد کرانے کو کہا تو اس نے بتایا کہ وہ اس نے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے۔ میں اسے ساتھ لے کر اس کی حویلی چلا گیا۔ میں نے نمبردار اور ایک دو معزز آدمیوں کو ساتھ لے لیا۔ ان معزز گواہوں کی موجودگی میں سانول نے ایک کاٹھ کباڑ سے بھرے کمرے سے ٹوکہ اور برچھی نکال کر مجھے دی۔ میں نے موقعہ کے مطابق کاغذی کارروائی کی اور گواہوں سے آلۂ قتل کی برآمدگی پر دستخط کروائے۔

جہاں گلو کو قتل کیا گیا تھا وہاں صفائی کے باوجود خون آلود مٹی موجود تھی۔ میں نے یہ مٹی بھی کھرچ کر پارسل بنا لیا اور سر بمہر کر دیا۔

اس کے بعد میں نے سانول کی ماں سے بیان لیا جو سانول کے بیان کی تصدیق کرتا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ ان کے ساتھ دوسری عورت کون تھی۔ اس نے بتایا کہ دوسری عورت اس کی بڑی بہو تھی۔ میں نے اسے بھی تھانے بلوا لیا۔ اس نے بیان دیا کہ اس قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے سارے حالات معلوم تھے۔ اس نے چھپ کر گلو کے قتل کا سارا منظر دیکھا تھا۔

میں نے اس عورت کو ڈرا دھمکا کر وعدہ معاف گواہ بننے کو کہا جس پر وہ بہ خوشی تیار ہو گئی۔

پھر ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جب میں مقدمہ تیار کر کے کیس عدالت میں پیش کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک دن صبح سویرے ایک جوان آدمی تھانے میں میرے پاس آ گیا۔ اس نے جب اپنا نام بتایا تو میں چونک اٹھا۔

وہ شمس تھا۔ گلو کا آشنا۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ اور گلو ایک دوسرے کو چاہتے تھے مگر برادری مختلف ہونے کی وجہ سے ان کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر گلو کی شادی سانول سے ہو گئی اور ہنسنے کھیلنے والی گلو کو چپ لگ گئی۔ شمس گلو سے ملنے کے لیے اکثر سعادت پور چلا جاتا تھا۔ گلو اس سے ملتی تھی اور رو رو کر کہتی تھی اسے اپنے ساتھ لے جائے۔

آخر شمس سے گلو کی حالت برداشت نہ ہوئی اور انہوں نے بھاگ نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ وہ میں سنا چکا ہوں۔

شمس نے بتایا کہ وہ اس ڈر سے غائب ہو گیا تھا کہ ٹانگ کے زخم کی وجہ سے پہچانا جائے گا اور سانول اسے قتل کرا دے گا۔ اب اسے پتہ لگا تھا کہ گلو قتل ہو گئی ہے تو وہ سانول کے خلاف بیان دینے آیا تھا۔

میں نے اس کا بیان لے لیا اور اسے گواہی کے لیے بھی تیار کر لیا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی گلو کے قاتل کو پھانسی دلوانے کے لیے ضرور گواہی دے گا۔

گلو کے ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے مگر مجھے اس بزدل عاشق کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ اپنی محبوبہ کو موت کے منہ میں چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ نکلا تھا۔ اب وہ مگرمچھ کے آنسو بہا رہا تھا۔

میں نے کیس بڑا مضبوط بنایا تھا۔ ثبوت بھی مہیا کئے تھے۔ وعدہ معاف گواہ بھی موجود تھی۔ شمس کی گواہی بھی بڑی اہم تھی۔ عدالت نے سانول کو عمر قید اور اس کی ماں کو سات سال سزا سنائی۔

بچہ، بھیداور ملنگ

میں اپنی ڈائری سے ایک دلچسپ تفتیشی کہانی پیش کر رہا ہوں۔ اپنی سروس میں بے شمار وارداتوں کی تفتیش کی ہے لیکن ہر تفتیش اس قابل نہیں ہوتی کہ سنائی جا سکے۔ صرف وہی تفتیش سنانے کے قابل ہوتی ہے جس میں کوئی دلچسپ واقعہ یا کہانی شامل ہو یا تفتیش کا کوئی کمال ہو، سراغرسانی کی مہارت ہو۔

یہ جو کہانی میں نے سنانے لگا ہوں، آج سے 50 سال پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ 1951ء کی بات ہے۔ ان دنوں میں تھانہ مٹھ ٹوانہ ضلع خوشاب میں ایس ایچ او تعینات تھا۔ ان وقتوں میں مٹھ ٹوانہ کو ضلع سرگودھا لگتا تھا۔

اصل واقعہ سنانے سے پہلے میں محترم عنایت اللہ صاحب کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر میں لکھتے وقت ان کا تذکرہ نہ کروں تو اطمینان نہیں ہوتا۔ سروس کے دوران پیش آنے والے تفتیشی واقعات لکھنے کی طرف انہوں نے ہی مجھے راغب کیا تھا۔ اب لکھنے کی ایسی لت پڑی ہے کہ اس کے بغیر اپنے آپ کو ادھورا سمجھتا ہوں۔

اب میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ صبح کا وقت تھا اور میں تھانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے پاس میرا اے ایس آئی رشید الدین قریشی بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں ایک کیس پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ ایک کانسٹیبل نے آ کر بتایا کہ موضع روڑا ملکو کا نمبردار کچھ آدمیوں کے ساتھ آیا ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں اس نمبردار کو اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے ساتھ میری علیک سلیک بھی تھی۔ اس کا نام غلام محمد تھا اور اس کا علاقہ میرے تھانے مٹھ ٹوانہ کے تحت آتا تھا۔

میں نے کانسٹیبل سے انہیں دوسرے کمرے میں بٹھانے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ وہ آنے والوں کے لیے شربت کا بندوبست کرے۔ میں نے دیکھا وہ لوگ اپنے اونٹ تھانے کے باہر

درختوں کے ساتھ باندھ چکے تھے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ حیران ہوں کہ تھانے میں آنے والوں کو شربت کیوں پلایا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں وضاحت کر دوں کہ یہ لوگ کم و بیش 20 کوس دور سے سفر کر کے آئے تھے۔ انہوں نے رات بھر سفر کیا ہوگا، تب جا کے صبح کے وقت تھانے پہنچے تھے۔

آنے والوں کو شربت پلایا گیا اور کچھ دیر آرام کرنے دیا گیا۔ اس کے بعد میں نے نمبردار غلام محمد سے آنے کی غرض و غایت پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ ایک مقدمہ درج کروانے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے اس سے زبانی تفصیل سنی جو خاصی دلچسپ اور انوکھی تھی۔ غلام محمد کے ساتھ ایک ساٹھ سالہ بوڑھا بھی تھا جس کا نام بخشو تھا اور یہ رپورٹ بخشو کی طرف سے درج ہونی تھی۔ بخشو نے جو کچھ سنایا وہ میں مختصر کر کے سنا دیتا ہوں۔

بخشو ایک بڑے علاقے ڈیرہ گنجا کا بڑا زمیندار تھا۔ اس کی خاصی زرعی اور غیر زرعی زمین اور جائیداد تھی۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام اس نے گلمواز بتایا۔ یہ بیٹا شادی شدہ تھا اور اس کی بیوی حاملہ تھی۔ دو ماہ پہلے اس کا بیٹا گھر سے اونٹ خریدنے کے لیے نکلا لیکن پھر واپس گھر نہ پہنچ سکا۔ اس کی انہوں نے تھانے میں رپورٹ بھی درج کرائی تھی اور اپنے طور پر بھی تلاش کیا تھا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ گلمواز کے پاس اچھی خاصی رقم تھی۔

بخشو کے چھوٹے بھائی کے پانچ بیٹے تھے۔ ان لوگوں نے بخشو کی جائیداد پر نظر رکھی ہوئی تھی اور مختلف حیلوں بہانوں سے اس کی جائیداد ہتھیانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کی وجہ سے بخشو کے اکلوتے بیٹے کی جان کو خطرہ رہتا تھا۔ شک تھا کہ ان لوگوں نے ہی گلمواز کو کہیں غائب کر دیا ہے۔ پوری برادری میں انہی لوگوں کا رعب دبدبہ تھا۔ ان کے مقابلے میں بخشو اور اس کی بوڑھی بیوی کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

یہ دو ماہ پہلے کے واقعات تھے جو بخشو نے مجھے سنائے۔ مجھے اس تھانے کا چارج سنبھالے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اور اس وقت کوئی اور تھانیدار اس تھانے میں انچارج تھا۔

بخشو نے تازہ بات جو سنائی اسے سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے بتایا کہ دو تین دن پہلے اس کی بہو کو درد زہ ہوا تھا اس کی بیوی نے گاؤں کی دائی کو بلوا لیا۔ بخشو کے بھتیجوں کی بیویاں بھی آ گئیں اور اس کی بھتیجیاں بھی آ گئیں۔ انہوں نے کسی بہانے سے بخشو کی بوڑھی بیوی کو باہر ہی بیٹھنے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد زچگی والے کمرے سے رونے کی آواز آنے لگی۔ پتہ لگا کہ

بخشو کی بہو زچگی کے دوران مر گئی ہے اور بچہ بھی پیٹ کے اندر مر گیا ہے۔

وہ دیہاتی لوگ تھے کسی نے اتنا غور نہ کیا کہ زچہ کیسے مر گئی ہے۔ ان کے علاقے میں اکثر ایسے کیس ہوتے رہتے تھے۔ یہاں شہروں والی سہولتیں نہیں تھیں۔ سارا علاقہ ریگستانی تھا اور ویسے بھی یہ 1951ء کی بات ہے۔ بہر حال مرنے والی کے کفن دفن کا انتظام کیا گیا اور جنازہ قبرستان لے گئے۔ جب میت کو قبر میں اتارنے لگے تو اچانک مردہ عورت نے لحد میں اتارنے والے ایک شخص کا بازو بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ شخص خوفزدہ ہو گیا اور چیخنے لگا کہ اسے مردے نے پکڑ لیا ہے۔

جنازے کے ساتھ آنے والے لوگ یہ منظر دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ جس کا بازو میت کے ہاتھ نے پکڑا تھا، وہ دہشت سے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اتنی دیر میں مردہ عورت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اب تو لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ایسا دہشت ناک منظر نہیں دیکھا تھا کہ کوئی مردہ زندہ ہو گیا ہو۔

بخشو کی بہو نے لوگوں سے کہا کہ وہ مری نہیں تھی، بے ہوش ہو گئی تھی۔ پھر اس نے امام مسجد کو پاس بلایا۔ امام مسجد اس کا استاد رہ چکا تھا اور وہ خاصا دلیر آدمی تھا۔ وہ بخشو کی بہو کے پاس چلا گیا۔ بہو نے اس کو بتایا کہ اس کا بچہ گھر میں اناج رکھنے والے بھڑولے میں پڑا ہوا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے امام مسجد کا ہاتھ پکڑا اور کفن سمیت گھر کی طرف چل پڑی۔ تمام لوگ ایک جلوس کی شکل میں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ جو بھی یہ منظر دیکھتا حیران رہ جاتا۔ ایک کفن پوش عورت نے امام مسجد کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

بہر حال گھر پہنچ کر بھڑولے میں دیکھا تو واقعی اناج کے ڈھیر پر نوزائیدہ بچہ لیٹا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ اس بچے کو نہلایا بھی نہیں گیا تھا۔ ماں نے جھپٹ کر اپنے بچے کو سینے سے لگایا اور پھر اسے دودھ پلانے لگی۔ یوں بخشو کے بیٹے کی نشانی اس کا پوتا موت کے جبڑوں سے نکل آیا اور اس کی بہو بھی مر کر زندہ ہو گئی۔

یہاں میں شہری لوگوں کو بھڑولے کے متعلق بتا دوں کہ یہ کیا چیز ہوتی ہے۔ یہ مٹی کا ایک بہت بڑا مٹکا نما برتن ہوتا ہے جو اوپر سے کھلا پھر نیچے سے گولائی میں بڑا ہوتا ہے اور سب سے نچلا حصہ خاصا تنگ ہوتا ہے۔ اس تنگ حصے میں سامنے کی طرف ایک سوراخ یا کھڑکی رکھی جاتی ہے۔ بھڑولے میں اناج محفوظ کر لیا جاتا ہے جو اوپر والے کھلے حصے سے ڈالا جاتا ہے اور بوقتِ

ضرورت نیچے والے سوراخ کو کھول کر اناج نکال کر سوراخ بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کو آپ پانی کے حمام کی مثال سے سمجھ لیں۔ آج کل جست کے بھڑولے بھی بنتے ہیں۔

ساری بات سنانے کے بعد بخشو نے کہا کہ اس کی بہو نوراں نے بتایا ہے کہ اسے عمراں اور بھاگ بھری نے جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ اب بخشو اپنی بہو اور پوتے کو امام مسجد کی حفاظت میں دے کر نمبردار غلام محمد کو ساتھ لے کر رپورٹ درج کروانے آیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے درخواست کی کہ اس کے گمشدہ بیٹے گلمواز کو بھی برآمد کیا جائے۔

میں نے زیرِ دفعہ 307 مقدمہ درج کر لیا اور اس کے علاوہ بخشو کے بیٹے گلمواز کی مفقود الخبری کی رپورٹ روزنامچہ میں درج کی اور اس کا حلیہ لکھ کر ملحقہ تھانوں میں اشتہار شور وغوغا جاری کر دیئے۔ آج کل کے دور میں شاید ہی کوئی پولیس افسر ہو جو ایسی کارروائی کرتا ہو۔ قانون یہ ہے کہ گمشدہ فرد کے اشتہار شور وغوغا جاری کرنے کے بعد تھوڑا سا شک پڑنے پر مقدمہ زیر دفعہ 64 درج کرنا چاہئے جو میں نے موقعہ پر جا کر کرنا تھا۔

میں نے اسی وقت بخشو کے گاؤں ڈیرہ گنجا جائے واردات پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اے ایس آئی اور چند کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور ہم اونٹوں پر بیٹھ کر ڈیرہ گنجا روانہ ہو گئے۔ یہ اونٹ سرکاری طور پر تھانے کو ملے ہوئے تھے۔ ان اونٹوں کے ساتھ ماہر شتر سوار بھی تھے جو تھانے کے ہی ملازم ہوتے تھے۔ ان اونٹوں کے چارے وغیرہ کے لیے سرکار کی طرف سے ڈیلی الاؤنس ملتا تھا۔

یہاں میں پڑھنے والوں کی سہولت کے لیے اس علاقے کے متعلق تفصیل سے بتا دوں تا کہ وہ علاقے اور وہاں کے ماحول کو سمجھ سکیں۔ یہ ریتلہ علاقہ تھا اور یہاں اونٹ ہی کام آ سکتے تھے۔ آج کل تو اس علاقے میں سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے اور نہر بھی آ گئی ہے اس کے علاوہ ضروریاتِ زندگی کی ساری سہولتیں پہنچ گئی ہوں گی۔ جس زمانے میں، میں نے تھانہ مٹھہ ٹوانہ کا چارج سنبھالا، یعنی 1951ء میں ان وقتوں میں یہ علاقہ تھل کہلاتا تھا۔ ہر طرف سوائے ریت کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ آٹھ آٹھ دس دس کوس کے فاصلے پر لوگوں کے گاؤں آباد تھے جنہیں ڈھوک یا بھانٹر کہتے تھے۔

یہی علاقہ نور پور تھل سے ہوتا ہوا تحصیل بھکر سے ہو کر سندھ تک چلا جاتا تھا۔ اسی سرزمین پر آگے جا کر سسّی پنوں اور عمر ماروی کی رومان انگیز داستانیں وجود میں آئی تھیں۔

ایک ڈھوک یا بھانڑ آٹھ دس گھروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ دور دور تک کوئی سرسبز درخت نظر نہیں آتا تھا۔ جنگلی بیر پائے جاتے تھے۔ گول گول زرد رنگ کے بیر بڑے لذیذ اور میٹھے ہوتے ہیں اور ایک اور پھل بھی ہوتا ہے جسے ڈیلے کہتے ہیں۔

ریت کے اندر کہیں کہیں چھوٹے سائز کے تربوز لگتے ہیں جو نہایت میٹھے اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ اس علاقے میں جب آندھی آتی ہے تو کھانے کی چیزوں میں ریت کے ذرات مل جاتے ہیں۔ قدرت نے وہاں کے رہنے والوں کی اندرونی صفائی کے لیے یہ چھوٹے تربوز پیدا کیے ہیں جو انسانی جسم کی صفائی کرکے اندر جانے والے ذرات نکال دیتے ہیں۔ یہاں کے لوگ بڑے جفاکش، محنتی اور مضبوط جسم کے مالک ہوتے ہیں۔ گرمی اس زمانے میں 120 فارن ہائیٹ تک چلی جاتی تھی لیکن وہ لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

کمزور سُست پولیس والوں کو اس علاقے میں نہیں بھیجا جاتا تھا۔ تھل میں گندم کی فصل کم ہی ہوتی تھی۔ چنے کی فصل خوب ہوتی تھی جو لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ بھی بن جاتی تھی اور کوئی خاص فصل نہیں تھی۔ پانی یہاں کی نایاب و قیمتی چیز ہے۔ کہیں کہیں نخلستان ہوتے ہیں جہاں پانی کا ذخیرہ مل جاتا ہے لیکن ایسی زمین کا یہ حصہ کسی وقت اندر کو دھنس جاتا ہے۔ جب کبھی بارش ہوتی تھی تو لوگ اس کا پانی ذخیرہ کر لیتے تھے۔

مویشی، بھیڑ بکریاں پالتے اور اونٹ ہر جگہ بار برداری کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ لوگ کھدر کا کھلا کرتہ، تہبند اور سر پر بغیر کلاہ کی پگڑی پہنتے تھے۔ پیروں میں گاؤں کے موچی کی بنی ہوئی جوتی پہنتے تھے۔ لوگ امن پسند تھے۔ جرائم بہت کم، مذہب کی طرف رجحان تھا اور مسجدیں آباد تھیں۔

اونٹ کو اس علاقے میں خاص اہمیت حاصل تھی یا اب بھی ہوگی۔ اونٹ صحرا کا جہاز مانا جاتا ہے۔ کئی کئی دن بغیر خوراک کے رہ سکتا ہے۔ اس دوران اپنی کوہان سے سٹور کی ہوئی چربی استعمال کرتا ہے۔ اس کے معدے میں ایک خانہ فالتو ہوتا ہے جس میں پانی سٹور کر لیتا ہے۔ سخت گرمی میں جب صحرا کا درجۂ حرارت 120 اور 125 فارن ہائیٹ تک پہنچ جاتا ہے تو یہی اونٹ ببر شیر کی طرح صحرا کو چیرتا ہوا چلتا جاتا ہے۔ اس کی اونچائی اتنی ہوتی ہے کہ چھوٹا موٹا درندہ اونٹ سوار تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔ اس کے پاؤں قدرت نے ایسی صناعی سے بنائے ہیں کہ ریت پر پھیل جاتے ہیں اور گرمی نہیں لگتی۔ ورنہ اتنی گرمی میں سفر کرنا موت کو

دعوت دینے کے برابر ہے۔ اونٹ دشمنی پالنے والا جانور ہے اور جب بھی موقع ملے دشمن کو مار ڈالتا ہے۔ اونٹنی کا دودھ بڑا شفا بخش ہوتا ہے۔ اونٹ کا گوشت خوراک کا کام بھی دیتا ہے۔

یہ تھل کے بارے میں کچھ معلومات تھیں جو میں نے پیش کی ہیں۔ میں سنا رہا تھا کہ ہم اونٹوں پر بیٹھ کر جائے واردات پر روانہ ہونے لگے۔ شدید گرمی میں ہمارا قافلہ روانہ ہو گیا۔ پانی ہم نے مٹی کی بلٹوں میں بھر کے اونٹوں پر رکھ لیا تھا۔ یہ گھڑا نما برتن ہوتے ہیں۔ بادِ سموم کے لیے ہم نے منہ سر پر اچھی طرح منڈاسے مار لئے۔ راستے میں جو ڈھوک یا بھانڑ آتی، وہاں کچھ دیر ستا کر آگے بڑھ جاتے۔ آخر شام کو واردات والے گاؤں جا پہنچے۔

اس زمانے میں پولیس کا بڑا رعب و دبدبہ ہوا کرتا تھا۔ خاص کر تھل جیسے پسماندہ علاقے کے لوگ پولیس کی آمد کی اطلاع سن کر گھروں میں بیٹھے کانپتے تھے۔ اگر تفتیش کے سلسلے میں کسی کو تھانے طلب کرلیا جاتا تو اس کی اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ جھوٹ بول سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پولیس والے اپنا کام ایمانداری سے کرتے تھے اور کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ اس وقت رشوت کوئی کوئی لیتا تھا لیکن ایسے حالات ہی پیدا نہیں ہونے دیئے جاتے تھے کہ رشوت لینے یا دینے کا جواز پیدا ہو۔

آج کل تو پولیس کا کوئی رعب اور عزت نہیں ہے بلکہ لوگ پولیس والوں سے نفرت کرتے ہیں۔ رشوت کے بل پر مدعی ملزم بن جاتے ہیں اور ملزم مدعی۔

ڈیرہ گنجا پہنچنے کے بعد ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ اس کے بعد میں نے تفتیش کا آغاز کیا۔ نمبر دار غلام محمد میرے ساتھ تھا۔ وہ بڑا بااثر زمیندار تھا۔ سب سے پہلے میں نے مدعی بخشو کی بہو نوراں کو بلوایا۔ نوراں کی حالت ابھی اچھی نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال وہ آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک عورت تھی جس نے اس کا بچہ اٹھا رکھا تھا۔ میں نے ایک چارپائی پر تکیہ لگوا کر نوراں کو آرام سے بٹھایا۔ عورت نے بچہ اس کے پاس چارپائی پر لٹا دیا۔ اس کے بعد میں نے اس سے بیان لیا جو مختصراً سنا رہا ہوں۔

جب نوراں کے بچے کی ولادت کا وقت قریب آیا تو اس کے ساس سسر نے گاؤں کی دائی روشی کو بلوا لیا۔ روشی بی بی بڑی ماہر اور تجربہ کار دائی تھی۔ اس نے اس کام کی تربیت خوشاب سے حاصل کی تھی۔ روشی بی بی کے ساتھ بخشو کی بھتیجیاں عمراں اور بھاگ بھری بھی کمرے میں آ گئیں۔ روشی نے بچے کی ولادت کے لیے نوراں کی مدد شروع کر دی۔ بچے کی

ولادت کا مرحلہ بڑا جان لیوا اور مشکل ہوتا ہے۔ نوراں کو ایسا محسوس ہوا جیسے عمراں اور بھاگ بھری دائی کے کام میں رکاوٹ ڈال رہی ہیں اور ساتھ ساتھ اسے کچھ سرگوشیوں میں کہہ بھی رہی ہیں۔

پھر بچہ پیدا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی نوراں کی ناک پر ایک کپڑا رکھ دیا گیا۔ اس کپڑے سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔ اس بو سے آہستہ آہستہ نوراں پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ وہ پوری طرح بے ہوش تو نہ ہوئی لیکن وہ کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے خواب کے عالم میں ہو۔ اسے آوازیں آ رہی تھیں کہ ماں کے ساتھ بچے کو بھی مار دو۔ اصل فساد کی جڑ یہ بچہ ہی ہے۔ یہ مر گیا تو بخشو لاوارث ہو جائے گا۔ پھر اسے پتہ لگا کہ اس کے بچے کو اناج والے بھڑولے میں ڈال دیا گیا ہے۔

آہستہ آہستہ نوراں ہوش و حواس سے بیگانی ہو گئی۔ اس کے بعد واقعات یوں ہوئے کہ اسے مردہ سمجھ کر کفن دفن کا انتظام ہونے لگا۔ بخشو کے بھتیجے اور بھتیجیاں اس کام میں پیش پیش تھے اور بڑی جلدی کر رہے تھے۔ جب نوراں کو گرم پانی سے نہلایا گیا تو اسے کچھ کچھ ہوش آنے لگی لیکن ابھی وہ اپنے حواس میں نہیں آئی تھی۔ پھر جب اسے چارپائی پر ڈال کر قبرستان لے جانے لگے تو اسے ہوش آنے لگی۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی زندگی منظور تھی اس لیے نوراں ہاتھ پیر ہلانے کے قابل ہونے لگی۔

جب اس کو پکڑ کر قبر میں لٹانے لگے تو اس نے ایک شخص کا بازو پکڑ لیا۔ وہ شخص خوفزدہ ہو گیا۔ اس کے بعد نوراں امام مسجد کا ہاتھ پکڑ کر گھر پہنچی اور بھڑولے سے اپنا بچہ نکال لیا۔ بخشو کا ایک دوست ایک دوسری دائی کرماں بی بی کو ساتھ لے آیا۔ اس نے بچے کو نہلا دھلا کر صاف کیا۔

''ربّ سوہنے نے مجھ پر اور میرے بچے پر رحم کیا اور ہمیں نئی زندگی دی'' ___ نوراں نے آسمان کی طرف تشکرانہ انداز سے دیکھ کر کہا ___ ''اب مجھے اور میرے بچے کو رانجھے وغیرہ سے جان کا خطرہ ہے۔ میرے خاوند گلمواز کو بھی انہی لوگوں نے غائب کیا ہے''۔

''ان لوگوں پر شک کی کوئی ٹھوس وجہ ہے؟'' ___ میں نے نوراں سے پوچھا۔

''یہ سارا میرے سسر کی جائیداد کا چکر ہے'' ___ نوراں نے کہا ___ ''انہوں نے جائیداد کی خاطر میرے خاوند کو غائب کیا ہے اور اسی لالچ میں مجھے اور میرے بچے کو قتل کرنے

کی کوشش بھی کی ہے''۔

لڑکی خاصی سمجھدار معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ماں باپ کا گھر مٹھہ ٹوانہ کے قریب ڈھوک ڈھیاں میں تھا۔ یہ لوگ مسکین قوم سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا زمیندارہ تھا۔ نوراں نے مزید بتایا کہ ڈیرہ گنجا کے علاوہ بھی اس کے سسر کی بہت سی جائیداد ہے۔ زمین کا ایک بڑا ٹکڑا مٹھہ ٹوانہ سے پانچ چھ کوس کے فاصلے پر ہے۔ اس ٹکڑے سے ہونے والی فصل کا حصہ بخشو کے بھتیجے اس تک پہنچنے نہیں دیتے تھے۔

میں نے اپنے مطلب کی کچھ اور باتیں پوچھیں اور فوری کارروائی کا فیصلہ کر لیا۔ سب کچھ روزِ روشن کی طرح صاف تھا۔ میں نے اپنے اے ایس آئی اور کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور ملزم رانجھا وغیرہ کے گھر جا کر چھاپہ مارا۔ وہاں سے میں نے رانجھا، اس کے بھائی دتو اور رمضو کو گرفتار کر لیا۔ ان کے دو اور بھائی گھر میں موجود نہیں تھے۔ اس کے بعد میں نے ان کے مکان کی خانہ تلاشی لی اور دو برچھیاں اور تین کلہاڑیاں برآمد کر لیں۔ ان ہتھیاروں کی برآمدگی کی میں نے فردِ مرتب کی اور ملزمان کو زیرِ دفعہ 54 گرفتار کر لیا۔

اس کے بعد میں نے فوری طور پر دایہ روشی بی بی، عمراں اور بھاگ بھری کو بھی زیرِ دفعہ 307 گرفتار کر لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں کے لوگ پولیس کی آمد پر ناخوش تھے اور عدم تعاون کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان میں یقیناً جرائم پیشہ لوگ زیادہ ہوں گے۔ میں نے مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرایا کہ گاؤں کے لوگ پولیس کے ساتھ پورا تعاون کریں اور کوئی بات نہ چھپائیں۔ یہ نہ سمجھیں کہ تھانہ یہاں سے دور ہے۔ میں ایک دن کی مسافت کر کے یہاں پہنچ سکتا ہوں اور بدمعاش اور فسادی لوگوں کا حشر خراب کر دوں گا۔

میرے اس اعلان سے ڈیرہ گنجا پر ایسا دبدبہ بیٹھا کہ لوگ سیدھے ہو گئے اور از خود تعاون کرنے لگے۔ اب لوگ آ آ کر دایہ روشی، عمراں اور بھاگ بھری کو لعنت ملامت کرنے لگے تھے۔ میں نے ان کے بیان لیے۔ سب سے پہلے میں نے دایہ روشی بی بی کا بیان لیا۔

اس نے اپنے بیان میں بتایا کہ وہ باقاعدہ دایہ کا کام کرتی ہے۔ اس نے خوشاب کے سرکاری ہسپتال سے اس کام کی ٹریننگ لے رکھی ہے۔ اس نے ہسپتال سے کلوروفارم چوری کر کے اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ جب کبھی زچگی کے دوران زچہ کو تکلیف زیادہ ہوتی تو وہ ذرا سی کلوروفارم سنگھا دیتی جس سے زچہ کو سہولت ہو جاتی۔

"میں لالچ میں آ گئی تھی"۔۔۔ اس نے شرمندگی سے کہا۔۔۔ "عمراں اور بھاگ بھری کے کہنے پر میں نے نوراں بی بی کو زیادہ کلوروفارم سنگھادی۔ نوراں کی بے ہوشی کو ہم نے موت سمجھا۔ گاؤں کے کسی بھی فرد نے نبض چیک نہ کی۔ ویسے بھی ہم نے سب کو یقین دلا دیا تھا کہ نوراں مرگئی ہے"۔

"تم نے بچے کو زندہ کیوں چھوڑ دیا تھا؟"۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"سچ پوچھیں تو مجھے اللہ کا خوف آ گیا تھا"۔۔۔ روشی نے کہا۔۔۔ "میں نے بچے کو بھڑولے میں ڈال دیا"۔

میں نے شہادت ایکٹ کے تحت زیر دفعہ 27 روشی کی نشاندہی پر کلوروفارم کی شیشی برآمد کرلی اور گواہوں سے دستخط کرالئے۔

عمراں اور بھاگ بھری کو پوچھ گچھ کے لیے بلایا تو وہ خوف سے کانپ رہی تھیں۔ انہوں نے کچھ کہنے کی بجائے رونا شروع کردیا اور میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان سے بیان لیا۔ دونوں نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا اور پشیمانی ظاہر کرنے لگیں۔

اس کے بعد میں نے رانجھا، دتو اور رمضو کو تفتیش کی چکی میں ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ یہ مرد تھے اور ان سے کچھ اگلوانا آسان نہیں تھا۔ عورتوں نے تو فوراً اقبالی بیان دے دیئے تھے۔ رات خاصی ہو چکی تھی لہٰذا میں تمام ملزمان کو گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔ علی الصبح تمام ملزمان کو جسمانی ریمانڈ کے لیے خوشاب مجسٹریٹ کی عدالت میں بھجوا دیا۔ شام تک ملزمان کو مجسٹریٹ کے پاس لے جانے والے کانسٹیبل ملزموں کو لے کر آ گئے۔ مجسٹریٹ نے آٹھ دن کا ریمانڈ دے دیا تھا۔

عورتوں سے مزید پوچھ گچھ اور ان کے ریمانڈ کی ضرورت نہ تھی، اس لیے ان کو دوسرے روز جوڈیشل ریمانڈ پر خوشاب جیل بھیج دیا۔ میں نے برآمد ہونے والی کلوروفارم کیمیکل ایگزامینر کے پاس معائنے کے لیے بھجوادی تھی۔ اس کے متعلق رپورٹ آئی کہ یہ کلوروفارم ان ہائیڈریٹ ہے جو بے ہوش کرنے کے کام آتی ہے لیکن زیادہ مقدار میں دی جائے تو موت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر میں نے بخشو کے لاپتہ بیٹے گلمواز کی پُراسرار گمشدگی کے متعلق تفتیش کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی گمشدگی کو دو ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا اور مجھے اس

بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ زندہ نہیں ہوگا۔ میں نے رانجھا، دتو اور رمضو سے تفتیش کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں نے باری باری تینوں سے تفتیش شروع کردی لیکن وہ تینوں بڑے ڈھیٹ ثابت ہوئے۔ ان میں سے کسی نے بھی اس بات کا اقرار نہ کیا کہ گلمواز کو غائب کرنے میں اس کا ہاتھ ہے۔ میں نے اپنے تمام تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے انہیں بڑے چکر دیئے لیکن اپنے کام کی کوئی بات ان کے منہ سے نہ اگلوا سکا۔

ابھی ان کے دو بھائی تاجا اور مانی بھی لاپتہ تھے۔ وہ پولیس کے خوف سے کہیں چھپ گئے تھے۔ میں نے ان کی تلاش کے لیے مخبر چھوڑ رکھے تھے مگر ابھی تک کہیں بھی ان کی موجودگی کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ میں عام طور پر تشدد کا قائل نہیں تھا لیکن اگر مجھے اس بات کا یقین ہوتا کہ جس سے میں تفتیش کر رہا ہوں وہی مجرم ہے اور جھوٹ بول کر چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے تو پھر میں تھرڈ ڈگری استعمال کرنا ضروری سمجھتا۔

رانجھا، دتو اور رمضو کے متعلق بھی مجھے یقین تھا کہ گلمواز کو غائب کرنے میں انہی کا ہاتھ ہے۔ اس لیے میں نے ان کی طبیعت صاف کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لاتوں کے بھوت ہیں، باتوں سے نہیں مانیں گے۔ ان تینوں پر الگ الگ خاصا تشدد کیا گیا اور ان کی چیخیں گونجتی رہیں۔ تشدد کے بعد میں نے پھر ان سے پوچھ گچھ کی لیکن وہ اپنے انکار پر قائم رہے۔ ان تینوں بھائیوں میں رانجھا سب سے بڑا تھا اور خاصا ہوشیار لگتا تھا اور بڑے اعتماد سے بات کرتا تھا۔

"آپ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟"۔۔۔ رانجھا نے کہا۔۔۔ "اس کی گمشدگی کی کوئی اور وجہ بھی تو ہو سکتی ہے"۔

"تم لوگ اس کی جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتے ہو"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اسی چکر میں تمہاری بہنوں نے نوراں اور اس کے بچے کو قتل کرنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ سیدھی سی بات ہے کہ گلمواز کے بعد اس کا بچہ بھی نہ رہتا تو بخشو کے مرنے کے بعد ساری جائیداد تم لوگوں کو ملنی تھی"۔

"آپ نے ایک اور امکان پر غور نہیں کیا"۔۔۔ رانجھا نے کہا۔۔۔ "اس کے غائب ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے"۔

''وہ کیا؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''گلمواز بڑا خوبصورت جوان تھا''۔۔۔ رانجھا نے کہا۔۔۔ ''اکثر لڑکیاں اس سے دوستی کی خواہشمند رہتی تھیں اور اس کو بھی لڑکیوں سے دوستیاں لگانے کا شوق تھا۔ ہوسکتا ہے وہ کسی لڑکی کے چکر میں مارا گیا ہو''۔

میں نے اس پہلو پر سوچا تو مجھے اس کی بات میں وزن محسوس ہوا۔ اس سے پہلے میرا ذہن صرف رانجھا وغیرہ پر اٹکا ہوا تھا۔ اب میں نے دوسرے پہلوؤں پر بھی سوچنا شروع کر دیا۔ میں نے رانجھا کو حوالات میں بھیج دیا اور خود اس پہلو پر غور کرنے لگا کہ کوئی دوسرا بھی گلمواز کو قتل یا غائب کرسکتا ہے۔

سوچتے سوچتے مجھے خیال آیا کہ بخشو نے کہا تھا کہ جس دن اس کا بیٹا لاپتہ ہوا تھا۔ اس دن وہ گھر سے اونٹ خریدنے کے لیے نکلا تھا اور اس کے پاس اچھی خاصی رقم تھی۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ اس کی بھنک کسی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے شخص کو مل گئی ہو اور اس نے موقع پا کر گلمواز کو قتل کر کے کہیں دبا دیا ہو اور رقم نکال لی ہو۔ میں نے اس پہلو پر بھی تفتیش کے دائرے کو پھیلانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس علاقے کے جرائم پیشہ لوگوں کو تھانے بلا کر پوچھ گچھ کی جائے۔

میں نے اے ایس آئی سے کہا وہ اس علاقے یعنی ڈیرہ گنجا اور اس کے گردنواح کے علاقوں کے تمام جرائم پیشہ آدمیوں کو میرے پاس لے آئے۔ یاد رہے کہ میں یہ تفتیش تھانے میں بیٹھ کر نہیں بلکہ ڈیرہ گنجا میں کررہا تھا۔ بخشو نے اپنی بیٹھک میرے لیے مخصوص کر دی تھی۔ اس دوران میں تھانے میں بوقت ضرورت چلا جاتا تھا۔

دو تین گھنٹوں بعد اے ایس آئی تین آدمیوں کو لے کر میرے پاس آیا۔ پتہ لگا کہ اس علاقے کے غنڈے بدمعاش ہیں اور موقع ملنے پر چھوٹا موٹا جرم بھی کرگزرتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھ گچھ کی اور انہیں ڈرایا کہ ان میں سے جس نے بھی یہ واردات کی ہے، بک دے ورنہ میں بہت برا سلوک کروں گا۔ تینوں قسمیں کھانے لگے کہ یہ ان کی حرکت نہیں ہے اور کسی کو قتل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں ایسے لوگوں کے ساتھ شرافت سے پیش آنے کا قائل نہیں تھا۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا کہ وہ ان کو لے جائے اور خوب رگڑا دے۔ اے ایس آئی انہیں لے کر باہر ویرانے

میں چلا گیا۔ تین کانسٹیبل اس کے ساتھ تھے۔

تقریباً بیس پچیس منٹ بعد اے ایس آئی ان تینوں کو واپس لے کر آ گیا۔ ان کی حالت بہت بری ہو رہی تھی اور سر منہ پر ریت ہی ریت نظر آ رہی تھی۔ میرا اے ایس آئی رشید الدین قریشی بڑا صحت مند آدمی تھا اور اسے تشدد کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اس نے تھوڑی سی دیر میں ہی تینوں کا برا حشر کر دیا تھا۔

میں نے ان سے کہا کہ وہ اقرار کرلیں کہ گلمواز کو ان میں سے کسی ایک نے غائب کیا ہے۔ اگر اب بھی نہ مانیں گے تو اس سے برا حشر کردوں گا۔

''آپ کو اختیار ہے مائی باپ!''۔۔۔ ان میں سے ایک نے کہا۔۔۔ ''آپ بے شک ہمیں جان سے مار دیں لیکن ہم کسی کا گناہ اپنے سر نہیں لیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم چھوٹے موٹے جرائم کرلیتے ہیں لیکن قتل یا راہزنی جیسا بڑا جرم ہم میں سے کوئی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا''۔

دوسرے دو آدمیوں نے بھی اسی قسم کی باتیں کیں۔ میں نے اپنے تجربے کی بنا پر اندازہ لگایا کہ یہ لوگ جھوٹ نہیں بول رہے۔ جرائم پیشہ لوگوں کا جھوٹ بولنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے اور وہ بات بات پر جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ مجھے ان سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ میں نے انہیں ڈرا دھمکا کر جانے دیا اور کہا کہ وہ اپنے طور پر ان واردات کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے رہیں''۔

ان کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ تفتیش ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی۔ میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ اب میرا دھیان پھر رانجھا کی اس بات میں اٹک گیا تھا کہ گلمواز عورتوں سے دوستیاں لگانے کا شوقین تھا اور ہوسکتا ہے اسی چکر میں مارا گیا ہو۔

میں نے اس پہلو سے بھی کام کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اے ایس آئی رشید الدین کو سمجھایا کہ وہ ڈیرہ گنجا میں گھوم پھر کر گلمواز کے متعلق معلومات حاصل کرے اور یہ معلوم کرے کہ اس کی کسی لڑکی کے ساتھ درپردہ دوستی تھی۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔

رشید الدین تجربہ کار اے ایس آئی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کس قسم کی معلومات چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں کل تک میرے مطلب کی معلومات حاصل کر کے لے آئے گا۔ اے ایس آئی چلا گیا اور میں اس کیس کے تانے بانے میں الجھ گیا۔

میں نے لاپتہ گلمواز کے متعلق جو اشتہار شور وغوغا جاری کیا تھا، اس کے جواب میں ابھی تک کسی علاقے سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ اس کے علاوہ بھی میں نے اپنے مخبر چھوڑ رکھے تھے جو گلمواز کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ابھی تک کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ شام ہو رہی تھی اس لیے میں نے باقی کارروائی اگلے دن پر چھوڑ دی۔

دوسرے دن کا سورج حسب معمول آگ برساتا ہوا طلوع ہوا۔ تیز دھوپ سے ریت تپنے لگی اور دن کے آغاز میں ہی گرمی نے زور پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر بعد اے ایس آئی رشید الدین میرے پاس آ گیا۔ وہ میری مطلوبہ معلومات لے آیا تھا۔ اس نے مجھے جو کچھ بتایا، اس نے میرے لیے تفتیش کا ایک رخ متعین کر دیا۔ اس نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق گلمواز کے متعلق رانجھا نے جو کچھ بتایا تھا، وہ غلط نکلا۔ گلمواز کے ہمسائیوں اور دوستوں وغیرہ نے بتایا کہ وہ ایک شریف آدمی تھا اور دوسروں کی ماں بہن کو اپنی ماں بہن سمجھتا تھا۔ اس کے متعلق یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے کبھی کسی عورت کے ساتھ دوستی نہیں کی۔ اس کی شادی بھی اس کے والدین کی پسند سے ہوئی تھی۔

یہ رپورٹ سن کر مجھے محسوس ہوا کہ رانجھا نے تفتیش سے بھٹکانے کے لیے مجھے غلط رخ پر ڈالا تھا۔ مجھے اس کی مکاری پر بڑا غصہ آیا اور میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ رانجھا کو میرے پاس لے آئے۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اصل ملزم رانجھا اور اس کے بھائی ہیں۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ ان کی ہڈیاں توڑوں گا۔ میں غصے سے ٹہلنے لگا۔

میں ٹہل رہا تھا کہ میرا ایک مخبر آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک غریب سا آدمی تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے جو بات مجھے سنائی، اسے سن کر مجھے یوں لگا کہ سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے میں مایوسی کے اندھیروں میں بھٹک رہا تھا۔ اس اندھیرے میں یوں لگا جیسے روشنی چمک اٹھی ہو۔ اس مخبر نے بتایا کہ یہ شخص موضع گروٹ کا رہنے والا ہے جو دریائے جہلم کے کنارے ہے۔ یہ بھنگ پینے کا شوقین ہے اور وہاں ایک قبرستان میں ملنگ کے پاس جا کر روزانہ بھنگ پیتا ہے۔ وہاں چند اور بھی بھنگ پینے کے شوقین آ جاتے ہیں۔

ملنگ نے قبرستان کے اندر ہی ایک جھگی بنا رکھی تھی اور دن رات وہیں رہتا تھا۔ اس کا کام قبروں کی حفاظت کرنا تھا اس کے علاوہ وہ گورکن بھی تھا۔ یہ ملنگ ہر وقت لال رنگ کا لمبا سا لبادہ پہنے رہتا تھا اور لوگوں میں لال بابا کے نام سے مشہور تھا۔ ایک روز ملنگ نے بھنگ کے

نشے میں بتایا کہ کچھ دن پہلے رات کو یہاں کچھ لوگوں نے ایک جگہ گڑھا کھود کر ایک لاش دبائی تھی اور مٹی ڈال کر چلے گئے تھے۔ ملنگ انہیں پہچان نہ سکا تھا۔

یہ آدمی جو میرے مخبر کے ساتھ تھا، ایک سرکاری محکمے میں چپڑاسی تھا اور معمولی پڑھا لکھا تھا۔ اس کو اشتہار شور وغوغا کے ذریعے معلوم ہوا کہ دو ماہ سے ایک آدمی لاپتہ ہے جس کے متعلق شبہ ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ اس آدمی کو ملنگ والی بات یاد آ گئی اور اس نے اپنے دوست سے اس کا ذکر کیا۔ وہ یہ باتیں ایک دکان پر کھڑے ہو کر رہے تھے جہاں میرا مخبر بھی کھڑا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میرے مخبر کے کانوں میں یہ بات پڑ گئی۔ وہ اس آدمی سے ملا اور معلومات لے کر اسے میرے پاس لے آیا۔

میں نے اس آدمی سے اپنے مطلب کی باتیں پوچھیں۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ قبرستان میں دفن کی جانے والی لاش گلمواز کی ہی ہے۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ ملنگ کو بلا کر اس سے مزید پوچھ گچھ کروں۔ میں نے اس آدمی سے کہا کہ وہ میرے ساتھ ہونے والی باتیں کسی کو نہ بتائے۔ یہ کہہ کر میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد میں نے اے ایس آئی کو بلا کر کہا کہ وہ ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے جائے اور موضع گروٹ کے قبرستان میں ایک ملنگ لال بابا کو میرے پاس لے آئے۔ میں نے اسے یہ بھی سمجھایا کہ اسے پیار محبت سے لے کر آئے۔

اے ایس آئی اسی وقت چلا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اے ایس آئی ملنگ کو لے کر آ گیا۔ یہ ایک صحت مند آدمی تھا جس کے لمبے لمبے بال اس کے شانوں پر پڑے ہوئے تھے۔ اس کی داڑھی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھی اور مونچھیں بل کھاتی ہوئی داڑھی میں گم ہو گئی تھیں۔ بھنگ کے نشے سے اس کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے منکوں کے ہار تھے اور ہاتھوں میں بہت سی انگوٹھیاں پہنے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا پکڑ رکھا تھا جس پر مختلف رنگوں سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی ایک نعرۂ مستانہ لگایا۔ ”علی...... حیدر...... تھانیدار بادشاہ دی خیر!“

میں نے اس سے لاش کو قبرستان میں دبانے والی بات پوچھی تو اس نے تفصیل سے بتایا کہ آج سے دو ماہ پہلے کچھ لوگوں نے رات کے وقت وہاں لاش دبائی تھی لیکن ملنگ انہیں دیکھ نہ

سکا۔اس نے انہیں للکارا بھی تھا لیکن وہ بھاگ گئے تھے۔

ملنگ نے وہاں جا کر دیکھا جہاں وہ لوگ کھڑے تھے۔وہاں تازہ کھدی ہوئی مٹی نظر آ رہی تھی۔ملنگ خود گورکن تھا،اس لیے اس نے بلا جھجک ہاں سے مٹی نکالنی شروع کر دی۔اس کا خیال تھا شاید یہ ڈاکو تھے اور لوٹ کا مال وہاں چھپانے آئے تھے۔تھوڑی گہرائی میں جا کر اسے محسوس ہوا کہ مٹی میں کوئی انسانی جسم ہے۔اندھیرے کی وجہ سے ٹھیک نظر نہیں آ رہا تھا۔وہ اپنی جھگی میں گیا اور لالٹین لے آیا۔لالٹین کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ گڑھے میں ایک جوان آدمی کی لاش پڑی ہے جس کے سارے کپڑے خون سے لتھڑے ہوئے تھے اور چہرہ بھی خون آلود تھا۔

اس نے گھبرا کر جلدی جلدی مٹی گڑھے میں ڈالی اور زمین کی سطح برابر کر دی۔وہ ڈر گیا تھا کہ اس قتل میں وہ نہ پھنس جائے۔

''تم اس جگہ کی نشاندہی کر سکتے ہو؟''___ میں نے ملنگ سے پوچھا۔

''ہاں تھانیدار جی!''___ ملنگ نے کہا___ ''وہ جگہ میں کبھی بھی نہیں بھول سکتا''۔

میں نے اس ملنگ کے ساتھ مل کر ایک ڈرامہ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ملنگ نے کہا تھا کہ وہ ان لوگوں کو پہچان نہیں سکا تھا۔اگر میں وہاں سے خود لاش برآمد کر لیتا اور بعد میں رانجھا اور اس کے بھائیوں سے اقبال جرم کرنے کے لیے کہتا تو انہوں نے صاف انکار کر دینا تھا۔میں چاہتا تھا کہ وہ خود وہاں سے لاش برآمد کرائیں۔اس کے لیے میں نے ملنگ کو اس کا کردار اچھی طرح سمجھایا اور اسے انعام کا لالچ بھی دیا۔اس نے اپنا سبق بڑی اچھی طرح یاد کر لیا۔

یہ ضروری نہ تھا کہ گروٹ کے قبرستان میں گلمواز کی لاش ہی دفن ہوتی۔وہ کسی اور کی لاش بھی ہو سکتی تھی۔میں نے داؤ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔میں نے ملنگ کو شربت پلوایا اور اسے ساتھ والے کمرے میں بٹھا دیا اور اسے سمجھا دیا کہ اسے کب اندر آنا ہے۔اس کے بعد میں نے ملزمان رانجھا،رمضو اور دتو کو اپنے پاس بلا کر ان سے تفتیش شروع کر دی۔انہوں نے پہلے کی طرح جرم سے انکار کیا۔

''خود اقبال جرم کر لو گے تو فائدے میں رہو گے''___ میں نے ملزموں سے کہا___

''میرے پاس مکمل ثبوت اور موقعہ کا گواہ بھی ہے اس نے تمہیں اپنی آنکھوں سے گلمواز کی لاش دفن کرتے دیکھا ہے''۔

یہ کہتے ہوئے میں نے ان تینوں کے چہروں پر نظریں گاڑے رکھیں۔میں نے صاف محسوس کیا کہ میری بات سن کر وہ ذرا سے چونکے لیکن پھر اپنے تاثرات پر کنٹرول کر لیا۔میں سمجھ گیا کہ میرا ہوا میں چھوڑا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے۔میں نے رانجھا کو گریبان سے پکڑ کر الگ کر لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں وہ گھبرا گیا۔

''گروٹ کے قبرستان میں کس کو دبایا تھا؟''___ میں نے دھیمی مگر قہر زدہ آواز میں پوچھا۔میں نے آواز اتنی دھیمی رکھی کہ دتو اور رمضو نہ سن سکیں۔

میں نے دیکھا میری بات سن کر ایک دم رانجھا کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔اس کی حالت خراب ہونے لگی۔اسی وقت میں نے ملنگ کو طے شدہ اشارہ دے دیا۔میرا اشارہ پاتے ہیں ملنگ نعرے مارتا ہوا اندر آ گیا اور رانجھا کے ارد گرد ناچنے لگا۔اس نے ناچتے ناچتے رک کر اپنا موٹا سا ڈنڈا رانجھا کی طرف کیا۔

''آخر پکڑ گئے نا!''___ ملنگ نے لال انگارہ آنکھوں سے گھور کر رانجھا سے کہا___

''کب تک بھاگو گے؟''

یہ کہہ کر ملنگ پھر اچھل کود کرنے لگا۔اس کے ہاتھوں میں پہنے کڑے اور گلے میں منکوں کے ہار وغیرہ مل کر چھنکنے لگے اور ایک عجیب سا سماں بندھ گیا۔رانجھا کوئی پختہ کار مجرم نہیں تھا، اس لیے اس کی حالت ایسی بری ہو گئی کہ جیسے اب گرا کہ تب گرا۔میں نے ملنگ کو روکا نہیں۔میں نے دتو اور رمضو کی طرف دیکھا تو وہ بھی پریشان نظر آ رہے تھے۔ان کو علم ہو گیا تھا کہ اب ان کا بھید کھل چکا ہے۔

''اللہ کا واسطہ دیتا ہوں تھانیدار جی!''___ رانجھا نے تقریباً روتے ہوئے کہا___ ''اس کو روک دیں''۔

یہ کہہ کر رانجھا اپنا سر پکڑ کر زمین پر یوں بیٹھ گیا جیسے گر پڑا ہو۔میں نے ملنگ کو ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا۔ملنگ نے اچھل کود بند کر دی اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔میں نے رانجھا کو دیکھا۔وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔میں نے پانی منگوا کر اس کو پلایا تو اس کے ہوش ٹھکانے آئے۔

میں نے اس سے کہا کہ اب وہ کیا کہتا ہے۔اس نے یوں سر جھکا لیا جیسے اپنے جرم کا اقرار کر رہا ہو۔میں نے تینوں کو اس طرح گھیرا تھا کہ وہ لاش والی جگہ کی نشاندہی کرنے پر تیار

ہو گئے تھے۔ میں نے اسی وقت برآمدگی کی کارروائی کے لیے تیاری کر لی اور نمبردار غلام محمد کے علاوہ ایک اور معزز شخص کو ساتھ لیا۔ میں نے گلمواز کے باپ بخشو کو شناخت کے لیے ساتھ لے لیا۔

نمبردار نے قبر کھودنے کے لیے دو آدمیوں کو بلانا چاہا تو ملنگ لال بابا نے کہا کہ یہ کام وہ خود کر لے گا۔

ہم لوگوں کا یہ قافلہ گروٹ کے قبرستان میں پہنچ گیا۔ قبرستان کے اندر داخل ہوئے تو میں نے رانجھا دتو اور رمضو کو آگے کر دیا کہ وہ نشاندہی کریں۔ وہ آگے آگے چل پڑے اور مختلف جگہ سے مڑتے ہوئے ایک پختہ قبر کے قریب رک گئے۔ اس پختہ قبر کے بائیں طرف کچھ جگہ بالکل ہموار تھی۔ رانجھا نے ہاتھ کے اشارے سے اس جگہ کی طرف اشارہ کیا کہ انہوں نے گلمواز کی لاش کو یہاں دبایا تھا۔

اتنی دیر میں ملنگ اپنی جھگی سے کدال لے آیا تھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا تو اس نے رانجھا کی بتائی ہوئی جگہ پر کھدائی شروع کر دی۔ جب گڑھا تھوڑا گہرا ہو گیا تو میں نے ملنگ سے کہا کہ اب وہ ذرا احتیاط سے مٹی نکالے۔ تھوڑی سی مزید کھدائی کے بعد لاش کے آثار نظر آنے لگے۔ لاش کے کپڑے پہلے نظر آئے۔ اتنی سخت بدبو آ رہی تھی کہ وہاں کھڑا رہنا محال ہو گیا۔ یہ ملنگ کا ہی حوصلہ تھا کہ وہ گڑھے میں کھڑا ہو کر لاش کے اردگرد سے مٹی نکال رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد گلی سڑی لاش پوری طرح سامنے آ گئی۔ لاش کے بازو پر ایک تعویذ بندھا ہوا تھا اور اس کے دائیں بازو میں ایک لوہے کا کڑا تھا۔ لاش کے گلے میں کوڑیوں کا ایک ہار تھا۔ اس قسم کے ہار اس علاقے کے لوگ جسمانی دردوں سے بچنے کے لئے بطور گٹ استعمال کرتے تھے۔ یہ ایک قدآور نوجوان کی لاش تھی۔

میں نے مقتول کے باپ بخشو کو آگے بلایا اور اسے شناخت کے لیے کہا۔ بوڑھے باپ کی حالت بہت بری ہو رہی تھی۔ وہ جب چلا تو اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی گر پڑے گا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو ظالموں نے مار دیا تھا۔ اکلوتے بیٹے کی لاش آنکھوں کے سامنے آنے والی تھی۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا تو اس نے بخشو کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیا۔

میں نے لاش سے اترنے والی اشیاء تعویذ، لوہے کا کڑا اور کوڑیوں کا ہار گڑھے کے باہر

زمین پر رکھوا دیا تھا۔ بوڑھا باپ کبھی لاش کو دیکھتا اور کبھی ان اشیاء کی طرف۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا یا حقیقت سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا جیسے اللہ سے خاموش شکوہ کر رہا ہو۔ یک لخت وہ پھٹ پڑا اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اس کا رونا اس بات کی تصدیق تھی کہ لاش اس کے گمشدہ بیٹے گلمواز کی ہی ہے۔

میں نے لاش کی برآمدگی کے متعلق کاغذی کارروائی کی جو زیر دفعہ 27 شہادت ایکٹ کے تحت تھی۔ اس کے بعد میں نے گواہوں کے دستخط کرائے۔ ملزموں کو پہلے ہی ہتھکڑیاں لگ چکی تھیں۔ میں نے لاش کو پوسٹمارٹم کے لیے بھجوانے کا بندوبست کیا اور ملزموں کو لے کر واپس آ گیا۔

میں نے ملزموں سے بیان لینے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے میں رانجھا کا بیان لیا جو ان میں سب سے بڑا تھا۔ اس نے جو بیان دیا وہ بھی آپ کو اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں۔

گلمواز اور رانجھا کے باپ آپس میں بھائی تھے۔ گلمواز کا باپ چھوٹا تھا اور رانجھا وغیرہ کا باپ بڑا تھا۔ بڑے بھائی کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جبکہ چھوٹے بھائی بخشو کی ایک ہی اولاد تھی۔ رانجھا وغیرہ کا باپ دو سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔ ان کا باپ بڑا فضول خرچ عیاش آدمی تھا۔ اس نے اپنے حصے کی زیادہ تر زمین جائیداد اللے تللوں میں اڑا دی تھی۔ اب اس کی نظر چھوٹے بھائی بخشو کی جائیداد پر لگی ہوئی تھی جس کی ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ پھر اللہ نے اسے ایک بیٹا دیا جو اس کی جائیداد کا وارث تھا۔

رانجھا کے باپ نے کئی مرتبہ بیٹوں کے سامنے اس قسم کی باتیں کی تھیں کہ اگر بخشو کا بیٹا نہ پیدا ہوتا تو کسی طرح اس کی جائیداد پر قبضہ کر لیتے۔ یہ بات رانجھا اور اس کے بھائیوں کے دماغ میں بیٹھ گئی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد انہوں نے حیلوں بہانوں سے اپنے چچا کی کچھ زمین پر قبضہ کر لیا۔ بخشو امن پسند شخص تھا۔ اس نے تھوڑی سی زمین کی پرواہ نہ کی اور چپ رہا۔ اس سے ان بھائیوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ اب انہوں نے گلمواز کو راستے سے ہٹانے کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے۔

اس منصوبہ بندی کے نتیجہ میں انہوں نے سوچ سمجھ کر گلمواز کے ساتھ دوستی پیدا کر لی۔ اب وہ موقع کی تاک میں رہنے لگے۔ ایک روز انہیں پتا لگا کہ گلمواز اپنی ضرورت کے لیے کچھ

اونٹ خریدنے کے لیے جا رہا ہے اور اس کے پاس اچھی خاصی رقم ہوگی۔ ان بھائیوں کی نیت بدل گئی اور انہوں نے یہ پروگرام بنایا کہ اس موقع پر گلمواز کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ ان کو پتہ تھا کہ گلمواز کس راستے سے اونٹ خریدنے کے لیے جائے گا۔

وہ ویران علاقہ تھا۔ مغرب کے بعد ہر طرف اندھیرا اور ویرانی چھا جاتی تھی۔ انہوں نے قصبہ گروٹ سے کچھ پہلے ایک ویران جگہ پر گلمواز کو پکڑ لیا۔ ان کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔ رانجھا نے پہلا وار مقتول کے سر پر کیا۔ وہ لڑکھڑایا تو دوسرے بھائیوں نے اس کی گردن اور کندھوں پر کلہاڑیوں کی بارش کر دی۔ اتنے زیادہ کاری زخموں کی وجہ سے گلمواز فوراً ہی گر پڑا اور لمحوں میں مر گیا۔ رانجھا نے اس کی جیب سے رقم نکال لی اور پھر مل کر اس کی لاش اٹھا کر قبرستان میں لے آئے۔

اندھیرے میں انہوں نے کلہاڑیوں سے گڑھا کھودا اور لاش اس میں ڈال کر مٹی ڈال دی۔ اسی اثناء میں قبرستان کے گورکن ملنگ نے ان کو للکارا مگر وہ وہاں سے فرار ہو گئے۔

اس کے بعد کے واقعات میں پہلے ہی سنا چکا ہوں۔ میں ملزموں کو لے کر جائے واردات پر گیا۔ وہ جگہ دیکھی جہاں انہوں نے گلمواز کو قتل کیا تھا۔ اب وہاں کوئی ایسی نشانی نہیں نظر آ رہی تھی جس سے علم ہوتا کہ یہاں ایک انسان قتل ہوا ہے۔ ایک تو یہ وجہ تھی کہ اس بات کو دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس دوران کئی مرتبہ بارش ہو چکی تھی۔ اس وجہ سے مجھے خون آلود مٹی بھی نہ مل سکی۔

اس دوران پوسٹمارٹم رپورٹ بھی آ گئی۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ سر پر اور گردن اور کندھوں پر کلہاڑیوں یا کسی تیز دھار آلے کے زخم موت کا باعث بنے ہیں۔ میں نے یہ رپورٹ اپنی کاغذی کارروائی کے ساتھ رکھ لی اور نعش بخشو کے حوالے کر دی۔ میں بعد میں خود بھی اس کے گھر افسوس اور فاتحہ خوانی کے لیے گیا تھا۔

رانجھا کے بعد میں نے باری باری رمضو اور دتو کے بیان بھی لیے جو رانجھا کے بیان کی تصدیق کرتے تھے۔ ان بیانات سے یہ بھی پتہ چلا کہ مفرور ہو جانے والے دو بھائی تاجا اور مانی بھی ان کے ساتھ اس واردات میں شامل تھے اور وہ فلاں گاؤں سے مل سکتے ہیں۔ وہاں ان کا ایک دوست رہتا ہے۔

میں نے اے ایس آئی رشید الدین کو کہا کہ وہ دو کانسٹیبل ساتھ لے کر جائے اور فلاں

گاؤں میں فلاں شخص کے گھر سے تاجا اور مانی کو گرفتار کر کے لے آئے۔ میں نے اے ایس آئی اور کانسٹیبلوں سے یہ بھی کہا کہ وہ وردی میں نہ جائیں بلکہ سادہ کپڑوں میں جائیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ان کو پولیس کی آمد کی خبر نہ ہو سکے گی۔

شام تک اے ایس آئی ان دونوں کو بھی گرفتار کر کے لے آیا۔ میں نے ان سے بھی اقبالی بیان لیا یہ بیان دوسرے بھائیوں کے بیانات سے ملتا جلتا تھا۔ اس لیے الگ سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ان کو ساتھ لے کر جائے واردات اور اس گڑھے کی بھی نشاندہی کرائی جہاں انہوں نے لاش چھپائی تھی۔

اس کے بعد میں نے بڑی محنت سے مقدمہ تیار کیا اور چالان تیار کر کے عدالت میں پیش کر دیا۔ موقع کے گواہ کے طور پر میں نے ملنگ کو پیش کیا جس نے بڑی ذہانت سے اپنا بیان دیا۔ یہ مقدمہ تین چار ہفتوں تک چلتا رہا تھا۔ ان دنوں اس مقدمے کی بڑی شہرت ہوئی تھی۔

جج نے پانچوں بھائیوں کو موت کی سزا سنا دی تھی۔ اپیل میں ان کے وکیل نے کچھ ایسے دلائل پیش کئے تھے جن کی وجہ سے ان کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ رانجھا وغیرہ کی بہنوں بھاگ بھری اور عمراں کو عادی مجرم نہ ہونے کی وجہ سے ارادہ قتل میں پر تین تین سال قید کی سزا دی گئی جو اپیل میں بھی برقرار رہی۔ کہانی تو یہاں ختم ہو گئی۔ یہاں میں ایک دلچسپ بات سنانا چاہتا ہوں۔ مقتول گلمواز کا جو بچہ بھڑولے میں ڈال دیا گیا اور قتل ہونے سے بچ گیا تھا، اس کا نام اس کے دادا بخشو نے فتح خاں رکھا تھا۔ قتل کے اس واقعہ کے پچیس یا چھبیس سال بعد، غالباً 1976ء کا واقعہ ہے کہ میں ایف آئی اے کا چارج لینے مٹھہ ٹوانہ گیا۔ ان دنوں ضلع سرگودھا پنڈی ایف آئی اے کے ماتحت ہوتا تھا۔ میں یہاں گزارے ہوئے تھانیداری کے عرصہ کو یاد کر رہا تھا کہ مجھے گلمواز والا کیس یاد آ گیا۔ میں اپنے پرانے تھانے چلا گیا اور اپنا تعارف کرایا۔ میں نے تھانیدار کو یہ کیس سنا کر کہا کہ مقتول گلمواز کا بیٹا فتح خاں تھا، وہ اب کہاں ہے۔

تھانیدار نے بتایا کہ وہ بہت بڑا زمیندار بن چکا ہے اور بڑا زبردست گبھرو جوان ہے۔ اس نے اپنے تایازادوں سے اپنی زمین واپس چھین لی تھی اور سب کو دبا کر رکھا ہوا ہے۔ تھانیدار نے یہ بھی بتایا کہ وہ اکثر تھانے میں آتا رہتا ہے اور آپ کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ وہ آپ سے ملنے کی بڑی خواہش رکھتا ہے۔

میں نے تھانیدار سے کہا میں ضروری فرائض سے فارغ ہو کر پرسوں یہاں آؤں گا۔ وہ فتح خان کو بتا دے۔ میں اپنے سرکاری فرائض سے فارغ ہو کر واپس آیا تو تھانیدار نے فتح خاں کو میری آمد کی اطلاع کر دی۔

فتح خاں ایک جلوس کی صورت میں مجھ سے ملنے آیا اور آتے ہی میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر ادب اور فرماں برداری کا اظہار کیا۔ وہ اپنے باپ گلمواز کی طرح بڑا اکڑیل جوان نکلا تھا۔ وہ میرے لیے ڈھیر سارے تحائف لایا تھا جو میں نے پیار کے ساتھ واپس کر دیئے۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ بھڑولے میں بچ جانے والا بچہ علاقے کا بارعب اور گبھرو جوان بن گیا تھا۔

❊ ❊ ❊

نسلوں کا قرض

قتل ایک لمحے کا پاگل پن ہوتا ہے۔ اس ایک لمحے یا ایک سیکنڈ میں انسان اپنے آپ کو قتل کر سکتا ہے یا کسی اور کو۔ جب یہ لمحہ گزر جاتا ہے تو قاتل کی جو ذہنی حالت ہوتی ہے وہ صرف پولیس والے دیکھتے ہیں۔ اس ایک لمحے کے پیچھے کوئی حادثہ یا واقعہ ہوتا ہے یا کوئی اور ہی ڈرامہ ہوتا ہے جس کے اثرات اندر ہی اندر کام کر رہے ہوتے ہیں۔

قتل کے پیچھے نفسیاتی عوامل بھی ہو سکتے ہیں اور کسی خطے کی روایات بھی۔ کسی بھی تھانیدار سے قتل کی وارداتیں سنیں تو ان میں بعض وارداتیں ایسی ہوں گی جن پر آپ یقین نہیں کریں گے۔ آپ کہیں گے کہ یہ ایک سنسنی خیز کہانی ہے جو اس تھانیدار نے خود ہی گھڑ لی ہے۔ ایسی سچی کہانیاں میرے پاس بھی ہیں۔

ایسی ہی ایک سچی کہانی پیش کر رہا ہوں۔ اس کی بنیاد خاندانی دشمنی تھی جو دونوں خاندانوں کے کئی افراد کی جانیں لے چکی تھی اور یہ لوگ اس دشمنی کو نسل در نسل منتقل کرتے چلے آ رہے تھے۔ بچوں کے پیدا ہوتے ہیں ان کے کانوں میں اس دشمنی کا زہر انڈیلا جاتا تھا۔

یہ واقعہ 1950ء کا ہے۔ ان دنوں میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس ہوا کرتا تھا۔ میری تعیناتی تھانہ صدر گجرات میں تھی۔ تھانے کے ایس ایچ او آغا احمد علی شاہ تھے۔ ان کے متعلق پتہ لگا ہے کہ وہ فوت ہو گئے تھے۔ آغا احمد علی شاہ مرحوم روایتی یا تصوراتی تھانیداروں کی طرح بہت موٹے اور جسیم انسان تھے۔ اپنے بھاری بھرکم تن و توش کے برعکس وہ بڑے کمزور دل کے مالک تھے اور ذرا سی مشکل صورت حال پیش آ جاتی تو ان کے ہاتھ پیر پھول جاتے تھے۔ اس کے باوجود سب لوگوں ان کا لحاظ کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایس پی آغا سعادت علی خان مرحوم ان کا بہت لحاظ کرتے تھے۔

ان دنوں ضلع گجرات کے ایس پی آغا سعادت علی مرحوم تھے۔ وہ موچی دروازہ لاہور

کے رہائشی تھے۔ ڈی ایس پی پیر فردوس علی شاہ مرحوم اٹک کے رہنے والے تھے اور چوہدری عبدالحق مرحوم پراسیکیوٹنگ انسپکٹر تھے۔

ایک روز میں تھانے میں بیٹھا چند پرانی فائلیں دیکھ رہا تھا۔ ایس ایچ او آغا احمد علی بھی موجود تھے۔ اچانک دو دیہاتی آدمی گھبرائے ہوئے تھانے میں آئے۔ ان کے چہرے پر چھائی ہوئی بدحواسی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی قتل کی اطلاع لے کر آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں آج کل کی طرح قتل و غارت نہیں ہوا کرتی تھی۔ جب کبھی قتل کا واقعہ ہو جاتا تو دور دور تک خوف و ہراس پھیل جاتا تھا۔ لوگ کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرتے تھے۔

جو دو دیہاتی گھبرائے ہوئے تھانے میں آئے تھے، میری توقع کے عین مطابق وہ قتل کی واردات کی اطلاع لے کر آئے تھے۔ وہ ایک کے بجائے دوہرے قتل کی اطلاع لے کر آئے تھے۔ یہ دیہاتی ایک گاؤں موسیٰ کمالہ سے آئے تھے۔ انہوں نے بتایا ایک گاؤں کے ایک شخص کالو گوجر کے گھر پہ چند مسلح افراد نے حملہ کر دیا ہے اور اندھا دھند فائرنگ کر رہے ہیں جس سے دو آدمی ہلاک ہو گئے ہیں۔ ابھی وہ دیہاتی پوری تفصیل بھی نہ بتا پائے تھے کہ ایک اور دیہاتی تھانے میں آ گیا۔ اس کا تعلق بھی موسیٰ کمالہ سے تھا۔ اس نے بتایا کہ حملہ آوروں نے کالو گوجر کے گھر بم مار دیا ہے جس سے پانچ چھ افراد مر گئے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ حملہ آور فرار ہو گئے ہیں۔

یہ اطلاع بڑی تشویشناک تھی۔ ہم نے فوری طور پر اس بھیانک واردات کی اطلاع ایس پی آغا سعادت علی اور پیر فردوس شاہ کو کر دی۔ اس کے علاوہ قانونی معاملات میں رہنمائی کے لیے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر چوہدری عبدالحق کو بھی تھانے بلا لیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ پہلی اطلاع پر مقدمہ درج کیا جائے یا دوسری اطلاع پر۔ چوہدری عبدالحق نے رائے دی کہ مقدمہ پہلی اطلاع پر درج کیا جائے۔

اس صورتِ حال کا دلچسپ پہلو کہہ لیں یا افسوسناک پہلو کہہ لیں کہ تھانہ انچارج آغا احمد علی شاہ نے جب واردات میں بم کے استعمال اور چھ سات انسانوں کے قتل ہونے کی اطلاع سنی تو ان کے چھکے چھوٹ گئے اور گھبرا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔ اس پریشان کن صورتِ حال سے بچنے کے لیے انہوں نے روزنامچہ میں روانگی علاقہ تھانہ لکھی اور اپنے گھر میں

اتنے وسیع پیمانے پر قتل و غارت کی وجہ سے افسران بالا بھی خاصے گھبرائے ہوئے تھے، اس پر طرہ یہ کہ علاقہ تھانیدار غائب ہو گیا تھا۔ اس صورتِ حال میں، میں نے ہمت کی اور فوری طور پر چھ کانسٹیبلوں کو مسلح کر کے ساتھ لے کر واردات والے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ گاؤں موسیٰ کمالہ تھانے سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔

جب ایس پی سعادت علی خان کو معلوم ہوا کہ میں صرف چھ کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر موقعہ واردات پر روانہ ہو گیا ہوں تو ان کو پریشانی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حملہ آوروں کی تعداد پانچ چھ بتائی گئی تھی اور وہ اندھا دھند فائرنگ کر رہے اور بموں کے دھماکے بھی ہو رہے تھے۔ ایس پی صاحب نے فوراً ایک مسلح گارد میری مدد کے لیے بھجوا دی۔ اس گارد کے پہنچنے سے میرے حوصلے اور بلند ہو گئے۔

جب میں موسیٰ کمالہ پہنچا تو وہاں قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ ہر طرف سراسیمگی اور وحشت پھیلی ہوئی تھی۔ عورتوں کے بین اور فریاد کرنے کی آوازیں دل دہلا رہی تھیں۔ لوگوں نے بتایا کہ حملہ آور اس قتل و غارت کے بعد فرار ہو گئے ہیں۔ میں کالو گوجر کے گھر جا پہنچا جہاں یہ آگ و خون کا کھیل کھیلا گیا تھا۔ یہ مکان گاؤں کے وسط میں واقع تھا۔ اگرچہ یہ 54 سال پرانی واردات ہے لیکن اب بھی اس بدقسمت گھر کے دھندلے دھندلے نقوش میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

گھر میں داخل ہونے کے لیے ایک بڑا دروازہ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک کھلا صحن تھا جو کچا تھا۔ اس صحن میں مویشی بندھے ہوئے تھے۔ صحن سے آگے رہائشی کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں صحن میں پہنچا تو دیکھا دو بھینسیں گولیاں لگنے سے مری پڑی تھیں۔ ان بھینسوں کے قریب ہی ایک عورت کی لاش پڑی نظر آ رہی تھی ے نے قریب جا کر لاش کا معائنہ کرنا چاہا تو جو منظر نظر آیا، اسے دیکھ کر میرا دل کانپ اٹھا۔

یہ عورت غالباً سات آٹھ ماہ کی حاملہ تھی۔ اس کو گولی ایسے زاویے سے پیٹ پر لگی تھی کہ سامنے سے پیٹ چیرتی ہوئی نکل گئی اور اس کا بچہ باہر نکل کر گر پڑا تھا۔ بعد میں ایک عینی شاہد نے بتایا کہ جس وقت یہ واقعہ ہوا وہ دور سے اپنی چھت پر چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ یہ عورت کالو گوجر کی بیوی تھی اور حملے کے وقت بھینسوں کے لیے چارہ بنا رہی تھی۔ وہ جھکی ہوئی حالت میں بھینسوں کے لیے چارہ بنا رہی تھی جب اسے گولی لگی۔

میں نے بچے کو دیکھا، وہ اس ظالم دنیا میں آتے ہی مر گیا تھا اور خون اور گوبر میں لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس چشم دید گواہ کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ میں آگے کمروں کی طرف چلا گیا۔ یہ مکان کسی جنگ زدہ علاقے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ایک کمرے میں گھر کے سربراہ کالو گجر کی لاش پڑی تھی جبکہ اس کے ساتھ والا کمرہ میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ تباہی اسی کمرے میں نظر آ رہی تھی۔

اس کمرے میں چار لاشیں پڑی تھیں۔ لاشوں کی بری حالت تھی۔ میں نے کمرے کا معائنہ کیا تو انکشاف ہوا کہ یہاں ہینڈ گرینیڈ پھینکا گیا ہے۔ ہینڈ گرینیڈ کے دھماکے کو دیہاتی لوگ بم کا دھماکہ کہہ رہے تھے۔ میں نے کمرے میں پھیلے ہوئے گرینیڈ کے ٹکڑے اکٹھے کیے اور انہیں ایک لفافے میں ڈال لیا۔ یہ میں نے معائنے کے لیے لاہور بھیجنے تھے۔

اس کمرے میں ملنے والی لاشوں میں دو نوجوان لڑکے تھے، ایک جواں عمر عورت اور ایک سات آٹھ سالہ بچہ تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ دونوں لڑکے کالو گوجر کے بیٹے تھے، عورت بڑے لڑکے کی بیوی تھی اور سات آٹھ سال کا بچہ ان کا بیٹا تھا۔ ہینڈ گرینیڈ نے پھٹ کر کمرے میں خاصی تباہی مچائی تھی۔

میں نے اس چشم دید گواہ کی زبانی اپنی رپورٹ لکھی اور لاشوں کا نقشہ صورتِ حال و مضروبی مرتب کیا اور لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کا بندوبست کیا۔ نومولود بچے کو ملا کر سات افراد قتل ہوئے تھے۔ اس وسیع پیمانے پر قتل و غارت سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ انتقامی واردات ہے اور کسی پرانی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ لاشیں بھجوانے کے ساتھ ہی میں نے اسی وقت ہینڈ گرینیڈ کے ٹکڑے لاہور Forensic لیبارٹری میں چیک کرنے کے لیے بھجوا دیے۔

یہاں میں اس لیبارٹری کے متعلق یہ وضاحت کر دوں کہ یہ ایک خاص قسم کی لیبارٹری ہوتی ہے جو ہر قسم کا اسلحہ چیک کر سکتی ہے۔ یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ جائے واردات یا مقتول کے جسم سے ملنے والی گولی کس رائفل یا پستول وغیرہ سے چلائی گئی ہے۔ اس لیبارٹری نے ہینڈ گرینیڈ کے متعلق بتایا کہ یہ مقامی ساخت کا نہیں تھا بلکہ ولایتی گرینیڈ تھا۔ اس قسم کے گرینیڈ کا قاتلوں کے پاس پایا جانا خاصی حیران کن بات تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے گرینیڈ صرف فوج کے پاس ہوتے تھے اور کسی عام شہری کے پاس ہونا ممکن نہیں تھا۔

بہرحال ان کاموں سے فارغ ہو کر میں نے چشم دید گواہ اور گاؤں کے لوگوں سے بیان

لینے شروع کر دیے۔ ان بیانات کی روشنی میں جو بات سامنے آئی وہ میں مختصراً آپ کو سنا دیتا ہوں۔

حملہ آوروں کا سرغنہ جہانداد گوجر بتایا گیا تھا۔ وقوعہ والے دن جہانداد عرف جہانا گوجر اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ مسلح ہو کر گاؤں میں آیا اور سیدھا کالو کے مکان پر جا کر دھاوا بول دیا۔ اس نے بڑے دروازے اور مکان کے اردگرد اپنے ساتھیوں کو پھیلا دیا۔ اس وقت کالو کی حاملہ بیوی بھینسوں کے لیے چارہ تیار کر رہی تھی۔ جہانا نے دروازے سے اس پر فائر کیا جو اس کا پیٹ چیر گیا اور پہلے اس کا بچہ پیٹ سے نکل کر گرا پھر وہ بھی گر پڑی۔ اس کے ساتھیوں نے بھی فائرنگ کی جس سے بھینسیں زخمی ہو کر تڑپنے لگیں۔

فائرنگ کی آواز سن کر کالو نے سب اہل خانہ کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور کہا کہ اندر سے دروازہ بند کر لیں۔ خود وہ بڑا دروازہ بند کرنے کے لیے بھاگا لیکن اسی وقت ایک گولی اس کے بازو پر لگی۔ وہ جان بچانے کے لیے ساتھ والے کمرے میں طرف بھاگا۔ اسی اثنا میں اسے دو گولیاں اور لگیں جو بعد میں جان لیوا ثابت ہوئیں۔ وہ کمرے کے اندر جا گرا اور پھر وہیں مر گیا۔ لوگوں نے بتایا کہ کالو کے پاس خاصا اسلحہ تھا مگر اسے اتنی مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ وہ اسلحہ نکال کر حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکتا۔ حملہ آور پوری منصوبہ بندی کر کے آئے تھے۔

کالو گوجر کے مرنے کے بعد جہانا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ اس زمانے میں کمروں کی چھتوں میں ہوا اور روشنی کے لیے سوراخ رکھے جاتے تھے۔ جب بارش آتی تھی تو ان کو کسی چیز سے ڈھانپ دیا جاتا تھا۔ جس کمرے میں کالو کے لڑکے اور بہو اور ایک پوتا چھپا ہوا تھا۔ اس کی چھت پر بھی ایسا ہی ایک سوراخ تھا۔ اس سوراخ کو پنجابی میں غالباً مگ کہتے ہیں۔ جہانا نے اس سوراخ کے راستے کمرے میں ایک ہینڈ گرینیڈ پھینک دیا۔

جب ہینڈ گرینیڈ پھٹا تو اس کے ٹکڑوں نے اندر موجود انسانوں کے جسموں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس کے علاوہ یہ ٹکڑے کمرے میں جہاں جہاں لگے، تباہی مچا دی۔ خاص طور پر لاشوں کا تو بہت برا حال تھا۔

لوگوں نے بتایا کہ کالو گوجر اور جہانداد عرف جہانا کے خاندان میں پرانی دشمنی چلی آ رہی ہے۔ اس دشمنی کی وجہ سے دونوں خاندانوں کے خاصے لوگ مارے جا چکے تھے۔ ان لوگوں میں رواج تھا کہ پولیس میں رپورٹ درج نہیں کراتے تھے بلکہ اپنا بدلہ خود ہی لیتے تھے۔ دو

سال پہلے کالو گوجر نے جہانا کے جوان بھائی کو اس بری طرح قتل کیا تھا کہ کلہاڑی سے اس کا قیمہ بنا دیا تھا۔ جہانداد نے اپنے بھائی کی لاش پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ وہ اس کا ایسا انتقام لے گا کہ کالو کی نسل ختم کر دے گا۔

جب میں نے جہانداد عرف جہانا کے متعلق تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ جہانا پولیس میں کانسٹیبل ہے اور راولپنڈی میں تعینات ہے۔ میں نے موقع پر جو بھی ضروری کارروائیاں کرنی تھیں وہ کر لیں اور تھانے آ گیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی کارگزاری کی رپورٹ اپنے افسران کو پیش کر دی۔

اس واردات نے جہاں پولیس کے احکام بالا میں کھلبلی مچا دی وہاں پنجاب بھر میں سنسنی بھی پھیل گئی۔ یہ اس وقت کا بہت بڑا واقعہ تھا جس میں بیک وقت سات افراد قتل ہو گئے تھے اور یہ بھی پہلا موقع تھا کہ کسی واردات میں ہینڈ گرینیڈ استعمال ہوا تھا۔ اس وجہ سے تفتیش بہت اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ پولیس کے بڑے بڑے افسروں نے باری باری خود جا کر موقعہ کا معائنہ کیا۔ میرے لیے یہ تفتیش ایک کڑا امتحان تھا اور میں نے اپنے آپ کو اس امتحان کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی جس میں لکھا تھا کہ کالو گوجر اور اس کی بیوی گولیاں لگنے اور باقی افراد گرینیڈ کے ٹکڑے لگنے سے شدید زخمی ہونے اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے تھے۔

میں نے اپنی تفتیش کا آغاز راولپنڈی پولیس سے کیا جہاں ملزم جہانا کانسٹیبل تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ ملزم جہانا تقریباً بیس بائیس روز سے سرکاری رائفل سمیت لاپتہ ہے۔ وہاں کی پولیس کو بھی اس کی تلاش تھی۔ میں نے پولیس میں اس کے ساتھیوں سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن کام کی کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ میری کوشش تھی کہ اگر جہانا نہیں ملتا تو کم از کم اس کے کسی ساتھی کا سراغ ہی مل جائے۔ میں راولپنڈی سے ناکام واپس آ گیا۔

ملزم جہانا گجرات ہی کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس گاؤں کا نام اب اتنے عرصے بعد مجھے یاد نہیں رہا۔ یہ گاؤں ہمارے علاقے کے تھانے سے چار پانچ میل دور تھا۔ میں نے تفتیش کا دائرہ کار بڑھا کر ارد گرد کے علاقوں تک پھیلا دیا تھا اور ہر جگہ اپنے تجربہ کار مخبر پھیلا رکھے تھے۔ جہانا کے گاؤں میں اس کے گھر کی نگرانی خاص طور پر ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ

میرے مخبر جہانا اور اس کے دوستوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہے تھے۔

میں نے ملزم جہانا کے گھر جا کر پوچھ گچھ کا فیصلہ کر لیا اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر وہاں جا پہنچا۔ جہانا کے گھر میں کوئی جوان مرد نہیں تھا۔ صرف بوڑھا باپ تھا، ماں مر چکی تھی اور ایک چھوٹا بھائی جو جوان تھا، اس خونی دشمنی کی وجہ سے کالو گوجر کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ باپ کے علاوہ جہانا کی بیوی تھی اور دو بچے تھے جو ابھی چھوٹے تھے۔

میں نے جہانا کے بوڑھے باپ اور اس کی بیوی سے جہانا کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ایک مہینہ ہو گیا ہے، وہ گھر نہیں آیا۔ آخری مرتبہ وہ پچھلے مہینے آیا تھا اور وہ گھر خرچہ وغیرہ دے کر چلا گیا تھا۔ میں نے دونوں سے بہت سوال پوچھے اور خاصی مغز ماری کی لیکن مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں نے جہانا کے بوڑھے باپ سے جب یہ کہا کہ اسے احساس ہے کہ اس کے بیٹے نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے اور سات جیتے جاگتے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

"جہانا نے میرے کلیجے میں ٹھنڈ ڈال دی ہے"۔۔۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔۔۔ "مجھے اس پر فخر ہے...... وہ میرا شیر بچہ ہے"۔

"شیر بچے نے جو کچھ کیا ہے"۔۔۔ میں نے غصے سے کہا۔۔۔ "اس کے بعد وہ خود بھی زندہ نہیں بچ سکے گا"۔

"کوئی پرواہ نہیں"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "اس نے دشمن کی نسل ختم کر کے برادری میں میرا نام اونچا کر دیا ہے۔ اگر جہانا مر بھی گیا تو اس کے بیٹے سے میری نسل آگے چلتی رہے گی"۔

مجھے اس پر بڑا غصہ آیا۔ وہ اس بات پر فخر کر رہا تھا کہ اس کے بیٹے نے اتنے زیادہ انسانوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ اسے اپنے جوان بیٹے کے پھانسی پا جانے کا کوئی غم نہ تھا۔ میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آ گیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے مخبروں کو طلب کر لیا اور ان سے رپورٹ مانگی۔ یہ دو آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی اپنی رپورٹ سنائی۔ اس سے مجھے کافی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔

انہوں نے بتایا کہ واردات کے بعد سے جہانا گاؤں میں نہیں دیکھا گیا۔ واردات سے کچھ عرصہ پہلے اس کا اٹھنا بیٹھنا جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ہو گیا تھا۔ ان میں سے دو آدمی اسی گاؤں کے تھے جن میں سے ایک کا نام طفیل ماچھی دوسرے کا سیف تھا۔ یہ دونوں پکے جرائم

پیشہ ور واردات تھے۔ پتہ چلا کہ واردات کے بعد سے یہ دونوں بھی گاؤں سے غائب ہیں۔

میں نے دونوں مخبروں سے کہا کہ وہ دن رات ان دونوں کے گھروں پر نظر رکھیں اور ان دونوں میں سے جونہی کوئی اپنے گھر یا علاقے میں نظر آئے اسی وقت مجھے اطلاع بھجوائی جائے۔ میں نے بڑی سختی سے کہا کہ رات کا کوئی بھی وقت ہو، بلا جھجک مجھے جگا لیا جائے۔ ایک آدمی مطلوبہ آدمی پر نظر رکھے اور دوسرا مجھے اطلاع دینے آ جائے۔

ان مخبروں کو اچھی طرح سمجھا کر میں وہاں سے تھانے آ گیا۔ میں نے اپنے افسران بالا کو اپنی کارگزاری سے آگاہ کیا اور امید دلائی کہ جلد ہی میں ملزموں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

یہ کوئی ایسا کیس نہیں تھا جس میں سراغرسانی کر کے قاتل کو ڈھونڈنا پڑتا۔ اس کیس میں یہ معلوم تھا کہ واردات کس نے کی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ مجرم پوری طرح ہوشیار ہے اور اس کی پوری کوشش ہو گی کہ وہ پولیس کے ہاتھ نہ آئے۔ میری کامیابی کی ایک ہی صورت تھی کہ جہانا کے ساتھیوں میں سے کسی ایک کا سراغ مل جائے تو پھر اس کے ذریعے میں جہانا کی شہ رگ تک پہنچ سکتا تھا۔ مجھے اب بڑی بے چینی سے مخبروں کی طرف سے کسی خبر کا انتظار تھا۔

اس دوران مجھے جہاں بھی شک ہوا کہ جہانا وہاں مل سکتا ہے، میں نے چھاپے مارے مگر ناکامی رہی۔ اس سے اگلی رات کا ذکر ہے، میں تھانے سے ملحقہ اپنے کوارٹر میں بیٹھا اس کیس کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ اس وقت رات کے 9 بجے کا وقت ہو گا جب تھانے سے ایک کانسٹیبل نے آ کر بتایا کہ میرے دونوں مخبروں میں سے ایک آیا ہے۔ میں یہ سنتے ہی فوراً اٹھا اور سادہ لباس میں ہی تھانے جا پہنچا۔

اس مخبر نے بتایا کہ ملزم جہانا کا ساتھی طیفا عرف طیفا ماچھی رات کے اندھیرے میں اپنے گھر آیا ہوا ہے۔ میں نے فوراً چار کانسٹیبلوں کو مسلح ہونے کو کہا اور اپنا سرکاری ریوالور لے کر اسی وقت سادہ لباس میں ہی مخبر کے ساتھ چل پڑا۔ میں ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

رات کے اندھیرے میں ہم لوگ گاؤں پہنچ گئے۔ دیہات میں تو ویسے ہی شام سات بجے آدھی رات کا سماں بن جاتا ہے۔ یہ 1950ء کی بات ہے جب آبادی کم بھی تھی اور دور دور بھی تھی اور بجلی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی جنگل میں آ گئے ہوں۔ سارا گاؤں بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔ کبھی کبھار کسی کتے کے بھونکنے کی آواز رات کے سناٹے کو مجروح کر

رہی تھی۔

میرا مخبر ہمیں طیفا ماچھی کے گھر کی طرف لے گیا۔ ہم جب گھر کے قریب پہنچے تو اچانک ایک طرف سے اندھیرے میں ایک سایہ ابھرا اور ہماری طرف آنے لگا۔ جب وہ ہمارے قریب آیا تو معلوم ہوا کہ یہ میرا دوسرا مخبر تھا جو چھپ کر مکان کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک منٹ کے لیے بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا اور طیفا ماچھی گھر کے اندر ہی ہے۔

میں نے تین کانسٹیبلوں کو مکان کے اطراف میں پھیلا دیا تاکہ اگر طیفا کسی طرح سے نکلنے کی کوشش کرے تو بھاگ نہ سکے۔ اس کے بعد میں نے ایک مسلح کانسٹیبل کو اپنے ساتھ لیا اور دونوں مخبروں کو اندھیرے میں چھپ جانے کا حکم دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو معلوم ہو کہ ان دونوں نے مخبری کی ہے۔ اس کے بعد میں نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملنے پر میں نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ اب وہ دستک دے۔ کانسٹیبل نے میرا اشارہ پا کر بڑی زوردار دستک دی۔ اس کے جواب میں اندر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک آدمی کھانستا ہوا دروازے کی طرف آنے لگا۔

''کون ہے اوئے!'' ___ اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی ___ ''اتنی رات کو کیا مصیبت آ گئی ہے؟''

میں نے ریوالور نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ پھر کنڈی کھلنے کی آواز آئی اور اندر سے آنے والے نے دروازہ کھولنے سے پہلے دوبارہ پوچھا کہ باہر کون ہے۔ میں نے کہا، باہر پولیس ہے، دروازہ کھولو۔ پولیس کا نام سنتے ہی اس نے دروازہ کھولنے کے بجائے دوبارہ کنڈی لگا دی اور اس کے اندر کی طرف بھاگنے کی آواز رات کے سناٹے میں گونج گئی۔ یہ لمحوں کا کھیل تھا اور میں یہ موقع کسی قیمت پر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کانسٹیبل کو کہا کہ وہ فوراً دیوار پھاند کر اندر جائے اور دروازہ کھول دے۔ کانسٹیبل جواں عمر تھا، اس نے ذرا بھی دیر نہ لگائی اور دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ اس نے اندر سے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی میں بجلی کی سی تیزی سے اندر کی طرف بھاگا۔ کانسٹیبل میرے ساتھ تھا۔ اتنے میں اندر سے ایک لمبا تڑنگا آدمی بھاگتا ہوا نکلا اور ہمیں آتے دیکھ کر صحن کے دائیں طرف بھاگا۔ اس طرف دیوار کے ساتھ مویشیوں کے لیے ایک کھرلی بنی ہوئی تھی جہاں چند بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ بھینسوں کی طرف بھاگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ دیوار پھاند کر بھاگنا چاہتا ہے۔

''رک جاؤ!''۔۔۔ میں نے اسے للکارا۔۔۔ ''ورنہ گولی ماردوں گا''۔

میرے للکارنے پر بھی وہ رکا نہیں اور صحن میں بیٹھی ہوئی بھینسوں کے اوپر سے پھلانگ کر آگے جانے لگا۔ آگے گوبر کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ اس کا اگلا پاؤں گوبر میں پڑا اور وہ پھسل گیا۔ پھر وہ سنبھل نہ سکا اور بہت بری طرح گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ سنبھل کر اٹھتا، میں اور کانسٹیبل اس کے سر پر جا پہنچے۔ میں نے ریوالور کی نال اس کی کھوپڑی سے لگا دی اور وہ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ میں نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ اسے ہتھکڑی لگا دے۔ کانسٹیبل نے اسے ہتھکڑ لگا دی۔ یہ آدمی طیفا ماچھی تھا۔

پولیس کو دیکھ کر اس نے جس طرح بھاگنے کی کوشش کی تھی، اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ جہانا کے ساتھ اس واردات میں شامل تھا۔ شور شرابہ سن کر طیفا ماچھی کے گھر کے دوسرے افراد بھی اٹھ گئے تھے۔ اپنے گھر کے اندر پولیس والوں کو دیکھ کر اور طیفا کو ہتھکڑی لگی دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے۔ دونوں مخبروں نے اسے دیکھ کر اشارے سے اس بات کی تصدیق کر دی کہ یہی طیفا ماچھی ہے۔

میں نے اس کے گھر کی اچھی طرح تلاشی لی۔ ایک چارپائی کے نیچے سنگل بیرل رائفل پڑی ہوئی تھی۔ میں نے یہ رائفل اپنے قبضے میں لینی تھی۔ اس کے لیے میں نے رات کے وقت گاؤں کے نمبردار کو اور ایک دو اور معزز آدمیوں کو جگا کر ان کی موجودگی میں رائفل برآمد کی اور برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کیا۔ اس پر گواہوں کے دستخط کرا لئے۔ اس کے بعد میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر طیفے ماچھی کو پوچھ گچھ کے لیے بٹھا لیا۔ اس کے لیے میں نے نمبردار کی بیٹھک میں عارضی طور پر تھانہ بنا لیا۔

طیفا ماچھی پختہ کار مجرم تھا اس لیے اس نے مجھے چکر دینے کی کوشش شروع کر دی۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اس کے منہ سے سچ اگلوالوں لیکن اس کے انداز سے میں سمجھ گیا کہ یہ لاتوں کا بھوت ہے جو باتوں سے نہیں مانے گا۔ میں نے دو صحت مند کانسٹیبلوں کو اندر بلا کر کہا کہ اس کم بخت پر ذرا سچ کی افادیت ظاہر کریں۔ کانسٹیبل میری بات کا مطلب سمجھ گئے اور انہوں نے طیفا ماچھی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

یہ دونوں کانسٹیبل تھرڈ ڈگری یعنی تشدد کرنے میں ماہر تھے۔ ذرا دیر بعد ہی طیفا چیخیں مارنے لگا۔ جب اس کی چیخ و پکار بلند ہونے لگی تو میں نے اس کے منہ میں ایک کپڑا ٹھونس دیا۔

میں خواہ مخواہ گاؤں والوں کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''جب سچ بولنا چاہو تو ہاتھ سے اشارہ کر دینا''۔۔۔ میں نے طیفا ماچھی سے کہا۔۔۔ ''ورنہ تم مر بھی جاؤ گے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے''۔

میں عام حالات میں تشدد کا قائل نہیں تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ساتھی اس کے واپس نہ پہنچنے پر ہوشیار ہو جائیں۔ اس لیے میں رات کے اندھیرے میں ہی بڑی تیزی سے تمام کارروائی کرنا چاہتا تھا۔

کانسٹیبلوں نے دوبارہ طیفا ماچھی کو تختہ مشق بنا لیا تھا۔ اس کے چہرے سے سخت تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا لیکن منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے وہ چیخ بھی نہیں سکتا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد اس کے پسینے چھوٹ گئے اور پھر بے اختیار وہ ہاتھ سے اشارہ کرنے لگا کہ وہ بیان دینے پر تیار ہے۔ میں کانسٹیبلوں کو ہاتھ سے اشارہ کر کے روکا اور اس کے منہ سے کپڑا نکالنے کو کہا۔ اس کے منہ سے کپڑا نکالا گیا تو وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ ذرا سی دیر میں ہی اس کی بری حالت ہو گئی تھی۔ اس نے پانی مانگا جو اسے پلا دیا گیا۔ اس کے بعد میں اس سے سوال پوچھتا گیا اور وہ جواب دیتا گیا۔

اس نے جو کچھ بتایا وہ مختصراً یوں تھا کہ جہانا گوجر اور اس کے ساتھی واردات کے بعد قریبی جنگل میں جا کر چھپ گئے تھے۔ اس کے ساتھیوں میں طیفا ماچھی کے علاوہ سیف گوجر، عالم اور جیدا شامل تھے۔ طیفا ماچھی نے بتایا کہ ان کے پاس خوراک کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا اور ملزم جہانا نے اسے کھانے پینے کی کچھ چیزیں اور ضرورت کا کچھ سامان لانے کے لیے بھیجا تھا۔ طیفا نے صبح منہ اندھیرے یہ سامان لے کر ان کے پاس پہنچنا تھا۔

میں نے اسی وقت جنگل میں جا کر چھاپہ مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل جاتا تو پھر دوبارہ پتہ نہیں کب ایسا موقع آتا۔ طیفا ماچھی کی رہنمائی میں ہم رات کے اندھیرے میں ملزموں کے ٹھکانے کی طرف چل پڑے۔ طیفا ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔ اسے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی میں نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ اس نے بھاگنے یا دھوکہ دینے کی کوشش کی تو اسے فوراً گولی مار دی جائے گی۔ ویسے بھی ہمارا اور اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔

آبادی ختم ہو گئی تو کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم کھیتوں سے گزرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ ذرا آگے جا کر درختوں کا علاقہ شروع ہو گیا۔ یہاں بالکل ویرانہ تھا۔

جھینگروں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور وقفے وقفے سے گیدڑوں کی ہاؤ ہو بھی سنائی دے جاتی تھی۔ ماحول خاصا خوفناک اور ڈرا دینے والا تھا۔ ہم مسلح ہونے کی وجہ سے بے خوف رات کے اندھیرے میں آگے بڑھتے رہے۔

اچانک مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ طیفا ماچھی ہمیں دھوکہ بھی دے سکتا تھا اور اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر قریبی درختوں یا جھاڑیوں کے جھنڈ میں غائب ہو سکتا تھا۔ دوسرا خطرا یہ تھا کہ جہانا پولیس سے بھاگا ہوا کانسٹیبل تھا اور عام قسم کے جرائم پیشہ افراد سے زیادہ چالاک اور مکار تھا۔ اس کے علاوہ وہ اور اس کے ساتھی مسلح بھی تھے۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں اور زیادہ محتاط ہو گیا اور طیفا ماچھی کے بالکل قریب ہو کر چلنے لگا۔

کانسٹیبلوں کے پاس بڑی ٹارچیں تھیں جو ہمیں سرکاری طور پر ملی ہوئی تھیں۔ میں نے اس ڈر سے ٹارچ جلانے سے منع کر دیا تھا کہ جہانا وغیرہ ہماری آمد سے آگاہ ہو کر ہوشیار ہو جائیں گے۔ ایک جگہ درختوں کا جھنڈ تھا جہاں درخت بہت قریب قریب تھے۔ وہاں مجھے اندھیرے میں کسی جھونپڑی کے خدوخال سے نظر آ رہے تھے۔ اچانک طیفا ماچھی گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگا۔

''بھاگ جاؤ اوئے جہانے! پولیس آ رہی ہے...... بھاگو!'' اس کے ساتھ ہی جھنڈ میں موجود جھونپڑی میں ہلچل سی پیدا ہوئی اور بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے فوراً کانسٹیبلوں کو ٹارچیں روشن کرنے کو کہا تو انہوں نے ٹارچوں کا رخ درختوں کے جھنڈ کی طرف کر دیا۔ روشنی میں چار آدمی بھاگتے نظر آئے۔ میں نے کانسٹیبلوں کو ان کا پیچھا کرنے کو کہا تو وہ بڑی تیز رفتاری سے ان کی طرف بھاگے۔

اچانک میرا دھیان طیفا ماچھی کی طرف چلا گیا۔ وہ اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا جھاڑیوں کی طرف جا رہا تھا۔ اگر مجھے چند لمحے بھی دیر ہو جاتی تو وہ نکل گیا ہوتا۔

''جہاں ہو وہیں رک جاؤ طیفے!'' ـــــ میں نے پستول کا رخ اس کی طرف کر کے کہا ـــــ ''ذرا بھی آگے بڑھے تو بلا تامل گولی مار دوں گا''۔

وہ جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ مجھے اس پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ میں نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنی شلوار اتار دے۔ وہ میرا یہ عجیب حکم سن کر حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں

نے اسے سختی سے شلوار اتارنے کو کہا تو اس نے مجبور ہو کر میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ اس نے لمبی قمیض پہن رکھی تھی اس لیے برہنگی کا مسئلہ نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے اسے کہا کہ وہ اپنی شلوار میری طرف پھینک دے۔ اس نے شلوار میری طرف پھینکی تو میں نے اس میں سے ازار بند کھینچ کر نکال لیا اور اسے حکم دیا کہ وہ منہ کے بل زمین پر لیٹ جائے۔ وہ لیٹ گیا تو میں نے اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف باندھے اور پھر دونوں پاؤں ملا کر کس کر باندھ دیئے۔ اب اس کے بھاگنے کا خطرہ نہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد چاروں کانسٹیبل واپس آ گئے۔ ان کے ساتھ دو ملزم بھی تھے۔ یہ جیدا اور سیف تھے انہوں نے بتایا کہ بھاگنے والوں میں ایک جہانا اور دوسرا عالم تھا۔ وہ درختوں اور اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر غائب ہو گئے تھے۔ ہم تینوں ملزموں کو لے کر تھانے آ گئے۔

میں نے اپنی کارگزاری کی رپورٹ اپنے افسران کو پیش کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور میری خوب حوصلہ افزائی کی۔ دن چڑھتے ہی میں نے دس کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور اسی جنگل میں جا پہنچا جہاں رات کو ملزم جہانا اور عالم چھپ گئے تھے۔ میں نے کانسٹیبلوں کو دور دور پھیل کر آگے بڑھنے کو کہا۔ خود میں بھی ان کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ہم نے دور تک جنگل چھان مارا لیکن کوئی سراغ نہ ملا اور ہم ناکام واپس آ گئے۔

میں نے دوسرے ملزموں سے اقبالی بیان لے کر مقدمہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ ملزم جہانا اور اس کے ساتھی عالم کو میں نے مفرور قرار دے کر اردگرد کے تھانوں میں بھی اطلاع کر دی تھی۔

ایک روز صبح سویرے اطلاع ملی کہ جنگل کے علاقے میں ایک لاش پڑی ہے۔ اطلاع لانے والا ایک لکڑہارا تھا جو جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گیا تھا۔ میں نے فوراً موقعہ پر جا کر کارروائی کی اور لاش کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ لاش کی حالت خاصی بری تھی اور جگہ جگہ سے گیدڑوں اور دوسرے جنگلی جانوروں نے گوشت کھا لیا تھا۔ البتہ لاش کا چہرہ سلامت تھا۔

مجھے شک تھا کہ ہو سکتا ہے یہ لاش مفرور جہانا یا عالم کی ہو۔ میں نے لاش کا نظری معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔ گولی دل کے قریب لگی تھی اور پھیپھڑوں کو چیرتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ بہرحال میں لاش لے کر تھانے آ گیا اور گرفتار شدہ ملزموں کو دکھا کر شناخت کرنے کو کہا۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی شناخت کر لیا۔ یہ مفرور جہانا کی لاش تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جہانا کو کون گولی مار گیا۔ یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ کسی بات پر جہانا اور عالم میں جھگڑا ہو گیا ہوگا اور عالم نے اسے گولی مار دی۔ عالم خود بھاگ گیا۔ بہر حال میں نے پوسٹمارٹم کرانے کے بعد لاش جہانا کے باپ کے حوالے کر دی۔

اپنے ''شیر پتر'' کی لاش دیکھ کر اس پر سکتہ طاری ہو گیا لیکن مجھے اس پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ اس نے جو بویا تھا وہی کاٹ رہا تھا۔ اس کے بعد عالم کو بہت تلاش کیا گیا لیکن وہ نہ مل سکا۔ وہ غالباً کسی دور دراز شہر کی طرف نکل گیا تھا۔

میں نے کیس تیار کر کے مجسٹریٹ کو پیش کر دیا۔ مجھے آج بھی اس کا نام یاد ہے۔ وہ عیسائی تھا اور اس کا نام بہوٹ تھا۔ اس نے تینوں مجرموں کو سزائے موت سنا دی۔ مجرموں کی طرف سیشن کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔ سیشن کورٹ نے بھی ان کی سزائے موت بحال رکھی۔ سیشن جج کا نام غالباً بشیر الدین تھا۔ اس نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا کہ اتنے زیادہ انسانوں کے قتل میں شامل یہ مجرم کسی رعایت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

اس کیس کی کامیاب تفتیش پر مجھے فوری ترقی دے کر سب انسپکٹر بنا دیا گیا اور دوسری طرف مفرور تھانیدار آغا احمد علی شاہ مرحوم کی سخت جواب طلبی ہوئی اور انہیں Sensure کی سزا دی گئی جس کی وجہ سے ان کی ترقی بند کر دی گئی اور تساہل پسندی اور مجرمانہ غفلت کی وجہ سے گندی رپورٹ لکھی گئی۔

ایک خط دو قتل

دوہرے قتل کی ایک تفتیش سنا رہا ہوں۔ یہ سو فیصد سچا واقعہ ہے جو میری سروس کے دوران پیش آیا۔ یہ قیام پاکستان کے فوراً بعد کی بات ہے۔ اگست کا مہینہ گزر گیا تھا اور ستمبر کا آغاز تھا۔ میں ان دنوں گجرات شہر کے تھانے میں بطور ایس ایچ او تعینات تھا۔ ہندوؤں سکھوں کے پاکستان سے ہندوستان ہجرت کر جانے کی وجہ سے بے شمار جگہیں خالی ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے فوری ترقی دے کر چھوٹے تھانیدار سے بڑا تھانیدار بنا دیا گیا تھا۔

اگرچہ زیادہ تر ہندو، سکھ ہندوستان چلے گئے تھے لیکن پھر بھی کہیں کہیں ابھی تک موجود تھے اور اس انتظار میں تھے کہ اپنی زمین جائیداد وغیرہ اچھے داموں فروخت کر کے جائیں گے۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں سکھوں کو پاکستان میں کتنا تحفظ حاصل تھا۔ ہمارے ایس پی خان عبید اللہ خان نے اپنے علاقے کے ہندوؤں اور سکھوں کو خصوصی تحفظ فراہم کرنے کا حکم جاری کر رکھا تھا۔

اس کے برعکس سرحد کے اس پار سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہندو اور سکھ بلوائیوں نے جو وحشیانہ سلوک کیا، وہ نہایت ہی دردناک اور شرمناک ہے۔ تاریخ میں دنیا کی کسی قوم نے آزادی کے لیے جان اور مال کی اتنی بڑی قربانی پیش نہیں کی۔ میں یہاں ایسے واقعات لکھنے سے احتراز کروں گا کیونکہ ''حکایت'' میں ایسے بے شمار واقعات چھپتے رہتے ہیں۔

مجھے اطلاع ملی کہ گجرات کے ایک محلے میں ایک ہندو میاں بیوی ہری چند اور شانتی ابھی تک رہ رہے ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں مزید تفصیل طلب کی تو معلوم ہوا کہ دونوں میاں بیوی ادھیڑ عمر ہیں اور خاصے خوشحال ہیں۔ ان کا خاصا بڑا دو منزلہ مکان ہے جسے وہ بیچ کر جانا چاہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بے اولاد ہیں۔

ان دنوں میں بہت سے ہندوؤں سکھوں نے ایسا ہی کیا تھا کہ بڑے اطمینان سے اپنی زمین جائیداد بیچ کر رقم وصول کر کے ہندوستان چلے گئے تھے۔ یہ ہندو جوڑا بھی اسی چکر میں یہاں رکا ہوا تھا۔

ایس پی صاحب کے آرڈر کے مطابق اس ہندو جوڑے کی حفاظت میری ذمہ داری تھی۔ میں نے ان کی مستقل نگرانی کے لیے ایک کانسٹیبل رحمت خان کو تعینات کر دیا۔ ایک بہشتی کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ ان کو پانی فراہم کر دیا کرے، اس کے علاوہ ایک بھنگی اروڑہ مسیح صفائی ستھرائی کا کام کرتا تھا۔

یہ تمام اقدامات میں نے اس ہندو جوڑے کی حفاظت کی نقطۂ نظر سے کئے تھے۔ کانسٹیبل ان کو بازار سے سودا سلف لا دیتا تھا۔ ویسے تو ان ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا لیکن چونکہ یہ ایس پی کا حکم تھا۔ اس لیے میں نے یہ اقدامات کئے تھے تاکہ کل کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو مجھ سے جواب طلبی ہوگی۔

ایک روز کانسٹیبل رحمت خان حسب معمول صبح سویرے اس ہندو جوڑے کے مکان پر گیا تاکہ ان سے ضروریات کے بارے میں پوچھ کر بازار سے سودا لا دے۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا مگر اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے بار بار دستک دی مگر اندر سے کسی نے دروازہ کھولا اور نہ ہی کوئی آواز آئی۔ جب خاصی دیر تک اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو رحمت خان کو تشویش ہوئی اور وہ فوراً واپس تھانے میں آ گیا۔ اس نے تمام صورتحال میرے سامنے کہہ دی۔ یہ سن کر مجھے بھی یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی گڑ بڑ ہے۔

میں اسی وقت ایک ہیڈ کانسٹیبل رشید بٹ کو ساتھ لے کر ہری چند کے مکان کی طرف چل پڑا۔ ہیڈ کانسٹیبل رشید بٹ بڑا ہی تجربہ کار ملازم تھا۔ اس کا ذہن فطرتی طور پر تفتیشی معاملات میں بڑا تیز کام کرتا تھا۔

ہری چند کے مکان پر پہنچ کر میں نے ہیڈ کانسٹیبل رشید بٹ سے کہا کہ وہ پورے زور سے دروازہ پر دستک دے۔ رشید بٹ نے لکڑی کے دروازے پر اس انداز سے دستک دی کہ اردگرد کے ایک دو گھروں کے دروازے کھل گئے اور وہ لوگ پولیس کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ میں نے کانسٹیبل رحمت سے کہا کہ وہ دیوار پھاند کر اندر جائے اور دروازہ کھول دے۔ رشید بٹ نے کانسٹیبل کو دیوار پر چڑھنے میں مدد دی اور کانسٹیبل مکان کے اندر اتر گیا۔ چند لمحوں بعد

اس نے اندر سے دروازہ کھول دیا۔

میں رشید بٹ کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔ میں نے کانسٹیبل رحمت سے کہا کہ وہ دروازے پر ہی کھڑا رہے اور کسی کو اندر نہ آنے دے اور اندر سے کوئی باہر نکلنا چاہئے تو اسے پکڑ لے۔ یہ دو منزلہ مکان تھا۔ کانسٹیبل رحمت نے بتایا تھا کہ نیچے والا حصہ خالی رہتا ہے اور دونوں میاں بیوی ہری چند اور شانتی بالائی منزل پر سوتے ہیں۔ میں نے پھر بھی احتیاطاً نچلے حصے کی اچھی طرح تلاشی لی مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ صرف دو ٹوٹی پھوٹی چار پائیاں اور بیکار سا سامان پڑا ہوا تھا۔ غالباً ہری چند نے اچھا اور کار آمد سامان بیچ دیا ہوگا۔

مکان کے بائیں جانب برآمدہ سا بنا ہوا تھا۔ اس برآمدے کے ساتھ ہی ایک سیڑھی اوپر کو جا رہی تھی۔ یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ مکان بڑا تنگ اور گھٹن زدہ سا تھا۔ ہندوؤں کا طرزِ تعمیر ہی ایسا ہے، بالکل ہندووانہ ذہنیت کی طرح۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے مکان کھلے ہوادار اور کشادہ ہوتے ہیں۔

میں اور رشید بٹ سیڑھی چڑھ کر اوپر چلے گئے۔ اوپر والا حصہ قدرے صاف تھا۔ یہاں دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں کچھ گھریلو ضرورت کا سامان تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹا سا باورچی خانہ بنا ہوا تھا جسے ہندو رسوئی کہتے ہیں۔ دوسرا کمرہ بیڈروم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ہم جب بیڈروم میں داخل ہوئے تو ٹھٹک کے رہ گئے۔ دونوں میاں بیوی خون میں نہائے پڑے تھے۔ خون بہہ بہہ کر بستروں پر جم گیا تھا۔

میں نے قریب جا کر لاشوں کا معائنہ کیا۔ دونوں کے گلے کٹے ہوئے تھے۔ قاتل نے تیز دھار آلے سے دونوں کو ذبح کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ دونوں کے جسموں پر کسی زخم یا ضرب کا نشان نہیں تھا۔ غالباً قاتل نے سوتے میں ان کے گلے کاٹ دیئے تھے۔

میں نے کمرے کے فرش کا معائنہ کیا کہ شاید کوئی ایسی چیز مل جائے جو تفتیش میں کارآمد ثابت ہو سکے۔ فرش پر یا بستر پر ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ پختہ فرش بالکل صاف تھا اور اس پر کسی قسم کا کھرا تلاش کرنا ناممکن سی بات تھی۔

میں نے کانسٹیبل رحمت کو بلا کر کہا کہ وہ تھانے جائے اور متعلقہ عملے کو ساتھ لے آئے تاکہ دونوں لاشوں کے اور موقعۂ واردات کے فوٹو گراف تیار کیے جائیں۔ رحمت کے جانے کے بعد میں نے نقشہ صورتِ حال مرتب کیا۔ جب لاشوں کے فوٹو گراف لے لیے گئے تو میں

نے لاشوں کو پوسٹمارٹم کے لیے بھجوانے کا بندوبست کیا۔

میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ ہری چند اور شانتی دونوں اندر مرے پڑے تھے تو پھر اندر سے دروازہ کس نے بند کیا؟ یقیناً قاتل نے اندر سے کنڈی لگائی ہوگی اور قتل کرنے کے بعد دیوار پھاند کر نکل گیا۔ میں نے دیواروں کو اندر کی جانب سے غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ آخر ایک جگہ پر آ کر میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ اس جگہ پر دیوار پر رگڑ کے نشان تھے۔ قاتل اس جگہ سے دیوار پھاند کر بھاگا تھا۔ رگڑ کے نشان قاتل کے جوتوں سے لگے تھے۔

مجھے وہاں سے کوئی ایسی چیز نہ ملی جو اس دوہرے قتل کا سراغ لگانے میں مددگار ثابت ہو سکتی۔ دونوں میاں بیوی بے اولاد تھے اور اب یہاں ان کا کوئی والی وارث نہ تھا جو ان کے قتل کی پیروی کرتا۔ ابھی تک یہ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ قتل کی وجہ کیا ہے۔ میرے لیے یہ معلوم کرنا بھی ممکن نہیں تھا کہ گھر سے کوئی نقدی یا زیور وغیرہ غائب ہے یا نہیں۔ بتانے والے دونوں قتل ہو گئے تھے۔ ویسے میرا اپنا خیال یہی تھا کہ کسی نے ان دونوں کو لوٹنے کی غرض سے قتل کیا ہوگا۔

ویسے میرا شک ایک اور طرف بھی جاتا تھا۔ بعض مسلمان ہندو سکھ غنڈوں کے ہاتھوں مسلمان مہاجرین کی قتل و غارت اور لوٹ مار پر بہت سیخ پا تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہاں سے جانے والے ہندوؤں کو بھی لوٹ کر قتل کر دینا چاہیئے۔ دوہرے قتل کی اس واردات میں ایسے ہی کسی جذباتی مسلمان کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔

بہر حال میں نے مکان کو تالہ لگا کر سر بمہر کرا دیا اور کانسٹیبل رحمت کی ڈیوٹی لگا دی۔ چونکہ اس کیس کا کوئی مدعی نہ تھا، اس لیے میں نے از خود کارروائی کرتے ہوئے نامعلوم قاتل کے خلاف مقدمہ درج کر لیا اور کارروائی شروع کر دی۔ اس کیس کی مدعی اب پولیس خود تھی۔ یہ دوہرا قتل میرے لیے دردِ سر بننے والا تھا۔ ایسے اندھے قتل کی تفتیش خاصی مشکل ہوتی ہے۔

میں نے ہری چند کے ہمسایوں اور محلے داروں سے پوچھ گچھ کی اور ہری چند کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔ میں سب سے یہی پوچھتا تھا کہ ہری چند کی کسی سے دشمنی تھی یا گذشتہ دنوں کسی کے ساتھ اس کا لڑائی جھگڑا ہوا ہو مگر مجھے تقریباً سب نے یہی بتایا کہ ہری چند بزدل قسم کا ہندو تھا اور وہ اس قابل نہیں تھا کہ کسی سے دشمن مول لے سکے۔ لڑائی جھگڑا کی بجائے وہ دب کر رہتا تھا۔

میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ کہیں سے روشنی کی ننھی سی کرن بھی نہیں مل رہی تھی۔ میں تھانے میں بیٹھا قیاس کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ میں نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کسی جرائم پیشہ پکے وارداتئے کا کام ہے۔ سب کو یہ بات معلوم تھی کہ ہری چند کے پاس اچھا خاصا مال ہے اور اس نے اپنے گھر کا سامان بھی اونے پونے بیچ کر رقم وصول کر رکھی ہے۔ اس کا آگا پیچھا بھی کوئی نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیا جائے کہ وہ کسی بھی جرائم پیشہ آدمی کے لیے ترغیب کا باعث اور آسان شکار تھا۔

میں اپنے علاقے کے جرائم پیشہ لوگوں سے واقف تھا۔ ان کا مکمل ریکارڈ تھانے میں موجود تھا اور ان کا کسی نہ کسی واردات کے سلسلے میں تھانے آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ ان میں دو تین جیب تراش اور اٹھائی گیرے قسم کے مجرم تھے۔ دو چرس وغیرہ بیچتے تھے۔ اس کے علاوہ دو تین شوقیہ بدمعاش بنے ہوئے تھے اور ان کو شریف لوگوں پر ٹھکا جمانے کا شوق تھا۔

میں نے ان سب کو نظرانداز کر دیا اور ان لوگوں کو بلانے کا فیصلہ کیا جو چوری ڈکیتی اور نقب زنی کی وارداتوں میں ماہر تھے۔ یہ تین آدمی تھے۔ میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ ان تینوں سے کہے کہ تھانے حاضر ہو جائیں۔

کسی بھی علاقے میں کوئی واردات ہو جائے، تو اس علاقے کا تھانیدار تھانے کے ریکارڈ پر موجود مشتبہ لوگوں کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ ان جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ تفتیش کرنے کا انداز بھی ذرا دوسری قسم کا ہوتا ہے۔ بے دریغ گالیوں اور چھترول کا استعمال کیا جاتا ہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ کانسٹیبل تینوں عادی مجرموں کو ساتھ لے کر آ گیا تھا۔ تینوں کو میرے سامنے لایا گیا تو میں کھوجنے والی نظروں سے ان کے چہرے پر دیکھنے لگا۔ میں جو بات نوٹ کرنا چاہتا تھا وہ یہ تھی کہ ان میں سے کون ایسا ہے جو گھبرایا ہوا ہے، لیکن مجھے اس سلسلے میں مایوسی ہوئی۔ تینوں پختہ کار جرائم پیشہ تھے اور شکلیں ایسی بنائی ہوئی تھیں جیسے پانچوں وقت کے نمازی ہوں۔

''میری بات غور سے سنو اوئے!'' ___ میں نے بید کی چھڑی میز پر مارتے ہوئے کہا ___ ''ہری چند والی واردات جس کی ہے۔ وہ خود ہی بک دے ورنہ میں کھال اتار دوں گا۔ اگر خود بتا دو گے تو فائدے میں رہو گے''۔

وہ تینوں اللہ رسول کی قسمیں کھانے لگے کہ یہ واردات انہوں نے نہیں کی۔ میں ان کی قسموں پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لاتوں کے بھوت ہیں جو باتوں سے نہیں مانیں گے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل رشید بٹ کو بلا کر کہا وہ تینوں کو لے جائے اور ان کی زبان کھلوائے۔ رشید بٹ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ذرا دیر بعد ہی ان کی چیخ و پکار کی آواز تھانے میں گونجنے لگی۔

اسی اثنا میں دونوں مقتولین کی پوسٹمارٹم رپورٹ آ گئی۔ اس میں لکھا تھا کہ قتل کو اندازاً بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ دونوں کے معدوں میں غیر ہضم شدہ غذا ائی گئی۔ تیز دھار آلے سے شہ رگ کاٹی گئی تھی۔ موت کا باعث زیادہ خون بہہ جانا لکھا گیا تھا۔

ہری چند اور شانتی کی لاشیں واپس آ گئی تھیں اور یہ میرے لیے ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ دونوں لاشیں چونکہ ہندوؤں کی تھیں، اس لیے ہندو دھرم کے مطابق ان کی چتا تیار کر کے جلایا جانا ضروری تھا۔ یہ بھی میری سرکاری ڈیوٹی میں شامل تھا۔ میں نے اپنے علاقے میں اِدھر اُدھر پتہ کرایا کہ کہیں کوئی ہندو رہتے ہوں تو ان کے ذمے یہ کام لگایا جائے لیکن کوئی بھی ہندو نہ ملا۔ یہ نئی پریشانی پیدا ہو گئی تھی۔ لاشوں سے تعفن اٹھنے لگا تھا۔

بڑی بھاگ دوڑ کے بعد ایک آدمی سے پتہ چلا کہ گجرات کے مضافات میں ایک ہندو قبیلہ رہتا ہے۔ میں نے دو باوردی کانسٹیبل بھیج کر اس قبیلے کے سردار کو اسی وقت بلوالیا اور اسے دونوں ہندوؤں کی لاشوں کے متعلق بتایا۔ سردار خوشی سے یہ کام کرنے پر تیار ہو گیا۔ میں نے دونوں لاشیں اس کے حوالے کر کے اپنی جان چھڑائی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

ادھر سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ان تینوں جرائم پیشہ ملزموں کے متعلق پتہ کروایا کہ انہوں نے کچھ بتایا ہے یا نہیں تو مجھے بتایا کہ اتنی زیادہ مار کھانے اور اذیت برداشت کرنے کے باوجود ان میں سے کوئی بھی اس واردات کا اقبال کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے رشید بٹ سے کہا کہ ان کو میرے پاس لے آئے۔

ان تینوں کو میرے سامنے لایا گیا۔ تینوں کا بُرا حال تھا۔

''اب بھی وقت ہے'' ــــ میں نے ان سے کہا ــــ ''اقبالی ہو جاؤ گے تو فائدے میں رہو گے''۔

''آپ مائی باپ ہیں حضور!'' ــــ ایک نے ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ ''جو جرم ہم نے نہیں

کیا، اس کا اقرار کیوں کر لیں؟ بے شک آپ مار مار کر ہلاک کر دیں لیکن ہم کسی اور کے جرم کو اپنے کھاتے میں نہیں ڈالیں گے''۔

اس کی باتوں میں مجھے سچائی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں اتنی آسانی سے ان لوگوں کو چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے ان تینوں سے بے شمار سوالات کئے۔ گھما پھرا کر ایک ہی بات مختلف طریقوں سے پوچھی لیکن مجھے اَن سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

میں ابھی ان کے ساتھ مغز ماری کر رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے آ کر بتایا کہا کہ ایک معزز سا آدمی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کانسٹیبل نے یہ بھی بتایا کہ وہ اس دوہرے قتل کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہے۔ میں نے آدمی کو بلوالیا۔ اس دوہرے قتل کی تفتیش کے لیے میں چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک معزز صورت ادھیڑ عمر شخص اندر آیا اور بڑے تپاک سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میں اس کو پہچان گیا۔ وہ اس علاقے کا مالدار آدمی تھا اور سماجی کاموں کے سلسلے میں اس کی شہرت بھی تھی۔ اس کا نام ایوب تھا۔ اچھا آدمی تھا۔ بس اس میں ایک ہی خرابی تھی کہ شوباز بہت تھا لیکن اس کی سماجی خدمات کو دیکھتے ہوئے اس کی شوبازی گوارہ کی جا سکتی تھی۔

ایوب نے مجھے ایک اور ہی بات سنا دی۔ اس کی اطلاع سے اس واردات میں ایک نیا مشتبہ میرے سامنے آ گیا۔

''بس ایک بات کا خیال رکھیں'' ــــ ایوب نے مجھ سے کہا ــــ ''جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے، کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں نے آپ کو بتایا ہے...... خواہ مخواہ دشمنی پیدا ہو جائے گی''۔

ایوب نے جو بات مجھے بتائی تھی وہ مختصراً اس طرح تھی کہ مقتول ہری چند بھی دوسرے ہندوؤں کی طرح لوگوں کو سود پر پیسے دینے کا کام کرتا تھا اور اس نے اپنے سود در سود جال میں کئی لوگوں کو پھنسا رکھا تھا۔ ہری چند سے سود پر رقم لینے والوں میں اس علاقے کا ایک سنار بھی شامل تھا۔ اس کا نام یوسف تھا۔

ایوب نے بتایا کہ یوسف سنار نے ہری چند سے خاصی بڑی رقم سود پر قرض لے رکھی تھی۔ اس رقم کا وہ سود ادا کرتا رہا تھا لیکن اصل رقم اس نے ادا نہیں کی تھی۔ کئی بار ہری چند اور یوسف کا اس وجہ سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔ یوسف نے ہری چند کو قتل کی دھمکی دی تھی۔

یہ اس زمانے کے حساب سے اچھی خاصی رقم تھی۔ ایوب کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے یوسف نے موقع پا کر ہری چند اور اس کی گھر والی شانتی کو قتل کر دیا ہو تاکہ اصل رقم نہ دینی پڑے۔

ایوب نے جو رقم بتائی تھی وہ تین چار ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس زمانے میں یہ رقم اتنی زیادہ تھی کہ اس کی خاطر قتل کیا اور قتل ہوا جا سکتا تھا۔ میرے خیال میں یوسف سنار کے پاس ہری چند کو قتل کرنے کی وجہ موجود تھی اور اب وہ میرا مشتبہ نمبر ایک تھا۔

میں نے اس پہلو سے بھی سوچا کہ ہو سکتا ہے ایوب کی ذاتی طور پر یوسف سنار کے ساتھ کوئی رنجش ہو اور اس نے یوسف کو پھنسوانے کے لیے اس کے بارے میں مجھے اطلاع دی ہو۔

میں نے سوچ لیا کہ صرف ایوب کے کہنے پر ہی یوسف سنار کو گرفتار نہیں کروں گا، البتہ اسے تفتیش کی چکی میں ضرور ڈالوں گا۔ اگر وہ مشکوک ثابت ہوا تو گرفتار بھی کر لوں گا۔

میں نے یوسف سنار کو تھانے بلوانے کے لیے ایک کانسٹیبل کو بھیج دیا۔ یوسف کی جیولری کی دکان تھانے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ کانسٹیبل کے ساتھ آ گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نہیں تھے کیونکہ ان لوگوں کا اکثر پولیس تھانے کے ساتھ واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ اگر علاقے میں کہیں چوری یا ڈکیتی کی واردات ہو جاتی اور اس میں زیورات وغیرہ بھی چلے جاتے تو تمام سناروں کو اطلاع دے دی جاتی اور چوری ہونے والے زیورات کے متعلق تفصیلاً بتا دیا جاتا تھا کہ اس قسم کے زیورات کوئی فروخت کرنے آئے تو فوراً تھانے اطلاع کر دیں۔

یوسف سنار تقریباً پچاس سال عمر کا سرخ و سفید صحت مند آدمی تھا۔ اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔ میں نے کانسٹیبل کو باہر بھیج دیا اور یوسف کو بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد پوچھا کہ وہ ہری چند کو جانتا ہے۔ اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"سنا ہے وہ لوگوں کو سود پر پیسے دیتا تھا" ___ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"ہاں سرکار!" ___ اس نے کہا ___ "وہ سود کا کام کرتا تھا"۔

"تمہیں معلوم ہے کہ ہری چند قتل ہو گیا ہے" ___ میں نے پوچھا۔

"یہ بات تو بچہ بچہ جانتا ہے" ___ یوسف نے کہا ___ "پورے گجرات میں اس دوہرے قتل کا چرچا ہے"۔

"تم نے بھی اس سے سود پر رقم لی ہوئی تھی" ___ میں نے کہا ___ "اور اس سلسلے میں تمہارا اس سے کئی بار جھگڑا بھی ہوا تھا"۔

"یہ بات سچ ہے آغا صاحب!" ___ اس نے کچھ پریشان ہو کر کہا۔

"اور تم نے اسے قتل کی دھمکی بھی دی تھی!" ___ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اچانک اس کا رنگ اڑ گیا اور چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہونے لگی۔ غالباً وہ یہ بات سمجھ گیا تھا کہ میں ڈھکے چھپے لفظوں میں اس پر قتل کا الزام لگا رہا ہوں۔

"وہ تو......" ___ وہ ہکلا کر بولا ___ "وہ تو میں نے غصے میں کہہ دیا تھا...... کہیں آپ یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ میں نے ہری چند کو......" ___ اس سے آگے اس سے بولا نہیں گیا اور اس کے ہونٹ محض بل کر رہ گئے، آواز نہ نکلی۔

"ہاں!" ___ میں نے کہا ___ "تم ٹھیک سمجھے ہو"۔

"مم...... مگر میں اسے کیوں قتل کرنے لگا؟" ___ اس نے حواس مجتمع کر کے کہا ___ "میری اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی"۔

"تین چار ہزار اچھی خاصی رقم ہوتی ہے" ___ میں نے کہا ___ "اتنی رقم کی خاطر قتل ہو سکتا ہے...... تم نے یہ رقم بچانے کے لیے ہری چند کو خود قتل کرد [illegible] سی سے کروا دیا ہوگا"۔

"مجھ پر یہ الزام غلط ہے جناب!" ___ اچانک یوسف نے جاندار آواز میں کہا ___ "میں نے ہری چند کو ساری رقم واپس کر دی تھی۔ میرے پاس ہری چند کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصولی کی تحریر بھی موجود ہے اور دو گواہ بھی ایسے ہیں جن کے سامنے میں نے رقم واپس کی تھی"۔

یوسف نے مجھے ان دو آدمیوں کے نام بھی بتائے جن کے سامنے اس نے ہری چند کو رقم واپس کی تھی۔ تحریر کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ دکان پر سیف میں رکھی ہے۔ میں نے ایک کانسٹیبل کے ساتھ اسے بھیجا کہ وہ تحریر لے آئے اور دونوں آدمیوں کو بھی لے آئے جن کو وہ گواہ بتا رہا تھا۔ میں نے کانسٹیبل کو سمجھا دیا تھا کہ وہ یوسف کو کسی سے فالتو بات کرنے کا موقع نہ دے اور تنہا نہ چھوڑے۔

کانسٹیبل یوسف کو لے کر چلا گیا تو میں ایک بار پھر مایوسی کا شکار ہو گیا۔ اس سے پہلے یوسف کے خلاف پختہ شک تھا اور اس کی معقول وجہ بھی موجود تھی۔ اب اگر یوسف سچ کہہ رہا تھا

اور وہ تحریر اور گواہ بھی پیش کر دیتا تو پھر اس کا نام مشتبہ افراد کی فہرست سے نکالنا پڑتا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد یوسف اور کانسٹیبل واپس آ گئے۔ ان کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ یوسف نے بتایا کہ یہ وہ گواہ ہیں جن کے سامنے اس نے ہری چند کو رقم دی تھی۔ پھر اس نے وہ تحریر بھی مجھے دکھائی۔ اس میں ہری چند نے اپنی رقم کی وصولی کے بارے میں لکھا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ وہ سود معاف کر کے صرف اصل رقم لے رہا ہے۔ نیچے ہری چند کے دستخط تھے اور گواہوں کے طور پر دونوں اشخاص کے دستخط بھی تھے۔

میں نے دونوں گواہوں کا بیان بھی لیا جو یوسف کے بیان کی تصدیق کرتا تھا۔ اس کے بعد میں نے یوسف کو جانے کی اجازت دے دی۔

میرے لیے بڑی مشکل پیدا ہو گئی تھی۔ یوسف کے بے گناہ ثابت ہونے کے بعد میں پھر وہیں پر واپس آ گیا جہاں سے چلا تھا۔ اس وقت پیر فردوس شاہ مرحوم ڈی ایس پی تھے اور خان عبیداللہ خان ایس پی تھے۔ دونوں افسران اس کیس میں دلچسپی لے رہے تھے اور تفتیش کی نگرانی کر رہے تھے۔ مجھے اپنی ہر کارروائی کی رپورٹ دونوں افسران کو دینی پڑتی تھی۔

میں نے اس دن مزید کوئی کارروائی کرنے کی بجائے اگلے دن تازہ دم ہو کر اس کیس پر نئے سرے سے غور کرنے کا فیصلہ کر لیا اور تھانے سے آ گیا۔

دوسرے دن میں تھانے پہنچا تو بالکل تازہ دم تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے اس کیس کی تفتیش جلد بازی میں کی ہے اور کوئی اہم کام بھول گیا ہوں۔ میں نے اطمینان سے بیٹھ کر نئے سرے سے اب تک کی کارروائی پر غور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جب میں نے تمام حالات و واقعات پر غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں بالکل سامنے کی بات نظر انداز کر گیا ہوں۔ یہ میری لاپرواہی یا کوتاہی تھی۔ غلطی یہ ہوئی تھی کہ مجھے سب سے پہلے ہری چند کے گھر پر تعینات اپنے کانسٹیبل، وہاں پانی بھرنے والے بہشتی اور صفائی کرنے والے بھنگی کو شاملِ تفتیش کرنا چاہیے تھا۔

میں نے فوری طور پر ہری چند کے مکان پر ڈیوٹی دینے والے کانسٹیبل رحمت کو، بہشتی نذیر کو اور بھنگی اروڑہ مسیح کو طلب کر لیا۔ کانسٹیبل تو تھانے میں ہی موجود تھا جبکہ باقی دونوں افراد کو بلوانے کے لیے میں نے تھانے کے بندے بھیج دیئے تھے۔

سب سے پہلے میں نے رحمت سے پوچھ گچھ کی۔ اس نے بتایا کہ وہ وقوعہ والی رات سے

پہلے وہاں ڈیوٹی پر موجود رہا تھا اور اس نے کسی مشکوک آدمی کو وہاں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ رات کو جب وہ وہاں سے آیا تو دونوں میاں بیوی زندہ سلامت تھے۔ صبح اس نے دروازہ کھٹکھٹا کر پتہ کرنا چاہا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ لا دے۔ جب بار بار کھٹکھٹانے پر بھی دروازہ نہ کھلا تو وہ تھانے آ گیا۔

میں نے اس کانسٹیبل سے اور بھی بہت سی باتیں پوچھیں مگر کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ اتنے میں وہ بہشتی بھی آ گیا جو ہری چند کے گھر میں صبح شام پانی بھرتا تھا۔ اس کی بہت بری حالت تھی۔ تھانے کی اپنی ایک دہشت ہوتی ہے۔ اس زمانے میں ویسے بھی پولیس کا بڑا رعب و دبدبہ ہوتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے خدشہ ہوا کہ یہ کہیں بے ہوش ہی نہ ہو جائے۔

میں نے اسے تسلی دلاسہ دیا اور اس کے ساتھ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں تو اس کی حالت کچھ سنبھلی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ جس شخص کی تھانے کے اندر آ کر یہ حالت ہو گئی ہے، وہ دوہرے قتل جیسا بھیانک جرم کیسے کر سکتا ہے۔ بہرحال میں نے اپنے مطلب کی باتیں اس سے پوچھیں اور میری توقع کے مطابق اس سے مجھے کام کی کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔

اب مجھے اروڑہ مسیح کا انتظار تھا۔ اس کو جو کانسٹیبل لینے کے لیے گیا تھا وہ اکیلا ہی واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ اروڑہ مسیح گھر پر نہیں ہے اور اس کے باپ نے بتایا ہے کہ وہ گجرات سے باہر کہیں گیا ہوا ہے۔ یہ سن کر مجھے اروڑہ مسیح پر شک ہو گیا کہ یہ واردات اس نے کی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گھر سے بلکہ شہر سے ہی غائب ہے۔

میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اروڑہ مسیح کے باپ کو تھانے لے آئے۔ کانسٹیبل چلا گیا اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عیسائی کو لے آیا۔ وہ اروڑہ مسیح کا باپ تھا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔

''تمہارا بیٹا کہاں ہے؟'' ___ میں نے اس سے پوچھا۔

''پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے سرکار!'' ___ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ___ ''ہم خود بہت پریشان ہیں''۔

''اس سے پہلے بھی وہ کبھی اس طرح گھر سے گیا ہے؟'' ___ میں نے اس سے پوچھا۔

''نہیں سرکار!'' ___ اس نے کہا ___ ''اس نے پہلے کبھی ایسی حرکت نہیں کی''۔

''تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں جا سکتا ہے؟'' ___ میں نے پوچھا۔

میرے اس سوال کے جواب میں وہ کچھ سوچنے لگا پھر اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ مجھے شک گزرا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کب سے گھر سے غائب ہے۔ اس کے جواب میں اس نے مجھے جو دن بتایا وہ واردات والی رات سے اگلا دن تھا۔

میں نے اروڑہ مسیح کے باپ کو بہت کریدا، طرح طرح سے سوال کئے اور ڈرایا دھمکایا بھی لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ بتا سکا۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جونہی اس کا بیٹا گھر آئے، وہ اسے تھانے میں پیش کرے یا تھانے آ کر اطلاع کرے۔

وہ چلا گیا تو میں نے اپنے تجربہ کار ہیڈ کانسٹیبل رشید بٹ کو بلا لیا اور ساری صورتِ حال اس کے سامنے رکھ دی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ رشید کا ذہن تفتیشی معاملات میں بڑا زرخیز تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ اروڑہ مسیح کے گھر کی ڈاک کو سنسر کیا جائے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے، اپنے گھر خط ضرور لکھوائے گا۔

مجھے رشید کا یہ مشورہ پسند آیا اور میں نے اروڑہ مسیح کے گھر کی ڈاک سنسر کرنے کا انتظام کرا دیا اس کے علاوہ میں نے ایک سادہ لباس کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ اروڑہ مسیح کے گھر پر نظر رکھے اور اگر اروڑہ گھر والوں سے ملنے آئے تو تھانے اطلاع کرے۔

ان اقدامات کے بعد میں نے اروڑہ مسیح کے دوستوں کا پتہ کرایا اور ان سے بھی اروڑہ کے متعلق پوچھا مگر اروڑہ کسی سے کچھ کہہ کر نہیں گیا تھا کہ وہ کہیں جا رہا ہے۔

ان دنوں پاکستان بھارت کے درمیان ہندو مسلم رابطہ کمیٹی قائم کی گئی تھی۔ ہری چند اور شانتی کے قتل کی اطلاع اس کمیٹی کو دے دی گئی تھی۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ یہ واردات مسلمانوں کا کام ہے۔

اس کیس کی تفتیش کے متعلق اس کمیٹی کو بھی گاہ کیا جاتا تھا۔ اروڑہ مسیح کے سامنے آ جانے کی وجہ سے میں بہت خوش تھا کہ اب مسلمانوں پر سے الزام ہٹ گیا ہے۔

دورانِ تفتیش ہری چند کی ہمسایہ عورتوں سے معلوم ہوا کہ ہری چند کی گھر والی شانتی کے پاس زیورات بھی تھے اور ان لوگوں کے پاس اچھی خاصی نقد رقم بھی تھی۔ وہ ہندوستان جانے کی تیاریوں میں تھے۔

ہری چند کے گھر کی تلاشی کے دوران یہ رقم اور زیور کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اب یہ بات صاف تھی کہ ہری چند اور شانتی کو اس رقم اور زیور کی خاطر قتل کیا گیا تھا۔

آخر تیسرے چوتھے دن اروڑہ مسیح کے باپ کے نام ایک خط آ ہی گیا۔ بھیجنے والے کے نام کی جگہ اروڑہ مسیح کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے خط کھول کر پڑھا تو ہر بات صاف ہوگئی۔ اس میں لکھا تھا:

''آپ لوگ ضرور میری اچانک گمشدگی کی وجہ سے پریشان ہوں گے۔ بالکل فکر نہ کریں، میں ٹھیک ٹھاک ہوں اور کراچی میں ایک دوست کے پاس رہ رہا ہوں۔ اگر کوئی بھی میرے متعلق پوچھے تو ہرگز نہ بتائیں۔ اگر پولیس والے پوچھیں تو گھبرانا نہیں اور لاعلمی کا اظہار کر دینا۔ جب یہ معاملہ ٹھنڈا ہوگا تو میں آ جاؤں گا۔ پولیس جو بھی کارروائی کرے اس کی تفصیل مجھے بتاتے رہیں۔''

آخر میں اس نے کراچی کا پتہ لکھا تھا۔ میں نے فوری طور پر ملزم اروڑہ کو گرفتار کر کے کراچی سے گجرات لانے کا انتظام کیا۔ میں نے کراچی پہنچ کر قانونی طریقۂ کار کے مطابق اس علاقے کے تھانیدار سے رابطہ کیا اور کیس کی تفصیل بتائی۔ اس تھانیدار نے خود میرے ساتھ جا کر اروڑہ مسیح کو گرفتار کر کے میرے حوالے کر دیا۔

میں اروڑہ مسیح کو لے کر گجرات آ گیا اور تفتیش شروع کر دی۔ پہلے تو اروڑہ مسیح مان ہی نہیں رہا تھا مگر جب میں نے اس کا خط اسے دکھایا تو وہ مزید انکار نہ کر سکا۔ اس نے اقبالی بیان دے دیا جو میں نے تحریر کر کے اس سے دستخط کرا لئے اور انگوٹھا بھی لگوا لیا۔ اس کا اقبالی بیان مختصراً پیش کر رہا ہوں۔

واردات سے ایک روز قبل اروڑہ مسیح صفائی وغیرہ کے لیے ہری چند کے گھر گیا تھا۔ چونکہ ہری چند اور اس کی بیوی اوپر والے حصے میں رہتے تھے، اس لیے اروڑہ مسیح اوپر جا کر صفائی کرتا تھا۔ وہ اوپر گیا تو اس نے دیکھا کہ ہری چند اور شانتی بیٹھے کچھ بات کر رہے تھے اور ہری چند کے ہاتھ میں ڈھیر سارے نوٹ تھے۔ اتنی زیادہ رقم دیکھ کر اروڑہ کی نیت بدل گئی اور اس نے اپنے دماغ میں یہ رقم حاصل کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔

اروڑہ مسیح صحت مند نوجوان تھا اور ہری چند اور شانتی دونوں ادھیڑ عمر اور کمزور سے تھے۔ ویسے بھی وہ لاوارث تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اروڑہ مسیح کو ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ آدھی

رات کے وقت دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔ اسے اندر سے سارے گھر کے متعلق معلومات تھیں۔ وہ سیدھا ہری چند کے بیڈ روم میں چلا گیا۔ اس نے اپنے لباس میں ایک لمبے پھل والا چاقو چھپا رکھا تھا۔

دونوں میاں بیوی گہری نیند سو رہے تھے۔ اروڑہ مسیح اِدھر اُدھر رقم تلاش کرنے لگا۔ اس کی بے احتیاطی سے ہلکا سا کھٹکا ہوا اور ہری چند کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اروڑہ کو حیرت سے دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اروڑہ نے لپک کر بڑی سختی سے اس کے منہ پر پیچھے سے ہو کر ہاتھ رکھ کر دبا لیا اور دوسرے ہاتھ سے چاقو نکال کر اس کی شہ رگ کاٹ دی۔

ہری چند کے بعد اس نے سوئی ہوئی شانتی کو بھی ذبح کر دیا۔ ان دونوں کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ اس کے بعد اس نے اطمینان سے تلاشی لے کر رقم تلاش کر لی۔ اس رقم کے ساتھ ہی زیورات بھی تھے۔ دونوں چیزیں لے کر وہ دیوار پھاند کر وہاں سے نکل آیا۔

اس نے گھر آ کر چاقو کو دھو کر اپنے کپڑوں کے درمیان رکھ دیا۔ زیور کو بھی اس نے گھر میں چھپا دیا اور خود صبح سویرے رقم لے کر کراچی چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب یہ معاملہ دب جائے گا تو وہ واپس آ جائے گا۔

میں نے اس سے رقم برآمد کر لی اور آلۂ قتل اور زیور کی برآمدگی کے لیے اس کو ساتھ لے جا کر گواہوں کی موجودگی میں دونوں چیزیں برآمد کر لیں۔

میں نے بڑی محنت سے کیس تیار کر کے عدالت میں پیش کر دیا۔ جہاں سے اروڑہ مسیح کو دس سال سزائے قید با مشقت دی گئی۔

※ ※ ※

دلہن، دل اور دلربا

ایک تھانیدار کو اپنی سروس کے دوران جن حالات و واقعات اور طرح طرح کے انسانوں کی ہر لحہ رنگ بدلتی فطرت اس کے سامنے کھل کر آ جاتی ہے، عام آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میرا بھی اپنی سروس کے دوران بڑے عجیب عجیب کرداروں سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ کچھ واقعات اور کردار ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے یاد رہ جاتے ہیں۔

ڈھرے شاہ بھی ایک ایسا کردار تھا جو مجھے آج اکیاسی برس عمر ہونے تک بھی نہیں بھول سکا۔ یہ غالباً 1950ء یا 1951ء کا واقعہ ہے۔ میں آپ کو ڈھرے شاہ کی سچی کہانی سنانے سے پہلے آج کے زمانے اور اس وقت کے زمانے میں فرق بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ایٹم بم اور میزائیلوں جیسے تباہ کن ہتھیار منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ اس زمانے میں مردانگی کا اظہار جسمانی طاقت اور دلیری کا مظاہرہ کر کے کیا جاتا تھا۔ اس وقت کے آلاتِ حرب مختلف تھے۔ دیہات میں ایک بڑی سی لاٹھی لے کر اس کے ایک سرے پر لوہے کا خول چڑھا کر اس خول میں سیسہ پگھلا کر بھر لیا جاتا تھا۔ اس کا وار نہایت کاری ہوتا تھا۔ میں نے قتل کی کئی ایسی تفتیشیں کی ہیں جن میں ایسی لاٹھی کو آلۂ قتل کے طور پر استعمال کیا گیا۔

اس لاٹھی سے بڑھ کر دوسرا خطرناک ہتھیار بلم برچھی اور کلہاڑی کا ہوتا تھا۔ شوقین لوگ بڑے خوبصورت اور رنگین نقش و نگار والے دستوں کی کلہاڑیاں ہاتھ میں رکھتے تھے۔ کلہاڑی اور برچھی سے بھی بڑھ کر جو آخری مہلک ہتھیار تھا وہ صرف جرائم پیشہ لوگوں کے پاس ہوتا تھا۔ یہ درے کی بنی دیسی ساخت کی بندوقیں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ جاگیردار، سیٹھ لوگ اور برسرِ اقتدار طبقے کے پاس انگلینڈ کی بنی بندوقیں یا پستول ہوتے تھے۔

سب سے زیادہ مہلک ہتھیار ہینڈ گرینیڈ تھا جو کشمیر کی جنگ کے بعد کچھ لوگوں کے ہاتھ لگ گیا تھا اور انہوں نے گاہے بگاہے اس کا استعمال بھی کیا۔ ایسے ہی ایک گرینیڈ کا واقعہ میں

نے اپنی ایک تفتیشی کہانی ''نسلوں کا قرض'' میں لکھا ہے۔

اس تمہید کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں اور آج کے دور میں نمایاں فرق ہے اب میں آپ کو دُھرے شاہ کی کہانی سناتا ہوں۔

گجرات کے علاقے میں جرائم کی شرح ہمیشہ زیادہ ہی رہی ہے۔ میرے وقتوں میں بھی اور آج کل بھی یہاں خاصے جرائم ہوتے ہیں۔ ان وقتوں میں آئے دن تھانے میں لڑائی جھگڑے، دشمنی، چوری چکاری کے کیس آئے رہتے تھے۔ ان دنوں رہزنی بھی عام تھی۔ قتل کی وارداتیں بھی اکثر ہوتی رہتی تھیں۔

ایک روز صبح سویرے ہی دو آدمی تھانے یہ اطلاع لے کر آئے کہ گندے نالے کے پل کے نیچے ایک انسانی لاش کیچڑ میں دھنسی پڑی ہے اور اس کے اوپر بھی کیچڑ کی تہہ جمی ہوئی ہے۔ میں نے فوراً اے ایس آئی سے کہا کہ وہ اپنا عملہ ساتھ لے کر جائے اور لاش نکلوا کر ضروری کارروائی کرے۔ اے ایس آئی چلا گیا اور تقریباً دو گھنٹے بعد وہ ہانپتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے اور وہ اتنا پریشان کیوں ہے۔

''نالے سے ملنے والی لاش دُھرے شاہ کی ہے سر!'' ___ اے ایس آئی نے کہا تو میں بھی اچھل پڑا۔

''کیا تمہیں پورا یقین ہے غفار!'' ___ میں نے اس سے پوچھا ___ ''کہ وہ لاش گھوڑے شاہ کی ہی ہے؟''

''بالکل سر!'' ___ اے ایس آئی غفار نے کہا ___ ''وہ سو فیصد دُھرے شاہ کی لاش ہے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد کانسٹیبل لاش تھانے لے کر آتے ہوں گے، آپ خود دیکھ لیجئے گا''۔

میں بڑی بے چینی سے لاش کے تھانے پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران میں غفار سے لاش کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ دُھرے شاہ کو قتل کیا گیا ہے اور لاش پر برچھی یا کلہاڑی کے زخموں کے نشان موجود ہیں۔

تھوڑی دیر بعد لاش تھانے آ گئی۔ اسے ایک پرانی سی چارپائی پر رکھا گیا تھا اور اوپر ایک میلی سی چادر ڈال دی گئی تھی۔ میں نے چادر اٹھا کر لاش کو دیکھا اور پہلی نظر میں ہی دیکھ لیا کہ وہ دُھرے شاہ ہی کی لاش تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے ریشمی کپڑے کا کرتا اور ریشمی لاچا

پہن رکھا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے کلہاڑی کے وار کر کے قتل کیا گیا ہے۔ کلہاڑی کا ایک وار گردن کے داہنی طرف اس جگہ پر تھا جہاں گردن کندھوں سے ملتی ہے۔ یہ بڑا کاری وار تھا اور خاصی گہرائی تک چلا گیا تھا اور غالباً یہی موت کا باعث بنا ہو گا۔ کلہاڑی کا ایک وار کالر بون یعنی ہنسلی کی ہڈی پر لگا تھا اور ہڈی کٹ گئی تھی۔

ہنسلی کی ہڈی انسانی جسم کی سب سے نازک ہڈی ہوتی ہے اور معمولی ضرب سے بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

کلہاڑی کا تیسرا وار پسلیوں پر لگا تھا اور دو پسلیوں کو گہری ضرب لگی تھی۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی تو کرتے کی جیب سے کچھ چھوٹے نوٹ نکلے جو بھیگے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی بھی موجود تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اسے لوٹنے کی غرض سے قتل نہیں کیا بلکہ یہ قتل کسی دشمنی کا نتیجہ ہے۔

میں نے ضروری کارروائی کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔

لاش پوسٹمارٹم کے لیے چلی گئی تو میں اس قتل کے کیس کے متعلق سوچنے لگا۔ میں بڑا حیران تھا کہ دُھرے شاہ جیسے نامی گرامی بدمعاش کو کس نے قتل کر دیا۔ بڑے بڑے غنڈے بدمعاش اس سے ڈرتے تھے اور تھانے میں بھی اس کا ریکارڈ موجود تھا۔ وہ ہسٹری شیٹر تھا۔ پولیس والے بھی سوچ سمجھ کر اس پر ہاتھ ڈالتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اے ایس آئی غفار خاصا بوکھلا گیا تھا۔

یہاں میں قارئین کی دلچسپی کے لیے دُھرے شاہ کے متعلق کچھ دلچسپ باتیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔

دُھرے شاہ رحیم پور کا رہنے والا تھا۔ اس کا اصل نام جانے کیا تھا، سب لوگ اسے دُھرے شاہ کہتے تھے۔ وہ اپنی اچھی صحت اور دلیرانہ وارداتوں کی وجہ سے پورے علاقے میں مشہور تھا۔ وہ دوہرے قد اور گٹھے ہوئے بدن کا مالک تھا۔ اس کا چہرہ بھرا بھرا، اس پر بڑی بڑی مونچھیں اسے بارعب بناتی تھیں۔ وہ بے انتہا طاقتور انسان تھا۔

میلوں ٹھیلوں کا وہ بڑا شوقین تھا اور خصوصی اہتمام سے میلے پر جاتا تھا۔ اس کا میلے میں جانے کا انداز بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ وہ گہرے سبز رنگ کا کڑھائی والا ریشمی کرتہ اور ریشمی لاچا پہن لیتا، سر پر لمبے بالوں کو ایک ریشمی پٹی باندھتا اور ایک ریشمی پٹکا دونوں ہاتھوں میں پکڑ

کرڈھول کی تھاپ پر کبھی ایک ٹانگ پر اور کبھی دوسری ٹانگ پر ناچتا ہوا کئی فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے میلے تک جاتا تھا، اور بھرے میلے میں ڈانگ سوٹے کی لڑائی کے لیے للکارتا تھا مگر اس کے خوف سے کسی کو اس کے مقابلے پر آنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

رات کے وقت اس کے علاقے میں اس کی حکومت ہوتی تھی۔ لوگ ڈر کے مارے ادھر سے گزرتے ہی نہیں تھے۔ اگر کوئی گھوڑ سوار یا تانگے والا رات کو ادھر سے گزرتا تو ڈھرے شاہ کی حدود میں آکر رفتار تیز کر لیتا لیکن ڈھرے شاہ انتہائی تیز رفتاری سے دوڑ لگا کر بھاگتے گھوڑے یا تانگے تک پہنچ کر باگ پکڑ کر روک لیتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ اسے گھوڑے شاہ بھی کہتے تھے۔

اب اسی ڈھرے شاہ کو کسی نے کلہاڑی کے وار کر کے قتل کر دیا تھا تو میرا حیران ہونا بجا تھا کیونکہ وہ اکیلا دو تین آدمیوں پر بھاری تھا۔ وہ بے شک جرائم پیشہ آدمی تھا لیکن مجھے اس کے قتل کی تفتیش کر کے قاتل کو پکڑ کر عدالت میں پیش کرنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ڈھرے شاہ کسی دوسرے جرائم پیشہ آدمی کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کی اکثر آپس میں دشمنیاں ہوتی ہیں۔ میں نے اپنی تفتیش کا آغاز انہی لوگوں سے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

پوسٹمارٹم رپورٹ جلد ہی آ گئی۔ اس میں موت کا باعث زیادہ خون کا بہہ جانا لکھا گیا تھا اور اس کا باعث وہی کلہاڑی کے زخم تھے جن کی تفصیل میں بتا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ رپورٹ میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ مقتول کے معدے میں دیسی شراب کی خاصی مقدار پائی گئی ہے۔ موت کا وقت آدھی رات کے لگ بھگ لکھا گیا تھا۔

مقتول کا چونکہ کوئی وارث سامنے نہیں آیا تھا، اس لیے اس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر دفنا دیا گیا۔

اس کے بعد میں نے تفتیش کا آغاز کر دیا۔ میں نے اپنے مخبروں کو طلب کر لیا۔ ان میں عادی جرائم پیشہ لوگ بھی تھے اور معزز لوگ بھی۔ میں نے ان کو کہا کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کیا ڈھرے شاہ کی کسی کے ساتھ ایسی دشمنی تھی کہ نوبت قتل تک پہنچ جائے۔ اس کے علاوہ میں نے ان کو یہ بھی کہا کہ وہ یہ بات بھی معلوم کریں کہ پچھلے دنوں میں ڈھرے شاہ کا کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوا ہو۔

ایک بار اس کیس کا کوئی سرا میرے ہاتھ آ جاتا اور معمولی سا سراغ بھی مل جاتا تو پھر میرا

کام آسان ہو جاتا تھا۔ یہ مخبر اس کام کو سمجھتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ انہوں نے اپنے مطلب کی معلومات کہاں سے حاصل کرنی ہیں اور کیسے کرنی ہیں۔

اگلے دن سے مخبر میرے پاس رپورٹیں لے کر آنے لگے اور ڈھرے شاہ کے قتل ہونے سے چند دن پہلے کی خبریں لانے لگے۔ ان میں کوئی ایسی خبر نہیں تھی جس سے یہ تاثر ملتا کہ فلاں واقعہ ڈھرے شاہ کے قتل کا باعث بنا ہوگا۔

پھر ایک اور مخبر آیا۔ یہ میرا بڑا ہی کامیاب مخبر تھا۔ ویسے تو جرائم پیشہ تھا اور چھوٹے موٹے جرائم کرتا تھا لیکن زبان کا جادو چلانا جانتا تھا اور لوگوں کے گھروں کے اندر کے بھید بھی نکال لاتا تھا۔

اس نے جواب بات سنائی، اس سے مجھے ایسے لگا جیسے اس نے ڈھرے شاہ کے قاتل کو میرے سامنے لا کھڑا کیا ہو۔ اس مخبر نے جو بات سنائی وہ میں بیان کر دیتا ہوں۔

ڈھرے شاہ میں جہاں اور بہت سی برائیاں تھیں، وہاں وہ دیسی شراب بھی پیتا تھا اور طوائف بازی کا بھی شوقین تھا۔ اس وقت کی ایک نوخیز اور حسین طوائف دلربا اسے بہت پسند تھی اور وہ اس پر دل کھول کر پیسہ لٹاتا تھا۔ جب وہ دلربا کے پاس چلا جاتا تھا تو پھر کسی اور کو کوٹھے پر نہیں آنے دیتا تھا۔ اگر پہلے سے محفل جمی ہوتی تو اس کی آمد پر پہلے سے موجود تماش بینوں سے معذرت کر کے محفل برخاست کر دی جاتی۔ تماش بین اس بات کا برا تو مناتے لیکن ڈھرے شاہ کے خوف سے چپ چاپ چلے جاتے۔

یہ بات مشہور تھی کہ ڈھرے شاہ اور دلربا ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں اور یہ نوبت عشق تک جا پہنچی ہے۔

قتل سے تقریباً بارہ پندرہ دن پہلے کا واقعہ ہے کہ ڈھرے شاہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ دلربا کے کوٹھے پر گیا تو وہاں اس وقت ایک اور جرائم پیشہ جس کا نام رنگو تھا، بیٹھا ہوا تھا۔

میں رنگو کو جانتا تھا۔ اس کا اصل نام تو اورنگ ریب تھا لیکن سب اسے رنگو کہتے تھے۔

ڈھرے شاہ کے پائے کا بدمعاش تھا لیکن طاقت اور دلیری میں ڈھرے شاہ سے کم تک تھا۔ رنگو اور ڈھرے شاہ کی آپس میں سرد جنگ چل رہی تھی لیکن دونوں میں سے کوئی بھی کھل کر سامنے نہیں آیا تھا۔ مختصر یہ کہ رنگو ڈھرے شاہ سے دبنے والا آدمی نہیں تھا۔

ڈھرے شاہ کی آمد سے رنگو کے رنگ میں بھنگ پڑ گئی اور جمی جمائی محفل رک گئی۔ رنگو

نے دلربا سے کہا کہ وہ ناچ گانا جاری رکھے اور کسی کی پرواہ نہ کرے۔

"معافی چاہتی ہو سرکار!" — دلربا نے بڑے ادب سے کہا — "آپ پھر کبھی تشریف لائیے گا...... شاہ جی کے آنے پر محفل روک دی جاتی ہے"۔

"یہ طوائف کا کوٹھا ہے، کسی شاہ کا ڈیرہ نہیں" — رنگو نے غصے سے کہا — "یہاں ہر کوئی آ سکتا ہے۔ ہم پہلے سے یہاں موجود ہیں اس لیے ہمارا حق پہلے ہے تم شاہ جی کو بعد میں بلا لینا"۔

یہ سن کر دُھرے شاہ کو غصہ آ گیا اور قریب تھا کہ دلربا کا کوٹھا میدانِ جنگ بن جاتا، اچانک دُھرے شاہ نے بجلی کی سی تیزی سے لمبے پھل والا چاقو نکالا اور رنگو کی شہ رگ پر رکھ دیا۔

"چپ چاپ یہاں سے نکل جاؤ" — دُھرے شاہ نے کہا — "ورنہ ایک ہی جھٹکے میں شہ رگ کاٹ دوں گا"۔

رنگو ڈرنے والا آدمی نہیں تھا لیکن موت کا فرشتہ اسے اپنی رشتہ رگ کے نزدیک محسوس ہوا تو اس نے پسپائی اختیار کر لی اور چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔ اسے اس بے عزتی کا بڑا رنج تھا۔ اس کے ساتھیوں کے سامنے دُھرے شاہ نے اس کو ذلیل کر کے دلربا کے کوٹھے سے نکال دیا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لے گا۔

میرے مخبر نے یہ ساری باتیں رنگو کے ایک ساتھی سے معلوم کی تھیں جو اس کا دوست تھا۔ میں نے اس سے اپنے کام کی کچھ اور باتیں پوچھ کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ جانے سے پہلے میں نے اسے کچھ نقد انعام اور شاباش دی تو وہ خوش خوش چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے اے ایس آئی کو بلا کر تمام صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔ میرا اور اس کا ایک ہی خیال تھا کہ دُھرے شاہ کو رنگو نے قتل کیا ہے اور اس کے پاس قتل کی وجہ بھی موجود ہے۔ میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے جائے اور رنگو کو تھانے لے آئے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ شرافت سے نہ آنا چاہے تو اس کی ہتھکڑی لگا کر لے آئے۔

ہیڈ کانسٹیبل اسی وقت دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر چلا گیا اور تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد رنگو کو ساتھ لے کر واپس آ گیا۔ وہ شرافت سے آ گیا تھا اور ہتھکڑی لگانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس نے آتے ہی بڑے غلامانہ انداز میں تقریباً رکوع کی حالت میں جھک کر سلام کیا۔

"حکم آغا صاحب؟" — اس نے بڑے فدویانہ انداز میں کہا — "خادم کو کیسے یاد کیا ہے؟"

"مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرنا رنگو!" — میں نے اس سے کہا — "جو پوچھوں سچ سچ بتا دو گے تو فائدے میں رہو گے"۔

"آپ پوچھیں سرکار!" — رنگو نے کہا — "غلط بیانی کروں تو بے شک کھال اتروا کر بھس بھروا دینا"۔

"تمہیں معلوم ہے کہ دُھرے شاہ مارا گیا ہے؟" — میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں سرکار!" — رنگو نے سنبھل کر کہا — "اڑتی اڑتی خبر سنی تو تھی کہ دُھرے شاہ قتل ہو گیا ہے"۔

"تمہارا کیا خیال ہے رنگو!" — میں نے اس سے پوچھا — "ایسے زبردست آدمی کو کون قتل کر سکتا ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں سرکار!" — رنگو نے کہا — "ہو سکتا ہے کسی کے ساتھ اس کی دشمنی ہو"۔

"تمہاری اور دُھرے شاہ کی بھی تو دشمنی تھی" — میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

وہ ایک دم گھبرا گیا اور نظریں چرانے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"میری بھلا اس کے ساتھ کیا دشمنی ہونی تھی" — اس نے سنبھل کر کہا — "اس سے سب ڈرتے تھے اور میں بھی اس سے بچ کر رہتا تھا"۔

مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ وہ سیدھی بات کرنے کی بجائے گھما پھرا کر بات کر رہا تھا اور مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تمہاری اس کے ساتھ دشمنی تھی یا نہیں؟" — میں نے اسے ڈانٹ کر کہا — "بولو ہاں یا ناں؟"

"نن...... نہیں سرکار!" — رنگو نے گھونٹ سا نگل کر کہا — "میری اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی"۔

میں نے میز پر پڑا ہوا بید کا ڈنڈا اٹھایا اور زور سے میز پر مار کر اس سے کہا کہ وہ کھڑا ہو

جائے۔ وہ ڈنڈے کے دھاکے سے اچھل کر اٹھا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

''دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ'' ـــ میں نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا ـــ ''میں نے تمہاری عزت کی تھی اور کرسی پر بٹھایا تھا'' ـــ میں نے اس کے قریب جا کر کہا ـــ ''میں نے پہلی بات تم سے یہ کہی تھی کہ جھوٹ نہ بولنا مگر تم مسلسل جھوٹ بولتے چلے جا رہے ہو۔ اب دیکھتا ہوں تم کیسے جھوٹ بولتے ہو''۔

وہ پیچھے ہٹتا ہٹتا دیوار سے جا لگا۔ اگرچہ وہ پختہ کار جرائم پیشہ تھا لیکن گھبرا گیا تھا۔

''دلربا کے کوٹھے پر کیا ہوا تھا؟'' ـــ میں نے بید کا ڈنڈا اس کی شہ رگ پر رکھ کر ذرا سا دباؤ ڈال کر پوچھا۔

اب تو وہ اور زیادہ گھبرا گیا اور اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مجھے اس بات کا علم ہو سکتا ہے۔ وہ مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے میں کوئی جادوگر ہوں اور اس کے اندر تک جھانک سکتا ہوں۔

''ویسے تم اپنی زبان کے پکے ہو'' ـــ میں نے اس سے کہا ـــ ''تم نے دُھرے شاہ سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کی قسم کھائی تھی اور اسے قتل کر کے اپنی قسم پوری کر لی''۔

''یہ غلط ہے، بالکل غلط!'' ـــ اچانک اسے جیسے ہوش آ گیا اور وہ ہذیانی سے انداز میں چیخنے لگا ـــ ''میں نے اسے قتل نہیں کیا...... کسی نے آپ کو غلط بتایا ہے''۔

وہ چیخ چیخ کر اور قسمیں کھا کھا کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھانسی کا پھندہ سامنے نظر آ رہا ہو تو بڑے بڑے مجرم دل چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ موت چیز ہی ایسی ہے۔

''اقبالی بیان دے دو اور فائدہ مجھ سے لو'' ـــ میں نے اسے پھسلانے کے لیے لالچ دیا ـــ ''مرنے والے سے ایک دنیا تنگ تھی۔ تم نے اسے قتل کر کے ثواب کا کام کیا ہے۔ میں کیس ایسا ڈھیلا تیار کروں گا کہ جج تمہیں شک کا فائدہ دے کر بری کر دے گا''۔

رنگو پھر رونے اور قسمیں کھانے لگا کہ دُھرے شاہ کو اس نے قتل نہیں کیا۔ اس نے دلربا بائی کے کوٹھے پر ہونے والے جھگڑے کا اعتراف کر لیا اور یہ بھی مان لیا کہ اس نے دُھرے شاہ سے بدلہ لینے کی قسم کھائی تھی۔

''لیکن سرکار یہ قتل میں نے نہیں کیا'' ـــ رنگو نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ـــ ''میں

چھوٹے موٹے جرم ضرور کرتا ہے لیکن قتل جیسا بڑا جرم کبھی نہیں کیا''۔

میں نے اس پر بہت جرح کی اور گھما پھرا کر اپنے مطلب کی بات اُس کے منہ سے نکلوانے کی کوشش کی لیکن وہ اتنا کچا نہیں تھا کہ میرے چکر میں آ جاتا۔ مجھے چونکہ پورا یقین ہو چکا تھا کہ قتل رنگو نے ہی کیا ہے، اس لیے میں نے اس پر تشدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اے ایس آئی غفار سے کہا کہ وہ اسے لے جائے اور اس سے اقبالی بیان حاصل کرے۔ اے ایس آئی اسے لے گیا۔

وہ دن گزر گیا تھا۔ میں تھانے سے اٹھ کر گھر آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ صبح تک میرا عملہ رنگو سے اقبالی بیان لے لے گا۔

اگلے دن تھانے پہنچ کر روزمرہ کے کام نپٹائے۔ اس کے بعد ایک جھگڑے کا کیس آ گیا۔ ان لوگوں کا میں نے راضی نامہ کرا دیا۔ اس میں خاصا وقت ضائع ہو گیا۔ ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اے ایس آئی سے رنگو کے بارے میں پوچھا کہ اس نے اقبالی بیان دینے پر رضامندی ظاہر کی یا نہیں۔

''وہ تو پتھر بن گیا ہے سر!'' ـــ اے ایس آئی نے کہا ـــ ''وہ انکار پر ڈٹا ہوا ہے اور بے پناہ تشدد برداشت کر رہا ہے''۔

میں نے اس کو کہا کہ وہ رنگو کو میرے سامنے پیش کرے۔ اے ایس آئی نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ ملزم رنگو کو لے آئے۔ کانسٹیبل چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد رنگو کو ساتھ لے آیا۔ رنگو کی حالت بہت بری ہو رہی تھی۔ رنگو کرسی پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا جیسے بڑی دور سے بھاگتا ہوا آیا ہو۔ اس نے بڑا ظالمانہ تشدد برداشت کیا تھا۔ میں ایسے تشدد کی اجازت صرف عادی جرائم پیشہ ملزموں کے لیے دیا کرتا تھا۔

''اقبالی ہو جاؤ اور جان چھڑاؤ رنگو!'' ـــ میں نے اس سے کہا ـــ ''ورنہ تمہاری کھال اتار دوں گا''۔

''آپ کے پاس اختیار ہے سرکار!'' ـــ رنگو نے کمزور سی آواز میں کہا ـــ ''آپ میری کھال اتار سکتے ہیں لیکن میں کسی اور کا پھندہ اپنی گردن میں نہیں ڈالوں گا''۔

اس کی آواز میں اگرچہ کمزوری تھی لیکن اس کا لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں اس کی بات پر یقین کر کے اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ

ابھی تک میں نے جتنی بھی تفتیش کی تھی، اس میں رنگو ہی ایک ایسا مشتبہ نظر آیا تھا جس پر دُھرے شاہ کو قتل کرنے کا شک کیا جا سکتا تھا۔ میں نے رنگو کو فی الحال حوالات میں بھجوا دیا اور خود نئے امکانات پر غور کرنے لگا۔

اگر رنگو اور دُھرے شاہ کے جھگڑے کو ایک طرف رکھ دیا جاتا تو پھر دُھرے شاہ کا قتل ایک اندھا قتل بن جاتا جس کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ قتل کی تفتیش کے لیے سب سے پہلے قتل کی وجہ معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے اور اس وقت تک کی تفتیش کے مطابق رنگو کے پاس دُھرے شاہ کو قتل کرنے کی معقول وجہ موجود تھی۔

سوچتے سوچتے اچانک مجھے خیال آیا کہ میں دلربا کو نظرانداز کر رہا ہوں۔ مجھے اس سے بھی پوچھ گچھ کرنی چاہیے تھی۔ اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور اسی وقت ایک حوالدار اور ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر وہاں جا پہنچا۔ دن کے بارہ بجے کے بعد کا وقت تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ مخلوق راتوں کو جاگتی اور دن کو سوتی ہے۔ جس وقت میں وہاں پہنچا۔ وہ ان لوگوں کے ناشتے کا وقت تھا۔

میں جن وقتوں کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت گجرات میں کوئی باقاعدہ بازارِ حسن نہیں تھا، چند لوگ یہ کام کرتے تھے اور انگریز کے وقتوں سے ان کے پاس لائسنس تھا۔ آج کل تو ہر چھوٹے بڑے شہر میں بدی کے یہ مرکز کھل گئے ہیں اور یہ کام پولیس کی سرپرستی میں ہو رہا ہے۔

تھانیدار اپنے علاقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ جب ان لوگوں کو میری آمد کی اطلاع ملی تو ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ فوراً مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا اور دلربا کی ماں میرے پاس آ کر جھک کر آداب بجالائی۔

''ہمارے نصیب جاگ گئے حضور!'' ــــ اس نے میری بلائیں لیتے ہوئے کہا ــــ ''کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ حکم فرمائیں، کیا خدمت کریں؟'' ــــ یہ کہہ کر وہ اپنے کارندوں سے کھانے پینے کا بندوبست کرنے کو کہنے لگی۔

میں نے اس کی خوشامد اور چرب زبانی کو نظرانداز کر کے اسے کھانے پینے کے انتظام سے منع کر دیا۔ میں وہاں بیٹھ کر کنجروں کی کمائی سے کوئی بھی چیز نہیں کھانا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی بیٹی دلربا کو بلا دے، میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔

''بے بی ابھی ابھی سو کر اٹھی ہے'' ــــ اس نے بڑے انداز سے کہا ــــ ''وہ نہا دھو کر

تیار ہو جائے تو میں اسے لے کر آتی ہوں...... ویسے خیر تو ہے نا، لاعلمی میں کوئی قصور ہو گیا ہے ہم سے؟''

''ایک بات ذہن میں رکھو بائی جی!'' ــــ میں نے غصے سے کہا ــــ ''میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے اور نہ ہی میں یہاں مجرا سننے آیا ہوں۔ میں یہاں سرکاری ڈیوٹی پر آیا ہوں، اس لیے فوراً اپنی بیٹی کو وہ جس حال میں بھی ہے، یہاں لے کر آؤ ورنہ پھر تھانے بلوا کر تفتیش کروں گا''۔

اس نے میرے ماتھے پر بل دیکھے تو فوراً کمرے سے نکل گئی اور چند لمحوں کے بعد ایک نوجوان لڑکی کو ساتھ لے کر آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار باقی تھا۔ بڑے خوبصورت نین نقش اور گورے رنگ نے اس میں بے پناہ کشش پیدا کر دی تھی۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی جو اس قسم کے پیشے سے وابستہ لڑکیوں میں کم ہی نظر آتی ہو گی۔ وہ کوئی جسم فروش طوائف نہیں تھی، صرف گانا گاتی تھی اور رقص کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے چہرے پر معصومیت اور جسم میں شادابی قائم تھی اور دُھرے شاہ جیسا بدمعاش اس پر عاشق ہو گیا تھا۔

دلربا نے خالص لکھنوی لب و لہجے اور انداز میں آداب پیش کیا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ بیٹھ گئی۔ اس کے بعد میں نے اس کی ماں سے کہا کہ وہ دلربا کو میرے پاس چھوڑ دے اور کمرے سے باہر نکل جائے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی باہر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے دلربا سے اِدھر اُدھر کی چند باتیں کیں۔ میرا خیال تھا کہ اس کی جھجک اتارنے کے بعد اپنے کام کی باتیں پوچھوں گا۔

''میں جانتی ہوں آپ کیوں آئے ہیں'' ــــ دلربا نے اداس سے لہجے میں میرے کچھ پوچھنے سے پہلے کہا۔

''کیا جانتی ہو؟'' ــــ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''آپ شاہ جی کے متعلق بات کرنے آئے ہیں'' ــــ اس نے کہا ــــ ''آپ ان کے قتل کی تفتیش کر رہے ہوں گے''۔

میں سمجھ گیا کہ وہ دُھرے شاہ کو ''شاہ جی'' کہہ رہی ہے۔ دُھرے شاہ ایسا نامی گرامی بدمعاش تھا کہ اس کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گجرات میں پھیل گئی تھی۔ دلربا کی

اداسی کو دیکھتے ہوئے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی ڈھرے شاہ کے ساتھ جذباتی وابستگی پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے اس کی اسی جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔

''میں نے سنا ہے۔ وہ باقاعدگی سے یہاں آتا تھا'' ___ میں نے کہا۔

''وہ بہت اچھا انسان تھا'' ___ اس نے آہ بھر کر کہا ___ ''اس نے میرے کہنے پر بدمعاشی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اگر وہ قتل نہ ہو جاتا تو میں اس کے ساتھ شادی کا فیصلہ کرچکی تھی'' ___ اس کے ساتھ ہی اسے ہچکی سی آئی اور وہ اپنا دوپٹہ منہ پر رکھ کر سسکنے لگی۔

میں نے اسے رونے دیا۔ جب وہ آنسو بہا کر ہلکی ہوگئی تو میں نے اپنے مطلب کی بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''میں تمہارے شاہ جی کے قاتل کو پکڑنا چاہتا ہوں'' ___ میں نے کہا ___ ''اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ وہ تمہارے ساتھ اپنے دل کی ہر بات کرتا ہوگا..... تم ذرا سوچ کر بتاؤ اس نے کبھی کوئی ایسی بات کی ہو کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہے یا کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہو''۔

وہ میری بات سن کر کچھ سوچنے لگی۔ غالباً وہ اپنے ذہن میں الفاظ کو ترتیب دے رہی تھی۔

''رنگو کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوگیا تھا'' ___ دلربا نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا ___ ''یہ کچھ دن پہلے کی بات ہے'' ___ پھر اس نے وہی بات سنادی جو میں اپنے مخبر کی زبانی پہلے ہی سن چکا تھا۔

''اور سوچو، اور غور کرو'' ___ میں نے اس سے کہا ___ ''بے شک کوئی معمولی بات ہو''۔

''وہ میرے ساتھ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی کرتا تھا'' ___ اس نے کہا ___ ''ایک روز باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ اس نے ایک بارات کے ساتھ جاتی ہوئی دلہن کو روک لیا تھا اور اسے ساتھ لے جانے لگا تھا مگر پھر دلہن کی منت سماجت اور آہ وزاری کی وجہ سے اسے جانے دیا''۔

یہ سن کر میں چونک پڑا۔ یہ ایسی بات تھی کہ کوئی بھی غیرت مند انسان مرنے مارنے پر اتر سکتا ہے۔ میں نے اسے سے پوچھا کہ یہ واقعہ کتنے دن پہلے کا ہے۔

''تقریباً ہفتہ پہلے کا ہوگا'' ___ اس نے سوچ کر کہا۔

''کیا اس نے کچھ اور بھی بتایا تھا؟'' ___ میں نے پوچھا ___ ''مثلاً یہ کہ بارات کہاں سے آرہی تھی اور کہاں جارہی تھی اور اس کے علاوہ دولہا کون تھا وغیرہ وغیرہ''۔

''بارات رحیم پور واپس جارہی تھی'' ___ اس نے کہا ___ ''یہ نہیں معلوم کہ دلہن کو کہاں سے لے آرہی تھی''۔

میرے لیے اتنی معلومات ہی کافی تھی کہ دولہا کے گاؤں کا پتہ لگ گیا تھا۔ میں نے کرید کرید کر دلربا سے بہت سی باتیں پوچھیں لیکن اس سے کام کی کوئی بات معلوم نہ ہوسکی۔ میں نے اس کو یقین دلایا کہ میں جلد ہی اس کے ''شاہ جی'' کے قاتل کو پکڑلوں گا۔ پھر میں نے دیکھا کہ دلربا کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ مجھے اس کی جذباتی وابستگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں وہاں سے سیدھا تھانے آگیا۔

رحیم پور میرے تھانے کے علاقے کا گاؤں تھا۔ میرے لیے یہ معلوم کرنا مشکل نہیں تھا کہ ہفتہ دس دن یا اس سے زیادہ دن پہلے گاؤں میں کس کی شادی ہوئی ہے۔ یہ کام میں نے پولیس کے ذریعے کرنے کی بجائے مخبروں کے ذریعے کرنا بہتر سمجھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ بات ایسی تھی جس کی بھنک بھی ان لوگوں نے کسی کو نہ ملنے دی ہوگی کہ ان کی نئی نویلی دلہن کو کسی غنڈے بدمعاش نے روک لیا تھا۔

میرے مخبروں میں ایک عورت بھی تھی۔ یہ انتہائی چالاک عورت تھی۔ لوگوں کے گھروں کے اندر تک کے راز نکال لاتی تھی۔ اس کا نام ذکیہ تھا۔ میں نے ذکیہ کو تھانے طلب کر کے اسے ساری بات سمجھا دی کہ کیا واقعہ ہوا تھا اور اس نے کیا معلوم کرنا ہے۔

ذکیہ چلی گئی اور پھر دوسرے دن میرے پاس آئی۔ وہ راز کی بات نکال لائی تھی۔ اس نے ایک نئی ہی بات سنادی۔ یہ بات میں آپ کو اپنے الفاظ میں سنادیتا ہوں۔

ذکیہ نے اس شخص کا سراغ لگالیا تھا جس کی شادی حال ہی میں ہوئی تھی۔ اس کا نام خضر شاہ تھا اور اس کی دلہن سلمٰی کا تعلق بھلے وال سے تھا۔ ذکیہ نے ایک ایسی عورت سے دوستی گانٹھ لی جو سلمٰی کے بہت قریب تھی اور اس کی سہیلی بن گئی تھی۔ یہ ذکیہ کی فنکاری تھی کہ اس نے دلہن سلمٰی کی سہیلی کے سینے سے وہ بات نکال لی جو بہت چھپا کر رکھی گئی تھی۔

خضر شاہ کی شادی بھلے وال میں ہوئی تھی۔ فاصلہ تو زیادہ نہیں تھا لیکن گرمیوں کے دن

ہونے کی وجہ سے لڑکی والوں نے رخصتی کا وقت سورج ڈھلنے کے بعد کا رکھا تھا۔ اس لیے دوسرے مہمان تو کھانا کھانے کے بعد اپنے طور پر گھروں کو چلے گئے تھے اور بارات کے ساتھ خاص خاص رشتہ دار ہی رہ گئے تھے جن کی تعداد پندرہ سولہ کے لگ بھاگ ہوگی۔

یہ لوگ دلہن کو لے آ گئے۔ اس وقت کے رواج کے مطابق دلہن ڈولی میں بیٹھی تھی اور ڈولی کو چار کہاروں نے اٹھا رکھا تھا۔ دولہا آگے آگے گھوڑے پر سوار چل رہا تھا۔ جب یہ لوگ رحیم پور کے قریب پہنچ گئے تو دولہا خضر شاہ یہ کہہ کر گھوڑے کو دوڑاتا ہوا آگے چلا گیا کہ وہ گھر پہنچ کر دلہن کے آنے کی اطلاع کرتا ہے تاکہ وہ لوگ دلہن کے استقبال کی تیاری کر لیں۔

دولہا چلا گیا تو ڈولی پندرہ سولہ باراتیوں کے ساتھ چل پڑی۔ جب وہ اس علاقے میں پہنچے جہاں دُھرے شاہ کی بادشاہی تھی تو اچانک دُھرے شاہ نے ان کا راستہ روک لیا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں سیسہ بھری وزنی لاٹھی تھی۔ ڈولی کے ساتھ جتنے بھی لوگ تھے وہ ڈر گئے۔ اس وقت دُھرے شاہ کا نام ہی دہشت کے لیے کافی تھا۔

باراتیوں کا خیال تھا کہ دُھرے شاہ ان کی جیبیں خالی کرائے گا لیکن اس وقت سب لوگ پریشان ہو گئے جب دُھرے شاہ نے دلہن کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ انہوں نے دُھرے شاہ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ اس نے دلہن کو ڈولی سے باہر نکال لیا اور کسی نے مزاحم ہونے کی کوشش نہ کی۔

دلہن سلمٰی بڑی سمجھدار اور باحوصلہ لڑکی تھی۔ اس نے صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھ لیا اور بڑی جرأت و حکمت عملی سے کام لیا۔

''سنا ہے تم سیّد ہو دُھرے شاہ!'' — اس نے دُھرے شاہ سے کہا — ''میں بھی سیّد ہوں۔ تمہیں ایک سیّدزادی کی عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہم دونوں خاندانوں کی عزت کا بھرم رکھنا تمہارا فرض ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر تم طاقت کے نشے میں مست ہو کر ضرور ہی ایسا کرنا چاہتے ہو تو میری ایک شرط مان لو''۔

''شرط بتاؤ'' — دُھرے شاہ نے کہا — ''ماننے والی ہوئی تو مان لوں گا''۔

''تم مجھے یہاں سے جانے دو'' — دلہن سلمٰی نے کہا — ''مجھے ہاتھ بھی نہ لگانا۔ میں گھر جا کر اپنے خاوند کو ساری بات سناؤں گی، اگر اس کے اندر جرأت اور غیرت ہوئی تو وہ تم سے خود نپٹ لے گا...... اور اگر اس نے بے غیرتی یا بزدلی کا مظاہرہ کیا تو میں اس سے علیحدگی

حاصل کر کے خود تمہارے پاس آ جاؤں گی۔ اگر تم مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو تو مجھ سے نکاح کر لینا...... ایک بات ذہن میں رکھو، اگر تمہارے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال ہے کہ زبردستی کر لو گے تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ یہ ایک سیّدزادی کا وعدہ ہے تم سے''۔

دُھرے شاہ کی مردانگی نے یہ بات گوارہ نہ کی کہ ایک لڑکی کے چیلنج سے منہ موڑے۔ اس نے دلہن سلمٰی کا یہ چیلنج قبول کر لیا اور اس کو دو ہفتے کی مہلت دی کہ اس دوران اگر اس کے شوہر خضر شاہ نے اسے قتل نہ کیا یا اس کے سامنے نہ آیا تو سلمٰی خود اس کے پاس آ جائے۔ اگر سلمٰی نہ آئی تو وہ اس کے شوہر کو قتل کر کے اسے اٹھا لائے گا اور بے نکاحی بیوی بنا لے گا۔

اس کے بعد اس نے سلمٰی کو ڈولی میں واپس بٹھایا اور جانے کی اجازت دے دی۔

اپنے شوہر کے گھر آ کر اس نے ساری بات اپنے دولہا خضر شاہ کو بتائی۔ خضر شاہ نے اس کو تسلی دی کہ وہ بالکل فکر نہ کرے۔ وہ اس کی عزت کی حفاظت اپنی جان پر کھیل کر بھی کرے گا اور دُھرے شاہ سے نمٹ لے گا۔

اس کے بعد خضر شاہ نے گھر میں موجود اس واقعے کے گواہ رشتہ داروں سے کہا کہ وہ اس واقعے کو اپنے تک محدود رکھیں اور یہ بات باہر نہ نکلنے دیں۔ ان سب لوگوں نے تو اس بات کو اپنے سینوں میں دبا لیا لیکن سلمٰی خود رازداری نہ رکھ سکی اور عورت کی فطری کمزوری کا شکار ہو گئی۔ سیانوں نے سچ کہا ہے کہ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔

سلمٰی نے باتوں باتوں میں یہ بات اپنی سہیلی کو سنا دی اور رازداری رکھنے کا وعدہ بھی لیا لیکن وہ یہ بات بھول گئی تھی کہ جسے وہ بات راز رکھنے کو کہہ رہی ہے وہ ابھی ایک عورت ہے۔ اس عورت کے پیٹ سے یہ راز میری مخبر ذکیہ نے نکال لیا۔

دیکھا جائے تو اس مخبر عورت ذکیہ نے میرا سارا مسئلہ ہی حل کر دیا تھا۔ اب مجھے پکا یقین ہو گیا تھا کہ دُھرے شاہ سلمٰی کے شوہر خضر شاہ کے ہاتھوں قتل ہوا ہے۔ میں نے ذکیہ کو شاباش دی اور اپنی جیب سے نقد انعام بھی دیا۔ اب میرا کام آسان ہو گیا تھا۔

میں نے اسی وقت اے ایس آئی غفار کو بلایا اور اس سے کہا وہ رحیم پور چلا جائے اور خضر شاہ کو اپنی حراست میں لے کر تھانے لے آئے۔ میں نے ان لوگوں کی گاؤں میں عزت کے خیال سے اے ایس آئی سے یہ بھی کہا کہ وہ کوشش کرے کہ خضر شاہ کو ہتھکڑی نہ لگانی پڑے۔ وہ

میری بات سمجھ گیا اور چلا گیا۔

میں بے چینی سے خضر شاہ کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

خاصی دیر بعد اے ایس آئی نے آکر بتایا کہ خضر شاہ اسی روز سے گھر سے غائب ہے جس روز ڈھرے شاہ لاش ملی تھی۔ اس کے گھر والوں سے پوچھا تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

صورتِ حال ایسی ہوگئی تھی کہ خضر شاہ نے گھر سے غائب ہو کر اپنے خلاف اس شک کو پختہ کر دیا تھا کہ مقتول ڈھرے شاہ کو اسی نے قتل کیا ہے۔ میں نے ایک بار پھر اپنے مخبروں کا جال ہر طرف پھیلا دیا۔ ان لوگوں نے یہ معلوم کرنا تھا کہ خضر شاہ کے دوست کون کون سے ہیں اور وہ کہاں روپوش ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے ایک مخبر کی مستقل ڈیوٹی خضر شاہ کے گھر لگا دی کہ وہ خفیہ طور پر گھر پر نظر رکھے اور جونہی خضر شاہ گھر آئے، فوراً تھانے اطلاع کر دے۔

ایک دن گزر گیا اور خضر شاہ کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ پھر دوسرا دن بھی گزر گیا۔ خضر شاہ یوں غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ میں نے دو تین جگہوں پر چھاپے بھی مارے لیکن خضر شاہ کہیں نہ ملا۔

اسی رات کے دس گیارہ بجے کا وقت ہوگا جب تھانے سے اطلاع آئی کہ اس مخبر نے جو خضر شاہ کے گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔ اطلاع دی ہے کہ خضر شاہ اپنے گھر آیا ہوا ہے۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اسی وقت چھاپہ مارنے کا بندوبست کیا اور اے ایس آئی اور چار کانسٹیبلوں کو خضر شاہ کے مکان کے پچھلی طرف اور اِدھر اُدھر پھیلا دیا تا کہ وہ دیوار پھلانگ کر بھاگ نہ سکے۔

اس کے بعد میں نے دروازے پر دستک دی۔ خضر شاہ کوئی عادی جرائم پیشہ شخص نہیں تھا۔ اس لیے کسی مزاحمت کا خطرہ نہیں تھا۔ مخبر شناخت کے لیے ہمارے ساتھ تھا۔ ہم میں سے کسی نے بھی خضر شاہ کو نہیں دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک عمر رسیدہ شخص نے دروازے کھولا اور وردی میں پولیس والوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ یہ خضر شاہ کا باپ تھا۔

''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ خضر شاہ گھر میں ہے'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''اسے کہیں کہ وہ خود پیش ہو جائے ورنہ میں گھر کے اندر داخل ہو کر اسے گرفتار کرلوں گا''۔

اس بوڑھے نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا اور پھر اس آنکھیں بھر آئیں۔ وہ کچھ کہے بغیر اندر کی طرف مڑا اور تھوڑی دیر بعد ایک جوان عمر آدمی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ مخبر نے مجھے سرگوشی میں کہا کہ یہی خضر شاہ ہے۔

خضر شاہ نے رسمی طور پر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا میں نے اس سے کہا کہ وہ کلہاڑی بھی برآمد کرا دے جس سے اس نے ڈھرے شاہ کو قتل کیا ہے۔ اس نے آمادگی ظاہر کر دی۔ میں نے محلے کے دو معززین کو جگا کر برآمدگی کی گواہی کے لیے ساتھ لیا۔

خضر شاہ نے گواہوں کے سامنے ایک بڑی ہی خوبصورت کلہاڑی جو ایک دیوار پر ٹنگی ہوئی تھی اتار کر مجھے دے دی اور ہم اسے لے کر تھانے آ گئے۔ میں نے ضروری کارروائی کے بعد خضر شاہ کو حوالات میں بند کروا دیا اور باقی کا کام اگلے دن کے لیے چھوڑ دیا۔

اس رات میں بڑی گہری اور سکون کی نیند سویا۔ صبح اٹھا تو بالکل تازہ دم تھا۔ تیار ہو کر تھانے پہنچا اور خضر شاہ کو اپنے پاس بلوالیا۔ کانسٹیبل اسے لے کر آیا تو میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گیا تو میں نے اس سے کہا کہ حالات و واقعات اور شواہد اس کے خلاف ہیں۔ بہتر ہے کہ وہ خود ہی اقبالی بیان دے دے۔

وہ بڑا صحت مند اور خوبصورت جوان تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ یا پچھتاوا نظر نہیں آ رہا تھا۔

''آپ میرا اقبالی بیان لکھ لیں'' ـــــ اس نے بڑے حوصلے سے کہا ـــــ ''ڈھرے شاہ کو میں نے قتل کیا ہے''۔

اس کے بعد خضر شاہ نے بڑی تفصیل سے ہر بات بتا دی۔ درمیان میں، میں اس سے سوال بھی پوچھتا گیا۔ اس طرح جو بات سامنے آئی وہ بھی آپ کو سنا دیتا ہوں۔ پہلے کے واقعات میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ کس طرح ڈھرے شاہ نے خضر شاہ کی دلہن کو اغوا کرنا چاہا تھا۔

دلہن سلمٰی نے جب خضر شاہ کو ساری بات سنائی تو اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے اسی وقت ڈھرے شاہ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا لیکن وہ اتنا زبردست بدمعاش تھا کہ وہ اس سے مقابلہ کر کے اسے قتل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے ڈھرے شاہ کو قتل نہ کیا تو وہ اسے قتل کر کے اس کی بیوی پر قبضہ کر لے گا۔

اس نے بڑے ہی خوبصورت دستے والی ایک کلہاڑی بنوا رکھی تھی جسے وہ باہر کہیں آتے

جاتے ہوئے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

وقوعے والے دن شام آٹھ نو بجے وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔ اچانک اسے گندے نالے کے قریب دُھرے شاہ نظر آیا۔ وہ بلند آواز سے کوئی فلمی گیت گا رہا تھا۔ اس کی آواز اور چلنے کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ وہ لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔

خضر شاہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور دُھرے شاہ کے پاس جا کر ایک زوردار وار کلہاڑی کا اس کی گردن پر کیا۔ دُھرے شاہ کے منہ سے ہائے کی آواز نکلی اور وہ ایک طرف گھوم گیا۔ خضر شاہ نے دو اور وار کئے تو دُھرے شاہ زمین پر گر پڑا۔ آگے نالے کی ڈھلوان تھی اور نالہ خاصی گرائی میں تھا۔ دُھرے شاہ اس ڈھلوان سے لڑھکتا ہوا نالے میں جا گرا۔ وہ کیچڑ کے اندر دھنس گیا تھا۔

خضر شاہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ خضر شاہ بڑے اطمینان سے وہاں سے اپنے گھر آ گیا اور خون آلود کلہاڑی اچھی طرح دھو کر دیوار پر ٹانگ دی۔ اس نے اپنی بیوی اور باپ کو بتا دیا کہ وہ کیا کر آیا ہے۔ پولیس نے تفتیش شروع کی تو وہ گھبرا گیا۔ وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا۔ بلکہ سیدھا سادہ دیہاتی تھا۔ جب پہلی مرتبہ میں نے اے ایس آئی کو اس کی گرفتاری کے لیے بھیجا تو اس کے باپ نے جھوٹ بول کر ٹال دیا اور کہا کہ وہ گھر میں نہیں ہے حالانکہ خضر شاہ اس وقت گھر میں ہی چھپا ہوا تھا۔

اس کے بعد وہ اپنے ایک دوست کے پاس کھاریاں چلا گیا۔ گرفتاری والی رات وہ گھر والوں سے اور اپنی نئی نویلی دلہن سے ملنے آیا تھا کہ مخبر نے تھانے اطلاع کر دی۔

میں نے اس کا بیان لکھ کر اس سے دستخط کروا لئے اور پھر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے اس کا بیان کروا دیا۔

جو مارا گیا تھا وہ معاشرے کے لیے ایک تکلیف وہ پھوڑے کی طرح تھا اور اس نے شریف لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ مجھے خضر شاہ کا بڑا خیال آ رہا تھا۔ اس کی ابھی حال میں شادی ہوئی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی المیے کا شکار ہو۔ جب میں نے کیس تیار کیا تو اس میں جان بوجھ کر ایک دو ایسے سقم رکھ دیئے جو خضر شاہ کے حق میں جاتے تھے۔

بہرحال مقدمہ چلا۔ خضر شاہ کا وکیل اتنا ذہین نہیں تھا۔ وہ میرے چھوڑے ہوئے سقم

سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکا تھا۔ جج نے خضر شاہ کو سات سال قید با مشقت کی سزا سنا دی۔

میں نے خضر شاہ کے باپ کو الگ کر کے سمجھایا کہ وہ سیشن کورٹ میں اس سزا کے خلاف اپیل کریں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس سے کہا کہ وہ کوئی دوسرا وکیل کریں جو تجربہ کار ہو۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔

انہوں نے اپیل کر دی۔ یہ وکیل بڑا تجربہ کار تھا۔ اس نے میرے چھوڑے ہوئے سقم سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور خضر شاہ کو اپیل میں صاف بری کروا لیا۔

ہوسکتا ہے پڑھنے والے میرے اس اقدام کو غلط کہیں کہ میں نے ایک قاتل کی مدد کر کے غلط کام کیا ہے لیکن میری نیت نیکی کی تھی اور میرے ضمیر پر اس کا کوئی بوجھ نہیں

میں شرمسار نہیں ہوں

آپ جناب احمد یار خان کی کہانیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ کہانیاں بہت ہی دلچسپ ہوتی ہیں۔ میں بھی ایک کہانی پیش کرتا ہوں جو میری نہیں، ایک مخبر کی ہے۔ احمد یار خان صاحب کی کہانیوں سے آپ مخبروں سے واقف ہو گئے ہوں گے۔ ضروری نہیں ہوتا کہ مخبر (انفارمر) پولیس کا ملازم ہو۔ یہ کام عام شہری بھی کرتے اور اُجرت وصول کرتے ہیں۔ یہ کام جرائم پیشہ افراد بھی کیا کرتے ہیں۔ اس سے وہ پولیس کو خوش رکھتے ہیں۔ مخبروں کے بغیر پولیس کا کام نہیں چل سکتا۔ شہر میں کوئی واردات ہو جائے تو مخبر لوگوں میں گھل مل کر ایسی راز کی باتیں معلوم کر لیتے ہیں جو پولیس معلوم نہیں کر سکتی۔ عورتیں بھی مخبری کرتی ہیں۔ بلکہ کامیاب مخبری عورتوں کی ہی ہوتی ہے۔ میں چونکہ خود کچھ عرصہ پولیس میں رہا ہوں اس لیے مخبروں کی اہمیت کو جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ بعض تھانیدار تفتیش کی محنت اور مغز کھپائی سے بچنے کے لیے مخبروں کا سہارا زیادہ لیتے ہیں اور مقدمہ قائم کرنے کے لیے تھرڈ ڈگری (تشدد اور چھینٹی) سے کام لیتے ہیں۔

میں جس مخبر کی کہانی سنانے لگا ہوں ان سے میری ملاقات اتفاقیہ نہیں ہوئی تھی۔ ہمارا ساتھ بہت پرانا ہے۔ یہ سرحد کے اس طرف کے گہرے تعلقات ہیں جو اس طرف آ کر بھی قائم رہے۔ عمر میں فرق ضرور ہے۔ وہ مجھ سے پندرہ سال بڑے ہیں۔ وہ چونکہ اس طرف مخبر کی حیثیت سے پولیس کے ساتھ وابستہ رہے ہیں اور میں نے پولیس کی نوکری کی ہے اس لیے ہم اکثر جرائم اور تفتیش کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ایک روز میں نے انہیں اپنی ایک تفتیشی کہانی سنائی تو وہ کسی سوچ میں پڑ گئے۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں تو وہ ہنس پڑے اور بولے ___ ''مجھے قتل کی بہت پرانی واردات یاد آ گئی ہے۔ میں اس میں پولیس کا مخبر تھا۔ اگر تم اس کیس کی تفتیش کر رہے ہوتے تو کبھی قاتل کو نہ پکڑ سکتے''۔

میری فرمائش پر انہوں نے قتل کی یہ واردات سنائی اور مجھ سے وعدہ کیا کہ ان کا نام اور پتہ ظاہر نہیں ہونا چاہئے۔ یہ مشرقی پنجاب (بھارت) کے ایک قصبے کی واردات ہے جو میں آپ کو اس مخبر کی زبانی سناتا ہوں۔

''ایک کم چالیس سال گزر گئے ہیں۔ میں اس وقت تک چھ وارداتوں میں پولیس کے لیے مخبری کر چکا تھا اور اس کام کا بہت تجربہ ہو گیا تھا۔ میرا ذریعہ معاش تو کچھ اور تھا جو باعزت تھا، مخبری سے بھی کافی پیسے مل جاتے تھے۔ میں نے قصبے کی دو عورتوں کو اپنی کامیابی کا ذریعہ بنا رکھا تھا جو زمین کے نیچے سے بھی بھید نکال لاتی تھیں۔ ہر قماش کے لوگوں کے ساتھ میرا تعلق تھا۔ خدا نے مجھے جلسازی کا وصف عطا کیا تھا۔ قبرستان کے تکیئے میں جوا کھیلنے والوں اور چرس پینے والے ملنگوں کے ساتھ بھی میری دوستی تھی اور شہر کے معزز لوگوں میں بھی اٹھنا بیٹھنا تھا۔ میں سرکاری دفتروں میں لوگوں کے رکے ہوئے کام نکلوا دیا کرتا تھا۔ ماتم ہندو کے گھر ہو، سکھ کے گھر یا کسی مسلمان کے گھر، میں وہاں موجود ہوتا تھا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں پولیس کا مخبر ہوں حالانکہ میں اکثر تھانے جایا کرتا تھا۔ لوگ غالباً یہ سمجھتے تھے کہ میں کسی کا کوئی کام کروانے جاتا ہوں......

''ایک صبح اطلاع ملی کہ شہر (جو درمیانہ سا قصبہ تھا) کے باہر کھیتوں میں ایک جوان آدمی کی لاش ملی ہے جسے چاقوؤں سے قتل کیا گیا ہے۔ جس جس کے کان میں یہ خبر پڑی وہ کھیتوں کی طرف دوڑتا گیا۔ میں بھی گیا۔ راستے میں کسی نے بتایا کہ شفیق قتل ہو گیا ہے۔ میں وہاں پہنچا تو پولیس بھی آ گئی۔ تھانیدار مسلمان تھا۔ یہ ان تھانیداروں میں سے تھا جو مخبروں سے تفتیش کرایا کرتے، چھینٹی چڑھا کر اقبال جرم کراتے اور وعدہ معاف گواہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ تھانیدار کوئی نالائق اور بددیانت آدمی نہیں تھا۔ اس کا رشوت کا ریٹ واجبی تھا۔ غریب آدمی جو دے دے لے لیتا تھا۔ امیر آدمی کو اپنا بھاؤ خود بتایا کرتا تھا، لیکن قتل ڈکیتی نقب زنی کی وارداتوں میں محتاط ہو جاتا تھا یہ بڑی سنگین وارداتیں ہوتی ہیں۔ تفتیش دل لگا کر کرتا تھا مگر مخبروں پر اسے زیادہ ہی بھروسہ تھا۔ اس نے زندگی میں اچھے کام بھی کیے، بُرے بھی کیے، شاید بُرے زیادہ کیے ہوں گے لیکن جس طرح اس نے خدا کے حضور اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا اس سے اس کے گناہ بخشے گئے ہیں۔ وہ شہید ہوا تھا......

''اسے شہادت اس طرح نصیب ہوئی کہ اگست 1947ء میں پاکستان بنا تو ہندوؤں

اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی مستورات اغوا کیں، لوٹ مار کی اور گھر جلائے۔ اس تھانیدار کا گاؤں جب کافروں کی زد میں آیا تو وہ گاؤں میں موجود تھا۔ وہ اپنے خاندان کو پاکستان لے جانے کے لیے گیا تھا مگر حملہ ہو گیا۔ اس کے پاس ریوالور تھا۔ گاؤں میں دو شکاری بندوقیں تھیں۔ اس نے مورچہ باندھ لیا اور گاؤں کے مسلمانوں کی کمان سنبھال لی کہتے ہیں کہ اس نے بہت مقابلہ کیا۔ ریوالور کی گولیاں ختم ہو گئیں تو ایک بوڑھے ریٹائرڈ صوبیدار کے ہاتھ سے شکاری بندوق لے لی۔ اس کی للکار نے گاؤں کے مسلمانوں کے حوصلے بلند رکھے۔ اس نے ایک کام یہ بھی کیا کہ گاؤں میں سکھوں کے چار پانچ گھر تھے جن میں سات آٹھ جوان عورتیں تھیں۔ اس نے ان عورتوں کو ایک مکان کی چھت پر کھڑے کر کے بلوائیوں کو للکار کر کہا ـــــ 'اگر تم لوگ واپس نہ گئے تو تمہاری ان عورتوں کو ننگا کر دوں گا'......

''حملہ آوروں کے پاس بھی چند ایک بندوقیں تھیں۔ باقی سب برچھیوں، کلہاڑیوں اور کرپانوں سے مسلح تھے۔ ان کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ان پر اپنی عورتوں کی بے حرمتی کا کچھ اثر نہ ہوا۔ تھانیدار نے دو آدمی بلا کر دو عورتوں کے کپڑے پھاڑ کر اتار دیئے۔ بلوائی حملے کے کے لیے کسی نہ کسی طرف سے آگے بڑھنے کی کوشش بار بار کرتے تھے۔ وہ جدھر سے بھی آتے تھے ایک ہی گولی انہیں روک لیتی تھی۔ مسلمان عورتوں نے اس دوران اینٹیں اور پتھر اکٹھے کر کے چھتوں پر رکھ لیے۔ شام کو بلوائی ناکام ہو کر چلے گئے۔ تھانیدار نے تمام مسلمان کنبوں کو وہاں سے نکالا اور خود نگرانی کے لیے پیچھے رہا۔ اس کا اپنا خاندان بھی نکل گیا۔ وہ خود یہ دیکھ کر کہ گاؤں میں کوئی مسلمان نہیں رہ گیا۔ جانے ہی والا تھا کہ گاؤں کے تین سکھوں نے اسے گھیر لیا اور اس کے جسم کا قیمہ کر دیا۔ اس کے گاؤں کے تمام افراد جن میں جوان لڑکیاں بھی تھیں بخیریت (لیکن بڑی دشواری سے) پاکستان پہنچ گئے تھے۔ اس کی شہادت کا یہ واقعہ مجھے ایک تھانیدار نے ہی 1949ء میں سنایا تھا۔ وہ مغویہ لڑکیوں کی بازیابی کے لیے مشرقی پنجاب گیا تھا تو اسے اس گاؤں کے سکھوں نے سنایا تھا......

''اس سے گیارہ سال پہلے کا واقعہ ہے جب میرے قصبے کے باہر آفاق نام کا ایک جوان آدمی قتل ہو گیا۔ اس وقت یہ تھانیدار وہاں ایس ایچ او تھا۔ وہ اپنے ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کے ساتھ موقعۂ واردات پر پہنچا۔ میں بھی گیا۔ لاش اوندھے منہ پڑی تھی۔ تماشائی ذرا دور کھڑے تھے۔ مقتول کے عزیز رشتہ دار دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ تماشائیوں میں

سے کسی نے مجھے بتایا کہ مقتول شام کے بعد گھر سے نکلا تھا پھر گھر نہیں گیا۔ اس کا باپ اسے ڈھونڈتا رہا تھا۔ تھانیدار کو دیکھ کر میں آگے چلا گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تھانیدار نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ میں مخبری شروع کر دوں۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ وہاں سے کچھ معلومات حاصل کرنی تھیں۔ کھوجی کو بلایا گیا۔ وہاں تین قسم کے کھرے تھے۔ ایک مقتول کے اور ایک ننگے پاؤں کے۔ لاش جس کھیت میں پڑی تھی وہاں ہل چلا ہوا تھا۔ مٹی نرم تھی۔ اس پر کھرے صاف تھے۔ ننگے پاؤں والا کھرا لاش کے بالکل قریب دکھائی دے رہا تھا۔ مینڈھ پکی تھی۔ وہاں اس کا کوئی نشان نہ تھا۔ کھوجی نے بیس پچیس قدم دور یہی کھرا ڈھونڈ لیا۔ یہ آدمی ننگے پاؤں قبرستان کی طرف سے آیا تھا۔ وہاں سے قبرستان دو اڑھائی سو گز کے فاصلے پر تھا......

''لاش کے قریب سے یہ کھرا شہر کی طرف گیا۔ دو تین خالی کھیتوں میں بھی یہ کھرا نظر آیا۔ مقتول کا کھرا جو موقعہ واردات پر تھا۔ اس کے پاؤں کے یہ نشان بتاتے تھے کہ اس نے قاتل کا مقابلہ کرنے یا چاقو کے وار روکنے کی کوشش کی ہے۔ انہی پر ننگے پاؤں کے صاف نشان تھے اور ان میں ایک اور جوتی کا بھی نشان تھا جو زیادہ صاف نہیں تھا۔ ننگے پاؤں والا چونکہ قبرستان کی طرف سے آیا تھا اس لیے مقتول کا کھرا بھی کھوجی نے ادھر تلاش کیا۔ ایک کچی قبر کے قریب مٹی کچی تھی وہاں یہ کھرا مل گیا۔ تیسرا کھرا کہیں اور نہ ملا۔ کھوجیوں کی استادی کو کھوجی ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس کھوجی نے بتایا کہ مقتول قبرستان کی طرف سے آیا۔ ننگے پاؤں والا بھی ادھر سے ہی آیا لیکن مقتول کے راستے سے ذرا ہٹ کر۔ یہاں آ کر ننگے پاؤں والے نے اس پر چاقو سے حملہ کیا۔ مقتول مر گیا تو ننگے پاؤں والا کچھ [illegible] کے پاس کھڑا رہا۔ وہ شاید یہ دیکھ رہا ہوگا کہ اس کا شکار مر گیا ہے یا ابھی زندہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مقتول کی جیب سے رقم نکالنے کے لیے رکا یا بیٹھا ہو۔ تیسرے کھرے کے متعلق کھوجی نے بتایا کہ قاتل کا ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قتل کے بعد یہ آدمی ادھر سے گزرا اور لاش دیکھنے کے لیے رک گیا......

''لاش کی جامہ تلاشی لی گئی۔ اس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ لاش پر تین زخم تھے۔ ایک پیٹھ پر اور دو سامنے سینے میں۔ خون بہت ہی زیادہ نکلا تھا۔ تھانیدار نے کہا کہ آلۂ قتل نے دل کو چیر دیا ہے۔ لاش پوسٹمارٹم کے لیے بھجوا دی گئی۔ تھانیدار نے مقتول کے باپ سے ضروری باتیں پوچھیں۔ میں بھی اسی جگہ کا رہنے والا تھا اور مقتول کو اچھی طرح جانتا تھا۔ کوئی چھ

مہینے گزرے اس نے بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ اس کے ساتھ مقتول نے سات سال گزارے تھے۔ تین مہینے گزرے اس نے دوسری شادی کی تھی۔ قتل کی یہ بھی ایک معقول وجہ تھی۔ مقتول کے باپ نے طلاق کی وجہ یہ بتائی کہ اولاد نہیں ہوتی تھی۔ دوسری وجہ یہ کہ پہلی بیوی کا چال چلن مشکوک تھا۔ میاں بیوی میں ناچاقی رہتی تھی۔ بیوی کے متعلق مقتول کے باپ نے بتایا کہ جھگڑالو طبیعت کی نہیں تھی۔ بولتی کم تھی، روتی زیادہ تھی۔ تھانیدار نے باپ سے پوچھا کہ یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ پہلی بیوی کے بھائیوں یا باپ نے اسے انتقاماً قتل کیا یا کروایا ہو؟ باپ نے کہا یہ ممکن ہوسکتا ہے۔ پہلی بیوی کے ایک بھائی نے مقتول کو بڑی سخت دھمکی دی تھی۔ الفاظ یہ تھے کہ تم دوسری شادی کر کے دیکھو۔ تمہارے ماں باپ ساری عمر روتے رہیں گے......

''تھانیدار نے یہ سمجھ کر کہ قتل کا باعث یہ طلاق اور دوسری شادی ہے، مجھے کہا کہ میں پہلی بیوی، اس کے بھائیوں اور باپ کو تھانے آنے کو کہوں۔ تماشائیوں میں پہلی بیوی کا ایک بھائی مل گیا۔ میں نے اسے تھانیدار کا پیغام دیا اور خود تھانیدار کے پاس چلا گیا۔ اس نے دو تین آدمیوں کو ساتھ بٹھا کر کاغذات تیار کیے اور مجھے اشارہ کیا کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔ کاغذی کارروائی سے فارغ ہو کر وہ مجھے اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔ راستے میں اس نے مجھ سے پوچھا کہ مقتول اور پہلی بیوی کے بھائی کس قماش کے لوگ ہیں۔ میں ان سب کے اندر باہر کے حالات سے واقف تھا۔ میں نے تھانیدار کو بتایا کہ مقتول پھوکا (کھوکھلا) آدمی تھا۔ یہ اس کا دماغی مرض تھا کہ اپنے آپ کو ہیرو سمجھتا تھا۔ بڑ ہانکتا تھا اور دوستوں کو اپنے معاشقے سناتا رہتا تھا جو فرضی اور بے بنیاد، ہوتے تھے۔ غیبت کا عادی تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں کی چار پانچ خوبصورت لڑکیوں کے متعلق اکثر کہا کرتا تھا کہ اس پر مرتی ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ اس میں کوئی ایسا وصف نہیں تھا جس کی بدولت کوئی اسے ذرا سی دیر کے لیے بھی پسند کرتا۔ درمیانہ درجے کے خاندان کا آدمی تھا، یعنی امیر نہ غریب۔ خاندان میں کوئی برائی نہیں تھی۔ یہ اس خاندان کا واحد فرد تھا جو غلط راستے پر چل پڑا تھا۔ قبرستان میں ایک تکیہ تھا جہاں جواری جوا کھیلا کرتے تھے۔ مقتول بھی وہاں جایا کرتا تھا۔ جوئے کا ایک اڈہ اور بھی تھا جہاں ہندو، سکھ اور مسلمان جواری جوا کھیلا کرتے تھے۔ مقتول کو چند مرتبہ وہاں بھی دیکھا گیا تھا۔ وہ عادی جوئے باز نہیں تھا۔ میں سنا تھا کہ چرس کا کش بھی لگا لیتا ہے۔ ان بری عادتوں کے باوجود اسے غنڈہ یا بدمعاش نہیں کہا جاسکتا تھا۔ باعزت لوگوں میں بھی اٹھتا بیٹھتا تھا۔ عملی طور پر وہ کچھ بھی نہیں تھا، زبان

سے بہت کچھ تھا۔ خدا نے اسے چہرہ مہرہ بھی معمولی سا دیا تھا اور جسم کا کمزور تھا......

''اس کی پہلی بیوی کے بھائیوں کے متعلق میں نے تھانیدار کو بتایا کہ دونوں دلیر نوجوان ہیں۔ اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہیں اور عزت پر ہاتھ ڈالنے والے کی گردن مروڑ سکتے ہیں۔ کسی محفل میں بیٹھ جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مرد بیٹھے ہیں۔ ان میں چھوٹا بھائی جس کی عمر اس وقت بیس اکیس سال تھی کچھ زیادہ ہی دلیر تھا۔ اس کے جسم میں جان بھی تھی، لیکن بلاوجہ کسی کے منہ آنے والا لڑکا نہیں تھا۔ عزت کرتا اور عزت کراتا تھا۔ میں نے تھانیدار کو بتایا کہ اس لڑکے نے کسی وجہ سے اشتعال میں آکر اگر مقتول کو قتل کر دیا ہے تو میں حیران نہیں ہوں گا۔ میں نے تھانیدار کو اپنی رائے دیتے ہوئے کہا___ ''مقتول کی زبان اس کے قابو میں نہیں تھی۔ وہ بکواسی آدمی تھا۔ اس نے اپنی پہلی بیوی کو اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اور بدچلنی کے شبہے میں طلاق دی ہے۔ طلاق دے کر اس نے اپنی بیوی کے بھائیوں کو کوئی ایسی بات کہہ دی ہوگی یا طعنہ دیا ہوگا جس سے مشتعل ہو کر دونوں نے مل کر یا دونوں میں سے ایک نے اسے قتل کر دیا ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو قاتل چھوٹا بھائی ہوگا'......

''ہم تھانے میں داخل ہونے لگے تو تھانیدار نے مجھے کہا کہ تم جاؤ اور اپنا کام (مخبری) کرو۔ شام سے پہلے پہلے رپورٹ دینا۔ ڈیوٹی دو اور مخبروں کو بھی دی گئی۔ میں نے سب سے پہلے ان دو عورتوں کو پکڑا جو مجھے مخبری میں مدد دیا کرتی تھیں۔ میری اپنی بیوی کو فوت ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ گھر میں میری چھوٹی بہن اور والدہ تھیں۔ میرے خاندان میں ایک خالہ اور ایک پھوپھی اور ان دونوں کی دو دو بیٹیاں جوان تھیں۔ میں نے انہیں بتائے بغیر کہ میں پولیس کے لیے مخبری کر رہا ہوں ان سے مقتول کے گھر کے حالات اور اس کی دوسری بیوی کے متعلق بہت سی باتیں پوچھیں۔ ان تمام عورتوں کا مقتول کے گھر آنا جانا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ عورتوں کی نظر بڑی گہری ہوتی ہے۔ دوسرے کے عیب فوراً دیکھ لیتی ہیں اور ان کی رائے عموماً غلط نہیں ہوتی۔ میرے خاندان کی ان عورتوں نے جو باتیں بتائیں وہ غور کے قابل تھیں۔ میں ان میں سے آپ کو مختصر سی باتیں سناتا ہوں۔ مقتول کی دوسری بیوی نوجوان تھی اور شوباز۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ شوباز کسے کہتے ہیں۔ اپنے آپ کو حسینہ عالم سمجھتی تھی۔ اپنے خاوند (مقتول) کی طرح وہ بھی بڑ ہانکتی تھی۔ اس نے کئی عورتوں سے کہا تھا کہ میرے خاوند نے میری خاطر پہلی بیوی کو طلاق دی ہے کیونکہ وہ بدصورت تھی اور وہ کسی پیر فقیر کی بد دعائی ہوئی تھی اس لیے اس

کے بطن سے بچہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لڑکی اتنی ہی منہ پھٹ اور بے شرم تھی جتنی پہلی بیوی خاموش اور شریف۔ پہلی بیوی کے متعلق تمام عورتیں رائے دیتی تھیں کہ شریف ہے اور اس پر بد چلنی کا الزام اسے طلاق دینے کے لیے لگایا گیا ہے۔ اولاد سے محرومی کی ذمہ داری اکیلی اس عورت پر نہیں ڈال جاسکتی تھی......

''شام سے پہلے پہلے ایک مخبر عورت نہایت اعلیٰ قسم کی خبریں لے آئی۔ ایک یہ کہ کسی کے گھر شادی کے موقعے پر پہلی اور دوسری بیوی آمنے سامنے آگئیں۔ یہ قتل سے سات آٹھ روز پہلے کا واقعہ ہے۔ ان دونوں میں ٹکراؤ ہوگیا۔ دوسری بیوی نے پہلی بیوی کو بڑے ہی ذلیل طعنے دیئے اور اس کے خاندان تک کو برا بھلا کہا۔ دوسری بیوی غصے میں یہ کہتی ہوئی شادی سے چلی گئی کہ میں اپنے بھائیوں کو بتاؤں گی کہ میرا سابقہ خاوند مجھے اور میرے خاندان کو رسوا کرتا پھر رہا ہے اور اس کی دوسری بیوی نے میری بے عزتی کی ہے...... یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ مقتول اپنی بیوی کو جہاں بیٹھتا رسوا کرتا تھا، اور اس کے خاندان کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی دوسری بیوی کی بھی یہی عادت اور ذہنیت ہے......

''دوسری بیوی کے متعلق ایک اور انکشاف ہوا۔ اس کے ایک نوجوان کے ساتھ مراسم تھے۔ یہ نوجوان اس کے رشتے کا امیدوار تھا۔ منگنی نہیں ہوئی تھی۔ رشتے کا وعدہ دیا گیا تھا جسے زبان دینا کہتے ہیں۔ یہ لڑکا لڑکی کے پڑوس میں رہتا تھا۔ مقتول نے پہلی بیوی کو طلاق دی تو اس لڑکی کے رشتے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اڑتی اڑتی سنی تھی کہ مقتول کے باپ کا ایک مکان اور بھی تھا۔ لڑکی والوں نے مطالبہ کیا کہ دوسرا مکان لڑکی کے نام رجسٹری کر دیا جائے۔ وہ مان گئے اور مکان لکھ دیا۔ اب اس خبر کی تصدیق ہوگئی۔ ہوسکتا ہے لڑکی والوں نے کچھ نقد بھی لیا ہو۔ وہ لوگ کچھ ایسے ہی تھے۔ بہر حال پہلے امیدوار کو دیا ہوا وعدہ توڑ کر شادی مقتول کے ساتھ کر دی گئی۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا۔ شک پکا تھا کہ مقتول نے اس امیدوار کو بھی طعنے دیئے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس لڑکی نے شادی تو مقتول کے ساتھ کر لی لیکن پہلے امیدوار کے ساتھ مراسم قائم کیے رکھے۔ لڑکی اکثر میکے آتی رہتی تھی۔ ان کی ملاقاتیں کوٹھے پر ہوتی تھیں۔ کسی پڑوسن نے دیکھا بھی تھا۔ بعد میں مقتول کے والدین سے تھانیدار نے پوچھ گچھ کر کے کہلوایا تھا کہ شادی کے بعد لڑکی میکے زیادہ جاتی تھی اور ایک دو راتیں وہیں رہتی تھی......

''میں نے شام کو تھانیدار کو یہ معلومات دیں تو اس نے لڑکی کے پہلے امیدوار کو بھی مشتبہ اشخاص کی فہرست میں لکھ لیا۔ اس وقت تک تھانیدار پہلی بیوی کے دونوں بھائیوں کو مشتبہ بٹھا چکا تھا۔ وہ تھانے میں موجود تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ تھانیدار نے انہیں کیا کیا چکر دیئے اور کیسے کیسے سوال پوچھ کر یہ فیصلہ کیا کہ انہیں تھانے سے جانے نہ دیا جائے۔ مجھ پر تھانیدار کو بھروسہ تھا اور ہمارے تعلقات دوستانہ بھی تھے۔ وہ میری استادی سے مرعوب بھی تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے مجھے بتایا کہ پہلی بیوی نے بیان دیا ہے کہ مقتول کی دوسری بیوی نے اسے طعنے دیئے تھے۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس نے اپنے بھائیوں کو بتایا تھا۔ گویا میری حاصل کی ہوئی خبر کی تصدیق ہوگئی۔ اس کے بھائیوں نے لمبی اور ماہرانہ جرح میں یہ بتا دیا تھا کہ مقتول انہیں اور ان کی بہن کو بدنام کرتا پھرتا تھا۔ چھوٹا بھائی ایک بار بھڑک اٹھا تھا۔ اسے ماں باپ نے اور بہن نے ٹھنڈا کیا تھا...... پہلی بیوی سے جرح میں جو حاصل ہوا اس میں یہ بھی تھا کہ مقتول اسے مختلف لڑکیوں کے ساتھ اپنے معاشقے سناتا رہتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ دو ہندو لڑکیاں میری خاطر مسلمان ہونے کو تیار ہیں۔ ایسی باتیں اس نے شادی کے فوراً بعد شروع کر دی تھیں۔ گویا یہ بیوی سات سال یہ باتیں سنتی اور سہتی رہی۔ بیوی نے تھانیدار کو جو اپنی رائے دی وہ یہ تھی کہ مقتول خالی برتن تھا۔ کبھی کبھی چرس پی کر آتا تھا۔ بدبو سے بیوی کو متلی ہونے لگتی تھی۔ اسے اس کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ مقتول دراصل بزدل اور ڈرپوک آدمی تھا مگر افلاطون بننے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ تھانیدار نے مجھے بتایا کہ اس اس نے مطلقہ بیوی سے پوچھا کہ سات سال اولاد کیوں نہ ہوئی؟ کس میں نقص تھا؟ بیو نے کہا____ 'اس نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اگر زندہ رہتا تو سب کو معلوم ہو جاتا کہ نقص کس میں تھا'......

''شام کو ہی تھانیدار نے پہلی بیوی کے گھر کی تلاشی لی۔ کچھ بھی نہ ملا۔ آلہ قتل نہ ملا اور خون آلود کپڑوں کا بھی سراغ نہ ملا۔ تھانیدار نے پہلی بیوی کے بھائیوں کو دھمکی دی کہ وہ مان جائیں ورنہ تھانے میں ان کی ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔ پہلی بیوی نے بین کرتے ہوئے کہا کہ مردود زندہ رہا تو مصیبت بنا رہا، مرگیا تو بھی مصیبت بن گیا ہے۔ مگر پولیس پر اس کی فریادوں اور آہ وزاری کا کچھ اثر نہیں تھا...... پوسٹمارٹم ہوگیا تھا۔ آلہ قتل عام قسم کا چاقو لکھا گیا تھا۔ مرنے کا وقت رات نو بجے سے ذرا پہلے یا ذرا بعد لکھا گیا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ مقتول کھانا کھا کر مرا ہے۔ اس کے باپ نے یہی بتایا تھا کہ کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد گھر سے نکلا تھا۔

پھر واپس نہیں آیا......

''تھانیدار کو اتنی جلدی جلدی مشتبہ اشخاص ملنے لگے تو امید بندھ گئی کہ قاتل جلدی مل جائے گا۔ اس نے رات کو بھی تفتیش جاری رکھی۔ کھوجی کو اپنے ساتھ رکھا۔ دوسرے دو مخبروں نے بھی کچھ معلومات لا کر دیں۔ وہ میری معلومات سے ملتی جلتی تھیں۔ تھانیدار نے مقتول کی دوسری بیوی اور اس کے پہلے امیدوار کو بلا لیا۔ پہلے امیدوار آیا۔ تھانیدار نے اسے بٹھا لیا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد دوسری بیوی آ گئی۔ میں نے اسے اس کی شادی سے بہت پہلے دیکھا تھا جب وہ ابھی پردے میں نہیں بیٹھی تھی۔ وہ مجھے جانتی تھی۔ وہ آئی تو تھانیدار کو اطلاع دی گئی۔ اس نے باہر آ کر اسے الگ بٹھا دیا۔ تھانیدار نے اس کے امیدوار کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ صرف کیا اور اسے کانسٹیبلوں کے کمرے میں بٹھا کر مجھے تھانے کے پیچھے لے گیا۔ اس نے بتایا کہ یہ لڑکا مان گیا ہے کہ لڑکی کے ساتھ اس کے تعلقات تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ شادی کے بعد مقتول نے اسے طعنہ دیا تھا اور کہا تھا کہ تم اس لڑکی کے قابل نہیں ہو، وہ تو مجھ پر جان دیتی تھی۔ امیدوار نے تھانیدار کو بتایا کہ غصے کی بجائے اسے ہنسی آ گئی تھی کہ یہ شخص کتنا گودا ہے۔ اگر اسے پتہ چلے کہ اس کی دلہن کس پر جان دیتی ہے تو اس کا کیا حال ہو......

''تھانیدار کی جرح تقریباً ناکام رہی۔ اس نے ان سب کے کھرے کھوجی کو دکھائے۔ کسی کا بھی کھرا موقعہ واردات کے کھروں سے نہیں ملتا تھا۔ ان کے پاؤں ننگے کر کے بھی کھرے دیکھے گئے۔ بہت فرق تھا۔ اس نے اس نوجوان کے متعلق رائے دی کہ یہ قاتل نہیں ہوسکتا۔ تاہم ابھی لڑکی کو پوچھ گچھ اور جرح کی چکی میں پیسنا باقی تھا۔ تھانیدار نے مجھے کہا کہ وہ صبح سے وردی پہنے ہوئے ہے اور تھک بھی گیا ہے اس لیے نہانے اور کپڑے بدلنے جا رہا ہے۔ اس نے ایک نازک سی ڈیوٹی میرے سپرد کر دی۔ وہ یہ تھی کہ میں لڑکی کو ڈراؤں دھمکاؤں اور اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش کروں۔ وہ میری راہنمائی بھی کر گیا۔ یہ کام میرے لیے مشکل نہیں تھا، کیونکہ لڑکی تھانے میں تنہا بیٹھی تھی۔ اس کی شوخی اور شوبازی ختم ہو چکی تھی۔ رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ تسلی دلاسے ڈھونڈ رہی تھی۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا تو اس کے چہرے پر کچھ رنگ آ گیا۔ پوچھنے لگی کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے اور اس کے ساتھ کیسا سلوک ہوگا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا___ 'میں پولیس کا ملازم نہیں ہوں۔ میں صبح سے یہاں اس لیے موجود ہوں کہ یہ حادثہ میرے اپنے لوگوں کے ساتھ ہوا ہے، تھانیدار میرا دوست ہے۔ میں

اس کوشش میں ہوں کہ تم میں سے کسی کو کوئی تکلیف اور پریشانی نہ ہو۔ تم ڈرو نہیں۔ میری موجودگی میں تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا، لیکن تمہارا خاوند قتل ہو گیا ہے۔ پولیس قاتل کی تلاش میں ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو تمہارے سوا اور کوئی نہیں بتا سکتا۔ جب تک تم یہ باتیں نہیں بتاؤ گی قاتل کو پکڑنا مشکل ہوگا'......

''اس نے پوچھا___ 'میں کیا بتا سکتی ہوں؟ مجھے کیا معلوم کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟'___ میں نے اسے کہا کہ یہ یاد رکھنا کہ یہ تھانہ ہے۔ پولیس کو بہت سی باتیں معلوم ہو چکی ہیں۔ وہ لڑکا بھی باہر بیٹھا ہے جس کے ساتھ تمہارا رشتہ طے ہوا اور تمہارے والدین نے توڑ دیا تھا۔ تھانیدار اس کا بیان لے چکا ہے۔ وہ اتنا کچا آدمی ثابت ہوا ہے کہ اس نے بتا دیا ہے کہ تمہارے ساتھ اس کے تعلقات ہیں۔ اس نے اور بھی بہت ساری باتیں تھانیدار کے آگے اگل دی ہیں۔ اب اگر تم نے تھانیدار کے آگے جھوٹ بولا تو وہ شک کرے گا کہ تم نے اپنے خاوند کو اس لڑکے سے قتل کرایا ہے......لڑکی کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے ڈر اور شرم سے اس نے سر جھکا لیا۔ اچانک سر اٹھا کر اس نے کہا___ 'خدا کی قسم، مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ چوہے کو بھی مار سکوں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں خاوند کو مروا دوں'۔

''میں نے اسے کہا کہ وہ گھبرائے نہیں لیکن یہ بھی دل سے نکال دے کہ پولیس اس کے غلط بیان کو تسلیم کرے گی۔ میں نے اسے کہا___ 'مجھے ساری باتیں بالکل صحیح صحیح بتا دو۔ میں ان کے مطابق تمہیں مشورہ دوں گا اور تھانیدار سے بات کر لوں گا'___ آپ ذرا تصور میں اپنے آپ کو تھانے میں مشتبہ کی صورت میں بیٹھا ہوا دیکھیں۔ واردات قتل کی ہے۔ پولیس کو آپ کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ تھانیدار آپ کے ساتھ جو سلوک چاہے کر سکتا ہے۔ آپ کو حوالات میں بند کر سکتا ہے۔ اندر لے جا کر الٹا لٹکا سکتا ہے۔ ان حالات میں آپ ایسا محسوس کریں گے جیسے آپ سیلاب میں ڈوب رہے ہیں۔ آپ کو کوئی جھوٹی تسلی دے تو بھی آپ اس کے پاؤں میں بیٹھ جائیں گے۔ یہی حالت اس لڑکی کی تھی۔ وہ نوجوان لڑکی تھی۔ خوف سے کانپ رہی تھی۔ میں نے یہ کہہ کر کہ اس پر خاوند کے قتل کا شک کیا جا رہا ہے اس کا خون خشک کر دیا اور جب میں نے تسلی دی تو اس نے میرے آگے اپنا سینہ کھول دیا۔ اس نے صرف یہی تسلیم نہیں کیا کہ اپنے پہلے امیدوار کے ساتھ اس کے مراسم تھے بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ اس نے اس امیدوار کے ساتھ بھاگنے کی باتیں بھی کی تھیں مگر امیدوار کہتا تھا کہ خاوند زندہ ہے۔ یہ کمبخت مرجائے تو

بھاگے بغیر شادی ہو سکتی ہے...... میں نے لڑکی پر تھانیداروں کی طرح سوال پر سوال پھینکا۔ اس نے بتایا کہ اس نوجوان نے قتل کی کبھی بات نہیں کی تھی۔ اپنے خاوند کے متعلق اس نے وہی رائے دی جو پہلی بیوی نے دی تھی۔ اس لڑکی نے اپنے خاوند کو قابل نفرت کہا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ خاوند اسے اپنے معاشقے سناتا رہتا تھا اور بہت ہی کھوکھلی باتیں کرتا تھا۔ چرس پی کر جب آتا تھا تو بدبو کے علاوہ بڑی ہی حقیر اور کمینہ سی باتیں کرتا تھا۔ یہ خاوند اسے کسی پہلو پسند نہیں تھا۔ جسمانی پہلو سے بھی نہیں، جذباتی پہلو سے بھی نہیں۔ صرف مکان کے لالچ پر اس کے ماں باپ نے اسے اس آدمی کے ساتھ بیاہ دیا تھا......

''اس نے بتایا کہ کبھی پیسے لاتا تھا اور اس کو دیتا تھا اور کبھی پیسے لے جاتا تھا۔ پیسے رات کو آ کر دیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ جوئے کی رقم ہوتی تھی۔ اس دوسری بیوی نے یہ بھی بتایا کہ مقتول کو باپ نے کئی بار کہا تھا کہ وہ بری سوسائٹی چھوڑ دے لیکن وہ تھانیدار اور تحصیلدار کی دوستی کی ڈھینگیں مار کر باپ کو لاجواب کر دیا کرتا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ قتل کی رات وہ شام کا کھانا کھا کر گھر سے نکل گیا تھا۔ رات گیارہ بارہ بجے تک نہ آیا تو لڑکی نے اس کے باپ کو جگا کر بتایا۔ اس سے پہلے مقتول اتنی دیر تک کبھی باہر نہیں رہا تھا۔ اس کا باپ باہر چلا گیا۔ اس کی ماں بھی جاگ اٹھی۔ باپ معلوم نہیں کہاں کہاں ڈھونڈتا رہا اور بہت دیر بعد واپس آیا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ اسے ایک آدمی مل گیا تھا جس کا میل ملاقات مقتول کے ساتھ تھا۔ باپ نے اسے بتایا کہ اس کا بیٹا گھر نہیں آیا۔ اس شخص نے اسے بتایا کہ اس نے اس کے بیٹے کو قبرستان کے تکیے پر شام کے بعد دیکھا تھا۔ کوئی دو گھنٹے بعد وہاں سے چلا گیا تھا۔ باپ تکیے پر گیا، وہاں ملنگ سوئے ہوئے تھے۔ انہوں نے چرس کے نشے میں باپ کو کوئی قابل اعتبار جواب نہ دیا۔ صبح سویرے کسی محلے دار نے آ کر بتایا کہ ان کے بیٹے کی لاش کھیتوں میں پڑی ہے......

''لڑکی کے منہ سے تکیے کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہوئے میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ یہ ساری باتیں بالکل اسی طرح تھانیدار کو بتا دے۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ میں نے اس کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ تھانیدار واپس آ گیا تھا۔ میں نے اسے لڑکی کا سارا بیان سنایا۔ تھانیدار مجھ سے زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے لڑکی اور اس کے امیدوار کو بھی مشتبہ بٹھا لیا۔ وہ کسی کو ڈھیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ تفتیش شک وشبے پر ہی کی جاتی ہے۔ ایک اشارہ کہیں سے ملتا ہے تو اس اشارے کی تائید یا تردید کسی اور مشتبہ سے ہو جاتی ہے۔ بعض مشتبے گھبرا کر فالتو باتیں کہہ ڈالتے

ہیں اور بعض غلط بیانی کرتے ہیں۔ بعض اوقات غلط بیانی زیادہ فائدہ دے جاتی ہے۔ یہی حال اس لڑکی اور اس کے آشنا کا تھا۔ لڑکے نے کچھ باتیں چھپالی تھیں جو لڑکی نے گھبرا کر بتا دی تھیں۔ تھانیدار نے مجھے کہا — 'یہ نہ دیکھو کہ یہ نوجوان قتل کرنے کی ہمت نہیں رکھتا اور یہ لڑکی واقعی بزدل ہے۔ ایسے نوجوانوں پر جب حیوانوں والا جذبہ غالب آتا ہے تو قتل کوئی مشکل کام نظر نہیں آتا۔ قتل کر کے ان کے ہوش ٹھکانے آتے اور وہ چھپتے پھرتے ہیں۔ وہ جب پولیس کے شکنجے میں آتے ہیں تو اقبال جرم بھی اتنی جلدی کر لیتے ہیں جتنی جلدی قتل کر لیتے ہیں' — میں نے جب تھانیدار کو لڑکی کی خصلت بتائی تو اس نے کہا کہ ایسی لڑکی کسی اور کے ساتھ آشنائی کر کے اس کے عوض اپنے خاوند کو قتل کرا سکتی ہے۔ مکان تو اس نے لکھوا ہی لیا تھا......

''وہاں تھانے کا اسسٹنٹ سب انسپکٹر بھی بیٹھا تھا۔ وہ ہندو تھا۔ اس نے بڑے اچھے مشورے دیئے اور کہا کہ ان دونوں کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ تھانیدار نے لڑکی اور اس کے امیدوار کو اس کے حوالے کر دیا۔ میں پولیس کی ساری کارروائی میں تو دخل اندازی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان دونوں کے ساتھ بند کمرے میں کیا سلوک ہوا اور کیا پوچھ گچھ کی گئی۔ تھانیدار نے انہیں مشتبہ کی فہرست میں شامل کر لیا تھا۔ کہتا تھا کہ انہیں وہ ساری رات سونے نہیں دے گا...... میں نے تھانیدار کو بتایا کہ لڑکی نے بتایا ہے کہ مقتول کا باپ کسی کے بتانے پر تکیے پر بھی گیا تھا۔ یہ ثبوت مل گیا تھا کہ شام کے بعد مقتول تکیے پر گیا تھا۔ وہ ضرور جوا کھیلنے گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں اس کا لڑائی جھگڑا ہوا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے بہت ساری رقم جیتی ہو اور تکیے سے واپسی میں مارا گیا ہو۔ لاش کی جیب خالی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس کا باپ تکیے پر گیا تھا۔ اگر وہ کھیتوں کے راستے جاتا یا آتا تو اسے اپنے بیٹے کی لاش مل جاتی۔ میں تکیے کے ملنگوں اور وہاں جا کر جوا کھیلنے والوں کی خصلتوں سے واقف تھا۔ تھانیدار مجھ سے زیادہ واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہاں جرائم پیشہ لوگ جاتے ہیں اور بعض اوقات باہر سے کوئی خطرناک مجرم بھی آ جاتا ہے......

''تھانیدار نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ تکیے پر ابھی چھاپہ مارا جائے۔ تکیے پر چھاپہ کسی ڈھنگ ہی سے مارا جاتا تھا کیونکہ رات کو یا دن کے وقت بھی جب جواری اندر مصروف ہوتے تھے تو قبرستان کے اِدھر اُدھر انہوں نے خفیہ پہرے کا انتظام کر رکھا ہوتا تھا۔ کوئی مشکوک آدمی یا پولیس آتی نظر آئے تو کھانسی سے یا کسی اور اشارے سے جواریوں کو

خبردار کو دیا جاتا تھا۔ جواری فوراً اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے۔ ان میں سے بعض کسی قبر پر فاتحہ پڑھنے لگتے تھے۔ رات کو چھاپہ پڑتا تو وہ اندھیرے میں غائب ہو جاتے تھے۔ یہ غیر قانونی دھندا تھا۔ عادی جواری پولیس کی مٹھی گرم رکھتے تھے۔ اگر تھانیدار کی مٹھی کبھی ٹھنڈی ہو جائے یا اس کی مرضی کے مطابق گرم نہ ہو تو پولیس ''دیانتدار'' بن جاتی اور تکیے پر چھاپہ مارتی تھی۔ اب چھاپہ مارنا ضروری ہو گیا تھا کیونکہ قتل کی واردات ہوئی تھی۔ تھانیدار نے مجھے ان لوگوں میں گھل مل جانے کو کہا جو مشتبہ بیٹھے ہوئے تھے۔ تھانیدار چھاپہ مارنے کے انتظامات کرنے لگا اور میں ان لوگوں کے پاس چلا گیا جو گھبرائے ہوئے بیٹھے تھے۔ مجھے اپنے قریب دیکھتے ہی سب ایک ہی بار بولنے لگے۔ وہ مجھ سے پوچھتے تھے کہ ان کا کیا بنے گا اور کیا ہو رہا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں انہی کی خاطر تھانیدار کے ساتھ لگا ہوا ہوں۔ ایک تو اپنا آدمی قتل ہو گیا ہے دوسرے تم سب کو یہاں بٹھا لیا گیا ہے۔ تھانیدار کے ساتھ میری دوستی ہے اس لیے بے چارا لحاظ کرتا ہے...... مختصر یہ کہ وہ لوگ اس فریب میں آئے رہے کہ میں ان کی خاطر تھانے میں موجود ہوں۔ کسی کو شک تک نہ ہوا کہ میں ان کے خلاف مخبری کر رہا ہوں۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ آج کل بھی ایسے آدمی موجود ہیں جنہیں آپ ہمدرد سمجھتے اور ان کی محبت سے متاثر ہوتے ہیں لیکن وہ پولیس کے مخبر ہوتے ہیں......

''تھانیدار باوردی اور بغیر وردی کانسٹیبلوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ دو مخبر قسم کے آدمی بھی ساتھ لے گیا تھا۔ مقتول کی دوسری بیوی اور اس کا پہلا امیدوار بھی اندر تھے۔ اسسٹنٹ سب انسپکٹر نے انہیں تفتیش کی چکی میں ڈال رکھا تھا...... ڈیڑھ ایک گھنٹے بعد تھانیدار آ گیا۔ اس کا چھاپہ کامیاب رہا تھا۔ وہ پانچ ملنگوں کو جو عموماً تکیے میں رہتے تھے ساتھ لے آیا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی آدمی تھے جو وہاں جوا کھیل رہے تھے۔ ان آدمیوں کو ملنگوں سے الگ کر دیا گیا۔ ملنگوں کو برآمدے میں بٹھا دیا گیا۔ وہ چرس پیے ہوئے تھے۔ نشے اور نیند نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا پہچانتا تھا۔ ان میں سے دو کے ساتھ میری کچھ بے تکلفی بھی تھی۔ تھانیدار تین آدمیوں کو اندر لے گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے اب کیا کرنا ہے۔ اپنی خفیہ ڈیوٹی کے مطابق میں ملنگوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ آدمی قتل ہو گیا ہے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ انہیں اسی واردات کے سلسلے میں پکڑا گیا ہے۔ وہ اسے عام چھاپہ سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھ جوڑنے شروع کر دیئے کہ میں ان کی سفارش کروں اور

چھڑا لوں۔ میں نے انہیں بہت تسلیاں دیں کہ انہیں جرمانے سے بچا لوں گا......

''جن دو ملنگوں کے ساتھ میری کچھ بے تکلفی تھی انہیں میں باتوں باتوں میں الگ لے گیا۔ ان پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں مخبری کر رہا ہوں یا یہ کہ انہیں قتل کی واردات کے سلسلے میں پکڑا گیا ہے۔ میں نے مقتول کی موت پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ ہمارا تو گہرا یار تھا۔ ملنگوں نے بھی افسوس کیا اور ایک نے کہا کہ رات وہ زندہ اور سلامت ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی استادی سے کام لیتے ہوئے بہت اچھی طرح باتیں معلوم کر لیں جو یہ تھیں کہ مقتول نے دو سو روپیہ جیتا اور چل پڑا۔ اسے کہا گیا کہ وہ اور کھیلے لیکن وہ نہیں کھیلا۔ اس زمانے میں دو سو روپیہ بہت بڑی رقم تھی۔ آج کے دس ہزار سمجھ لیں۔ جواری کسی کو یوں نہیں اٹھنے دیتے کہ کوئی بازی جیت کر رقم جیب میں ڈالے اور چل پڑے۔ مقتول نے اتنی زیادہ رقم پہلی بار جیتی تھی۔ وہ شاید جیتی ہوئی بازی ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک ملنگ نے اٹھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور کہا کہ ساری رقم یہاں رکھ دو یا جب تک بازی چلتی ہے کھیلو۔ اس پر جھگڑا ہو گیا۔ اس ملنگ نے اپنی ساری رقم ہار دی تھی۔ وہ چرس بھی بہت پی گیا تھا۔ وہ مقتول کو چھوڑ نہیں رہا تھا۔ ان کے درمیان ہاتھا پائی ہو گئی۔ دوسروں نے بیچ بچاؤ کروا دیا اور مقتول کھسک گیا......

''میرے کسانے پر ملنگ مجھے گپ شپ کے انداز میں یہ باتیں سنا رہے تھے اور میں ظاہری طور پر لطف اٹھا رہا تھا۔ میں نے ان سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ مقتول کے جانے کے کوئی پندرہ بیس منٹ بعد یہ ملنگ غصے میں اٹھ کر چلا گیا تھا۔ وہ مقتول کو گالیاں دیتا جا رہا تھا۔ اس کے بعد ملنگ واپس نہیں آیا۔ اپنے گھر چلا گیا ہو گا۔ اس کی بیوی بھی تھی...... یہاں میں ملنگوں کے متعلق کچھ باتیں بتاؤں گا کیونکہ شہروں کے کئی لوگوں نے وہ ملنگ نہیں دیکھے ہوں گے جن کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ شہروں میں آج کل ولائتی ملنگ آ گئے ہیں جنہیں آپ ہپی کہتے ہیں۔ اگر ہمارے ملنگوں کو بش شرٹ پہنا دی جائے اور ان کی شیو نہ کی جائے اور بال بھی نہ کاٹے جائیں تو آپ انہیں ہپی کہیں گے۔ ملنگ ظاہری طور پر حقیر سی قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ لمبے لمبے کپڑے پہنتے اور گلے میں موٹے دانوں والی تسبیحاں اور کلائیوں میں موٹے موٹے کڑے ڈالے رکھتے تھے۔ یہ بھیک مانگتے تھے، جوا کھیلتے اور کھلاتے بھی تھے اور ہر طرح کا جرم کر گزرتے تھے۔ بڑے بڑے جرم کرنے والے عادی مجرم انہیں اپنے کام میں استعمال کرتے تھے یہ ملنگ جن کا میں ذکر کر رہا ہوں اسی قسم کے لوگ تھے......

''میں ان ملنگوں کو بٹھا کر اور تسلی دے کر تھانیدار کے پاس چلا گیا۔ وہ تین آدمیوں سے پوچھ گچھ کر رہا تھا لیکن ان سے کچھ بھی پتہ نہیں چلا تھا۔ اس نے انہیں باہر نکال دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک اور مشتبہ آ گیا ہے۔ میں نے اسے ملنگوں کی باتیں سنائیں اور بتایا کہ جس ملنگ کے ساتھ مقتول کی لڑائی ہوگئی تھی وہ اس کے پیچھے غصے میں باہر نکل گیا تھا۔ یہ جاہل سا ملنگ ہے ہوسکتا ہے کہ اس نے غصے میں مقتول کو قتل کر دیا ہو، مقتول ابھی راستے میں ہی ہوگا اور ملنگ نے اس پر حملہ کر دیا ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا کہ ملنگ نے اس کی جیب سے دوسو روپیہ کی رقم نکال لی ہو...... تھانیدار نے انہی دو ملنگوں کو بلایا اور کہا کہ وہ ساری بات جو انہوں نے مجھے سنائی ہے۔ اسے بھی سنائیں۔ تھانیدار نے یہ بھی کہا کہ اگر انہوں نے کوئی بات چھپائی یا غلط بیان کی تو آئندہ وہ تکیے کے قریب نہیں جاسکیں گے۔ تکیہ ہی ان کی پناہ اور ان کی روزی کا ذریعہ تھا۔ انہوں نے ساری باتیں سنا دیں۔ تھانیدار نے اپنے انداز سے بڑی لمبی جرح کی تو اس ملنگ پر شک پختہ ہوگیا۔ جس کے ساتھ مقتول کی لڑائی ہوئی تھی۔ تھانیدار کی جرح ایسی تھی کہ ایک دو اور وہ باتیں سامنے آ گئیں۔ ان دونوں کو تھانے کے پیچھے جا کر بیٹھنے کو کہا گیا اور مشتبہ ملنگ کو بلایا گیا۔ تھانیدار نے سب سے پہلے اس کے پاؤں دیکھے اور پوچھا ___ 'اوئے خبیث! تم جوتی کیوں نہیں پہنتے؟ ہمیشہ ننگے پاؤں رہتے ہو؟' ___ وہ ہاتھ جوڑ کر تھانیدار کے پاؤں میں بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں پکڑ کر بولا ___ 'مائی باپ! درویشوں کو جوتی سے کیا کام' ___ میں نے بھی دیکھا کہ وہ ننگے پاؤں تھا۔ پتہ چلا کہ وہ ننگے پاؤں رہنے کا عادی ہے۔ دوسرے ملنگوں نے پھٹے پرانے چپل وغیرہ پہن رکھے تھے۔ تھانیدار کو یاد تھا کہ لاش کے قریب ننگے پاؤں کے نشان تھے۔ کھوجی کو بھی تھانے میں حاضر رکھا گیا تھا۔ اسے بلایا گیا۔ ملنگ کا پاؤں موقعۂ واردات کے کھرے میں فٹ آ گیا۔ یہ واحد مشتبہ تھا جس کا کھرا وہی تھا جو موقعۂ واردات پر پایا گیا تھا۔ کھوجی ماہر ہوتے تھے۔ کھرے کی بال جیسی باریکیوں کو بھی پہچان لیتے تھے۔ کھوجی نے کہا کہ یہ کھرا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا......

''تھانیدار نے میری موجودگی میں اس سے سوال پوچھنے شروع کر دیئے۔ اس نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ مقتول کے ساتھ اس کی لڑائی ہوئی تھی لیکن کہا کہ وہ تکیے سے باہر نکلا تو کھیتوں کی طرف نہیں گیا۔ گلیوں کے راستے اپنے گھر چلا گیا تھا۔ تھانیدار نے اسے بتائے بغیر باہر جا کر کسی کو اس کے گھر اس کی بیوی کو تھانے میں لانے کے لیے بھیج دیا۔ اس کی بیوی آئی تو

تھانیدار نے ملنگ کو دوسرے کو کمرے میں بھیج دیا اور اس کی بیوی کو اندر بلا لیا۔ وہ غریب سی عورت تھی لیکن چالاک بھی تھی۔ تھانیدار کے پہلے چند ایک سوالوں کے جواب اس نے یوں دیئے جیسے بے چاری کے منہ میں زبان نہیں یا وہ اتنی سیدھی سادی ہے کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتی۔ تھانیدار نے تھانیداروں والے ہاتھ دکھائے تو وہ رو پڑی اور اپنے خاوند کو گالیاں دینے لگی۔ کہتی تھی کہ اس کے ماں باپ نے اسے چرسی، بھنگی اور جواری کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ بہت دیر بعد اس نے ذرا سیدھی سیدھی باتیں کیں لیکن ان باتوں سے کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ صرف شک ہوتا تھا۔ بعض باتوں سے شک پکا ہوتا تھا۔ تھانیدار کی جرح کے جواب میں اس نے وہ وقت بتایا جب خاوند گھر آیا تھا۔ یہ قتل کے وقت سے ذرا بعد کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بتایا کہ خاوند نے اسے پچاس روپے دیئے تھے۔ ملنگ کے ساتھی پہلے بتا چکے تھے کہ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ ساری رقم جو غالباً تیس بتیس روپے تھی ہار گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مقتول کو جیت کر جانے نہیں دے رہا تھا......

''تھانیدار نے ملنگ کے ساتھیوں کے منہ سے جو بے شمار باتیں اگلوائی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ آج اس نے کل والے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ یا بدلے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ آج یہ کپڑے بدل کر آیا تھا۔ اب اس کی بیوی سے تھانیدار نے پوچھا کہ اس نے آج صبح یا گزشتہ رات خاوند کے کپڑے دھوئے ہوں گے۔ بیوی نے بتایا کہ صبح دھوئے تھے مگر اس نے تھانیدار کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ کپڑوں پر خون کے داغ نہیں تھے۔ تھانیدار نے پوچھا کہ اس نے جب اس کے کپڑے دھونے کے لیے خاوند سے لیے تو اس کی جیب میں ایک چاقو تھا اور کچھ پیسے تھے۔ یہ پیسے تقریباً کتنے تھے؟ اس عورت نے جواب دیا ___ 'اس نے جیب سے چاقو اور پیسے خود ہی نکال لیے تھے۔ کچھ نوٹ تھے اور زیادہ تر سکے تھے۔ یہ سب ایک گتھی میں تھے جو اس نے نکال کر دیکھے اور گتھی میں ڈال لیے تھے' ___ تھانیدار نے پوچھا ___ 'کیا رقم ڈیڑھ دوسو روپے ہوگی؟' ___ بیوی نے جواب دیا ___ 'اتنی تو ضرور ہوگی'......

''اس سے پہلے اس کے ساتھی بتا چکے تھے کہ آج شام وہ تکیے پر آیا تو اس نے گتھی ہلا کر سب کو جوئے کے لیے للکارا تھا۔ تھانیدار نے ابھی اس ملنگ کی جامہ تلاشی نہیں لی تھی...... بیوی سے تھوڑی سی اور باتیں پوچھ کر تھانیدار نے اسے کسی اور کمرے میں غائب کر دیا اور ملنگ کو اندر بلایا۔ اس نے کھدر کا کرتہ پہن رکھا تھا جو اس کے ٹخنوں تک لمبا تھا۔ نیچے ایسے ہی موٹے

کپڑے کا پاجامہ تھا۔ تھانیدار نے اسے کہا ــــ ''چاقو اور پیسوں والی گتھی میز پر رکھ دو'ــــ وہ گھبرایا۔ تھانیدار نے دو چار گالیوں اور ایک زوردار تھپڑ سے چاقو اور گتھی میز پر رکھوا لیے۔ اس نے چاقو کرتے کی جیب سے نکالا اور گتھی پاجامے کی ناف سے نکالی تھی۔ تھانیدار نے پوچھا ــــ 'گتھی میں کتنی رقم ہے؟' ــــ اس نے رقم بتائی جو مجھے آج یاد نہیں رہی۔ اتنا یاد ہے کہ ڈیڑھ سو سے کم تھی۔ تھانیدار نے کہا ــــ 'تم نے پچاس روپے بیوی کو دیئے تھے۔ باقی رقم کہاں گئی؟' ــــ وہ حیران اور پریشان حالت میں تھانیدار کو دیکھنے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہیں۔ تھانیدار نے پوچھا ــــ 'کل رات تم سارے پیسے ہار گئے تھے، یہ رقم کہاں سے لائے؟' ــــ اس سے کوئی جواب بن نہیں رہا تھا۔ تھانیدار نے پوچھا ــــ 'تم نے آج صبح کپڑے کیوں دھلوائے تھے؟' ــــ اس نے جواب دیا ــــ 'بہت میلے ہو گئے تھے'......

تھانیدار کو جانے کیا سوجھی۔ اس نے اسی وقت اس کے گھر کی تلاشی کا فیصلہ کیا۔ اس کو غالباً یہ امید تھی کہ اس کے کپڑے بے شک دھل گئے ہیں لیکن یہ کپڑے لاہور بھیج کر معلوم کرایا جا سکتا ہے کہ ان پر خون تھا۔ تین کانسٹیبلوں اور ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ ملنگ اور اس کی بیوی کو اس کے گھر لے گئے۔ وقت آدھی رات کا تھا۔ تھانیدار نے برآمدگی کے مشیر نامے پر دستخط کرنے کے لیے مجھے اور ایک اور مخبر کو ساتھ لے لیا......اور باقی تمام مشتبہ اشخاص اور مستورات ابھی تک تھانے کے برآمدے میں پریشانی اور خوف کی حالت میں بیٹھی تھیں۔ ان کے رشتہ دار تھانے کے احاطے کے باہر بیٹھے تھے۔ ہندوا ے۔ ایس۔ آئی مقتول کی دوسری بیوی اور اس کے آشنا سے تفتیش کر چکا تھا۔ اس نے تھانیدار کو علیحدہ لے جا کر کچھ بتایا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے کیا بتایا تھا۔ اتنا معلوم ہے کہ انہیں گھر جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ہم سب ملنگ کے گھر گئے۔ یہ گندے سے علاقے میں دو کمروں کا ایک مکان تھا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی۔ ملنگ کو ہتھکڑی نہیں لگائی گئی تھی......

''تھانیدار ایک کمرے میں چلا گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تینوں کانسٹیبل بھی آگے چلے گئے۔ ملنگ ان کے پیچھے تھا۔ وہ لوگ جونہی کمروں میں گئے ملنگ پیچھے کو مڑا اور میرے دوست مخبر کے درمیان سے بہت تیزی سے دوڑتا باہر نکل گیا۔ میرے ساتھ والے مخبر نے ہڑبڑا کر بلند آواز سے کہا ــــ 'وہ بھاگ گیا ہے' ــــ ہم دونوں اس کے پیچھے دوڑے ہمارے پیچھے تھانیدار اور اس کے کانسٹیبل آئے۔ ملنگ گلیوں میں غائب ہو گیا۔ رات کو

خاموشی میں بھی اس کے پاؤں کی آہٹ نہیں سنائی دیتی تھی۔ کیونکہ وہ ننگے پاؤں تھا۔ ہم نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ کس طرف گیا ہے۔ ہم سب ان گلیوں سے واقف تھے۔ تھانیدار نے ہمیں مختلف گلیوں میں تقسیم کر دیا۔ وہ کوئی اتنا بڑا شہر نہیں تھا کہ ایک آدمی اتنی آسانی سے غائب ہو جاتا۔ ہم سب تعاقب کرتے رہے۔ آدھے گھنٹے بعد میں ایک گلی سے ہوتا ہوا بازار جا نکلا۔ کچھ دور سے مجھ کسی کا واویلا سنائی دیا ــــ 'پکڑ لیا۔ ارنے پہنچنا مار دیا' ــــ اور وہ واویلا دینے لگا۔ میں ادھر کو دوڑا۔ یہ آوازیں ایک اور گلی سے آ رہی تھیں۔ یہ گلی بھی آگے جا کر بازار سے ملتی تھی......

اس گلی میں سے ایک آدمی دوڑ کر نکلتا نظر آیا۔ اس کے پیچھے ایک کانسٹیبل نکلا اور اس کے تعاقب میں گیا۔ میں بھی اس کی مدد کو پہنچا۔ کہیں سے ایک اور کانسٹیبل آ گیا۔ ملنگ پکڑا گیا۔ وہ دوڑ دوڑ کر اس قدر تھک چکا تھا کہ اس کی سانسیں مل نہیں رہی تھیں۔ وہ گر پڑا۔ ایک کانسٹیبل نے دوسرے مخبر کا نام لے کر کہا ــــ 'یہ اسے مار آیا ہے۔ جا کر اسے دیکھو' ــــ کانسٹیبلوں نے تھانیدار کو آوازیں دیں۔ وہ بھی آ گیا۔ گلی میں جا کر دیکھا۔ وہاں میرا مخبر ساتھی پڑا تھا۔ تھانیدار کے پاس ٹارچ تھی۔ مخبر کے سر سے خون نکل رہا تھا اور وہ بے ہوش پڑا تھا۔ وہ ملنگ کے پیچھے دوڑتا اس تک پہنچ گیا تھا۔ ملنگ نے پہلے ہی کہیں سے ہاتھ میں اینٹ اٹھا لی تھی۔ اس نے مخبر کے سر میں اینٹ ماری۔ مخبر چکرایا اور اس نے شور مچایا۔ ملنگ نے اس کے سر پر ایک بار پھر اینٹ ماری۔ مخبر گرا تو ملنگ دوڑا ادھر سے ہی ایک کانسٹیبل آ رہا تھا جس نے دیکھ لیا۔ ادھر سے میں جا رہا تھا۔ زخمی کو فوراً اٹھا کر ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کیا گیا اور اسے کہا گیا کہ اسے سول ہسپتال لے جا کر ڈاکٹر کو جگا لو......

''ملنگ کو تھانے لے گئے اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا تھا کہ وہ قاتل ہے۔ میں ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ ہسپتال چلا گیا۔ یہ معمولی سا سرکاری ہسپتال تھا۔ ڈاکٹر ہسپتال کے احاطے میں ہی سرکاری کوارٹر میں رہتا تھا۔ اسے جگا کر واردات بتائی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اسے کہا کہ زخمی اگر مرنے والا ہو تو نزع کا بیان لینا ہے اور اس کی ضربیں لکھنی بھی ہیں۔ ڈاکٹر اسی وقت آیا، زخمی کو دیکھ کر اس کی ضربیں لکھیں اور اس کی مرہم پٹی کر دی۔ اس نے بتایا کہ اینٹ سے کھال کٹ گئی ہے، کھوپڑی محفوظ ہے۔ اس کارروائی کے بعد میں تھانے گیا۔ تھانیدار ابھی تک جاگ رہا تھا۔ تمام مشتبہ لوگ برآمدے میں بیٹھے اور اونگھ رہے تھے۔ میں نے تھانیدار سے ملنگ کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہے تو اس نے کہا کہ ابھی چل کر دیکھتے ہیں۔ اس نے میرے مخبر

ساتھی کی حالت پوچھی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ بچ جائے گا لیکن ابھی ہوش میں نہیں آیا۔ ملنگ کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ اقبال جرم نہیں کر رہا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اب کہاں ہوگا......

''وہ ایک کمرے میں تھا، میں تھانیدار کے ساتھ وہاں گیا تو ملنگ کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ فرش پر پیٹھ کے بل پڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں کر کے اس کی ہتھیلیوں پر ایک چارپائی کے دو پائے رکھے ہوئے تھے۔ ایک پایا ایک ہتھیلی پر دوسرا دوسری پر۔ چارپائی کے اس سرے پر دو کانسٹیبل بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چارپائی پر جسم کا پورا وزن جھٹکے سے ڈالتے تھے۔ ملنگ بڑی زور سے تڑپتا اور چیختا تھا۔ تھانیدار نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا ___ 'کہو میں نے اسے قتل کیا ہے'، ملنگ کے منہ سے چیخوں کی طرح نکلا ___ 'اللہ تمہارا بیڑہ غرق کرے میں نے کسی کو قتل نہیں کیا' ___ تھانیدار نے مجھے چارپائی پر کانسٹیبلوں کی جگہ بیٹھنے کو کہا اور کانسٹیبلوں کو کچھ اشارہ کیا۔ وہ اٹھے تو تھانیدار بھی میرے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ دونوں پائیوں پر ہم دو آدمیوں کا وزن ملنگ کی ہتھیلیوں کو کس بے دردی سے کچل رہا تھا......

''ایک کانسٹیبل نے ملنگ کی ایک ٹانگ ٹخنے سے پکڑی۔ دوسرے نے دوسرا ٹخنہ پکڑا اور ٹانگوں کو باہر کی طرف کھینچنے لگے جیسے ملنگ کے جسم کو دو حصوں میں چیر دیں گے۔ اس وقت ملنگ نے جو واویلا کیا اس سے تو آسمان بھی ہل گیا ہوگا۔ اس کے چہرے پر پسینہ اُمڈ آیا۔ کانسٹیبل ابھی تک اس کی ٹانگیں اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے اور جھٹکے دے رہے تھے۔ آخر ملنگ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اسے آزاد کر کے بٹھا دیا گیا۔ پانی پلایا گیا۔ اس نے تھانیدار کے پاؤں پکڑے اور سر اس کے پاؤں پر رکھ دیا۔ وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ___ 'آپ پھر کہیں گے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس کی جیب سے وہ ساری رقم نکالی تھی جو اس نے تیکے سے جیتی تھی۔ اس وقت وہ کھیتوں میں مرا پڑا تھا' ___ تھانیدار اتنی جلدی اس کی بات پر یقین کرنے والا نہیں تھا۔ اس نے ملنگ سے کہا کہ وہ اصل بات پر آجائے ورنہ وہ پچھتائے گا۔ وہ اصل بات پر نہیں آرہا تھا۔ اس کے سر کے بال خاصے لمبے تھے۔ ان کے ساتھ رسی باندھ کر ایک کانسٹیبل زور زور سے رسی کو جھٹکے دینے لگا۔ پھر اسے کچھ ایسی اذیتیں دی گئیں جو میں بیان نہیں کر سکتا کیونکہ ان کو آپ الفاظ میں نہیں لا سکتے۔

''اسی میں صبح ہوگئی۔ ملنگ اسی بات پر قائم تھا کہ اس نے لاش کی جیب سے رقم نکالی تھی۔ اس نے قتل نہیں کیا۔ تھانیدار نے اسے کہا کہ وہ پورا بیان دے۔ اس نے تیکے میں لڑائی جھگڑے کی وہی بات سنائی جو پہلے معلوم ہو چکی تھی۔ مقتول تیکے سے نکل گیا۔ ملنگ آخری پیسہ بھی ہار چکا تھا۔ وہ غصے میں باہر نکل گیا۔ وہ گھر کو جارہا تھا۔ وہ کھیتوں کے راستے سے گزرا۔ اسے ایک مینڈھ کے قریب اندھیرے میں کپڑے سے پڑے نظر آئے۔ اس نے قریب جا کر دیکھا۔ وہ کوئی آدمی تھا۔ اس نے ماچس جلائی تو وہ مقتول تھا۔ ملنگ نے اس کی نبض دیکھی وہ مر چکا تھا۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ اسے فوراً خیال آیا کہ اس کی جیب میں رقم ہونی چاہئے۔ اسے امید نہیں تھی کہ اسے رقم ملے گی کیونکہ وہ یہ سمجھا تھا کہ کسی رہزن نے اسے قتل کر کے رقم اڑالی ہوگی۔ ملنگ نے اس کے پاس بیٹھ کر جیب میں ہاتھ ڈالا تو رقم موجود تھی۔ اس نے تمام رقم نکال کر اپنی خالی گتھی میں ڈال لی۔ اس کے ہاتھوں کو خون لگ گیا تھا۔ لاش کے کپڑے خون سے تر تھے۔ خون ابھی گرم تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے ابھی ابھی کوئی قتل کر گیا ہے۔ ملنگ رقم سنبھال کر وہاں سے کھسک گیا۔ گھر لالٹین کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کے کرتے کی آستینوں پر اور دامن پر خون کے داغ لگ گئے تھے۔ اس نے بیوی کو بتا دیا کہ وہ رقم ایک لاش سے اڑا لایا ہے۔ اس نے بیوی کو پچاس روپے دیئے باقی رقم جوئے کے لیے رکھ لی۔ بیوی کوئی شریف عورت نہیں تھی۔ وہ رقم دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے ملنگ کا کرتہ پاجامہ اتروا کر پانی میں بھگو دیا تاکہ خون کے داغ پکے نہ ہو جائیں۔ وہ کپڑے صبح دھونا چاہتی تھی......

''تھانیدار کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ کسی کو یہ بتا کر کہ اس نے لاش دیکھی ہے، پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسرے ں اس نے اسی رقم سے جوا کھیلا۔ کچھ ہارا کچھ جیتا اور رقم کچھ کم ہوگئی۔ تھانیدار نے اس سے بھاگنے کی وجہ پوچھی تو بھی اس نے کہا کہ وہ ڈر کر بھاگا تھا۔ وہ دراصل جاہل چرسی اور جواری تھا۔ اس میں اتنی عقل ہی نہیں تھی۔ تھانیدار نے اسے آرام کرنے کو کہا اور باہر آکر اسسٹنٹ سب انسپکٹر سے مشورہ کرنے لگا۔ وہ دونوں اس فیصلے پر پہنچے کہ شہادت اسی کے گرد گھوم رہی ہے۔ ہندو اے۔ ایس۔ آئی نے کہا کہ دوسرے مشتبہ اشخاص صاف معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ان کی بحث میں بہت دلچسپی لی اور مشورہ دیا کہ اس سے اقبال جرم کرایا جائے۔ مسئلہ یہ تھا کہ شہادت اور ثبوت کہاں سے لایا جائے۔ میں نے

انہیں کہا کہ میں شہادت کے کچھ خانے پُر کردوں گا۔ مجھے اپنی ضرورت بتائیں۔ میں اسی پر زور دے رہا تھا کہ قاتل یہی ہے۔ یہ انتقام کے غصے سے مقتول کے پیچھے گیا تھا۔ اسے قتل کر کے رقم اڑا لی۔ اگر یہ قاتل نہیں تھا تو یہ بھاگا کیوں؟ اگر یہ ڈرنے والا ہوتا تو ہمارے آدمی کے سروں پر اینٹیں نہ مارتا۔ یہ تو اس کا ارادہ قتل تھا......

''ملنگ کی ایک بار پھر شامت آ گئی۔ تھانیدار رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ اس کا دماغ تھک گیا تھا۔ اس نے اسی ذہنی حالت میں یہی فیصلہ کیا کہ قاتل ملنگ ہے۔ ملنگ کی حالت یہ تھی کہ وہ بھی ساری رات کا جاگا ہوا تھا۔ ڈرا ہوا بھی تھا۔ ایک آدمی کو زخمی کرنے کا مجرم بھی تھا۔ تشدد نے اس جسم توڑ دیا تھا اور اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ چرس کے نشے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے سگریٹ مانگا تو اسے کہا گیا کہ وہ پولیس کی مرضی کے مطابق بیان دے دے تو اسے آدھا پاؤ چرس دی جائے گی۔ مجھے زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ نشہ کتنی خطرناک چیز ہے۔ نشے سے ٹوٹا ہوا آدمی نشے کے لیے جان تک جتنی قیمت دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ دواڑھائی گھنٹے کی مزید پھینٹی اور چرس کے لالچ سے وہ اقبالی بیان پر آمادہ ہو گیا۔ تھانیدار نے اسے کہا کہ جو بیان اسے بتایا جائے وہ وہی بیان مجسٹریٹ کو دے۔ اسے یقین دلایا گیا کہ اگر وہ کہہ دے کہ مقتول نے اسے ماں، بہن کی گالیاں دیں اور اس نے اسے اشتعال میں آ کر قتل کر دیا تو اسے سزا نہیں ملے گی۔ اسے یہ بھی کہا گیا کہ وہ بے شک فرار اور ایک آدمی کو زخمی کرنے کا ذکر کر دے، پولیس کی طرف سے اس پر ان دو جرائم پر کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ یہ ایک جھوٹا وعدہ تھا......

''اسے بیان یاد کرائے گئے۔ لکھے گئے۔ اس کا انگوٹھا لگوایا۔ پھر اسے بتایا گیا کہ اب اگر اس نے مجسٹریٹ کے آگے اس بیان کے خلاف کوئی بات کی تو اسے اس کی سزا الگ ملے گی۔ اس بے چارے کو علم نہیں تھا کہ پولیس کو دیئے ہوئے بیان کی عدالت میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اسے مجسٹریٹ کے سامنے لے جایا گیا۔ وہاں اس نے وہی بیان لکھوا دیا جو اسے تھانے میں یاد کرایا گیا تھا۔ اس نے لکھوا دیا کہ اس نے مقتول کو قتل کیا ہے۔ باقی تمام مشتبہ اشخاص کو اس وعدے پر تفتیش سے خارج کیا گیا کہ انہیں جو بیان بتائے جائیں گے وہ عدالت میں وہی بیان دیں۔ وہ سب ڈرے ہوئے تھے۔ تھانیدار کی بات نہ ماننے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ملنگ تو جیل کی حوالات میں جا چکا تھا......مقدمہ تیار کرنے کا مرحلہ آیا جو بہت ہی مشکل

تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ میں کس قسم کے گواہ تیار کروں۔ میں نے ملنگوں کو ڈرایا اور انہیں بیان یاد کرائے۔ انہیں یہ کہنا تھا کہ مقتول نے قاتل کو مارا پیٹا اور گالیاں دی تھیں اور قاتل یہ کہہ کر بڑے غصے میں اس کے پیچھے چلا گیا تھا کہ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لے گا۔ یہ بھی کہ اس نے تکیے میں ہی چاقو کھول لیا تھا......

''تھانیدار نے قتل کا باعث جوا اور لڑائی جھگڑا رکھا تھا۔ ملنگوں کو یہ بھی بتایا کہ وہ کہیں کہ مقتول عادی جواری اور چرسی تھا اور تکیے پر باقاعدہ آتا اور اکثر دنگا فساد کرتا تھا۔ مقتول کی پہلی اور دوسری بیوی کو بتایا گیا کہ وہ بیان دیں کہ مقتول چرس پیتا اور جوا کھیلتا تھا۔ مقتول کی پہلی بیوی کے بھائیوں کو بھی پولیس کے مطلب کے بیان ذہن نشین کرائے گئے۔ ملنگ کے چاقو اور پیسوں والی گتھی کی برآمدگی اس کے گھر کی تلاشی میں لکھی گئی۔ مشیر نامے پر میں نے اور ایک اور مجھ جیسے آدمی نے دستخط کیے۔ ملنگ کا کرتہ اور پاجامہ بھی قبضے میں لے لیا گیا تھا لیکن خون کے داغ بالکل صاف ہو چکے تھے۔ اس طرح بڑی محنت سے شہادت اور ثبوت تیار کیے گئے۔ گواہوں کو مشق کرائی گئی اور مقدمہ مجسٹریٹ کے سامنے گیا۔ تین دفعات لگائی گئیں۔ قتل، حراست سے فرار اور ایک آدمی کو شدید زخمی کرنا۔ ملنگ کی بیوی نے بالکل معمولی سا وکیل کیا۔ تھانیدار خوش ہوا کہ یہ وکیل مقدمہ ہار جائے گا مگر وکیل نے یہ عقل مندی کی کہ ملنگ کو کوئی بیان نہ دینے دیا اور جرح بھی نہ کی......

''مقدمہ سیشن کورٹ میں گیا۔ وہاں ملزم نے بیان دیا کہ اسے چرس پلا کر اور ظالموں کی طرح تشدد کر کے اقبالی بیان لکھوایا گیا ہے۔ وکیل نے ہر گواہ پر جرح کی سیشن کورٹ نے ملزم کو قتل میں عمر قید سزا دی۔ حراست سے فرار میں بری کر دیا کیونکہ ملزم کا ریمانڈ نہیں لیا گیا تھا۔ لہٰذا حراست ثابت نہ ہو سکی۔ فرار ثابت نہ ہوا تو فرار اور تعاقب میں کسی کو زخمی کرنے کا الزام بھی ختم ہو گیا۔ ملنگ نے اپیل کی۔ اسی وکیل نے جو بڑا ہی معمولی تھا۔ ایسے نکتے نکال لیے کہ اپیل منظور ہو گئی اور ملزم کو شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا گیا...... یہ میری دعاؤں کا اثر تھا کہ وہ بری ہو گیا۔ اس کے خلاف گواہیاں تیار کر کے میں خدا سے دعائیں مانگتا رہا کہ یا خدا، اسے بری کر دینا''۔

''کیوں؟''___ میں نے اس سابقہ مخبر سے پوچھا___ ''آپ اس کے لیے کیوں دعا مانگتے رہے تھے؟''

''کیونکہ وہ قاتل نہیں تھا'' ــــ انہوں نے جواب دیا ــــ ''میرے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ قاتل کون ہے''۔

''کون تھا قاتل؟''

''میں'' ــــ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا ــــ ''اسے میں نے قتل کیا تھا''۔

''آپ نے؟'' ــــ میں نے حیرت سے اچھل کر پوچھا ــــ ''آپ نے قتل کیا تھا؟''

''جی، میں نے'' ــــ انہوں نے کہا ــــ ''میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ مقتول کتنا رذیل انسان تھا۔ شریف گھرانوں کی بیٹیوں کو بدنام کرتا پھرتا تھا۔ اس قدر شیطان فطرت انسان تھا کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ غیبت اس کی خصلت تھی۔ اس کی پہلی بیوی شریف عورت تھی۔ اسے اس نے سات سال پریشان رکھا۔ آخر اس پر بدچلنی کا الزام لگا کر اسے طلاق دے دی۔ یہ عورت مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ ہمارے گھر آجاتی جاتی تھی۔ طلاق دے کر اس نے اس شریف اور مظلوم عورت کو ہر جگہ بدنام کر دیا تاکہ اس کی کہیں دوسری شادی نہ ہو جائے۔ میری ایک چھوٹی بہن تھی۔ ہم نے اس کی منگنی کر دی۔ ہم شادی کا دن مقرر کرنے کی سوچ رہے تھے کہ لڑکے والوں نے منگنی توڑ دی۔ انہوں نے کسی کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ انہیں معلوم ہوا ہے کہ لڑکی کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سن کر میری اور میرے والدین کی حالت کیا ہوئی ہوگی۔ میں نے پتہ کرایا تو یہ راز کھلا کہ مقتول نے اپنی عادت کے مطابق کہیں یہ کہا کہ اس لڑکی کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں۔ اس نے یہ بکواس دو تین جگہ کی اور بات پھیل گئی۔ میں نے پوری تفتیش کی اور ثابت ہو گیا کہ اس شخص نے یہ بکواس کی ہے۔ میں پولیس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والا آدمی تھا۔ میں ہر کھیل کھیل سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس شخص کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری بیوی مر چکی تھی۔ کوئی بچہ نہیں تھا۔ شادی کو دو سال ہوئے تھے کہ بیوی مر گئی۔ اسے مرے ایک سال ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ پکڑے گئے تو کوئی بات نہیں......

''میں اس شخص کی تاک میں رہا۔ ایک شام اسے تکیے کی طرف جاتے دیکھ لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جوا کھیلنے گیا ہے۔ میں کچھ وقت گزار کر کھیتوں میں چلا گیا۔ وہ اڑھائی تین گھنٹے بعد آیا۔ میں نے اسے روک لیا اور کہا کہ تم نے میری بہن کو بھی بدنام کر دیا ہے۔ وہ کوئی جواب دینے لگا تھا کہ میں نے اپنے ہاتھ میں کھولا ہوا چاقو اس کے سینے میں اتار دیا۔ دوسرا وار بھی اسی

جگہ کیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر آگے کو جھکا تو میں نے اس کی پیٹھ پر چاقو مارا۔ وہ گرا اور تڑپنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں گھر آگیا۔ میرے والدین اور بہن وغیرہ سو گئے تھے۔ میرا کمرہ الگ تھا جس کا دروازہ باہر کو بھی کھلتا تھا۔ اسے میں نے تالا لگا دیا تھا۔ کمرے میں گیا۔ میرے کپڑوں پر خون کے چھینٹے تھے۔ میں نے کپڑے اتارے اور غسل خانے میں جا کر خوب مل کر دھوئے۔ چاقو بھی صاف کیا۔ صبح ماں اور بہن نے صحن کی رسی پر میرے کپڑے پھیلے ہوئے دیکھے تو مجھ سے پوچھا کہ یہ کس نے دھوئے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ رات میں کیچڑ میں گر پڑا تھا۔ دیر سے آیا تو خود ہی دھو لیے۔ تمہارے لیے رہنے دیتا تو صبح تک گندے کیچڑ کے داغ پکے ہو جاتے......

''پھر اطلاع ملی کہ کھیتوں میں شفیق کی لاش پڑی ہے۔ میں دوڑتا گیا میری خوش قسمتی یہ تھی کہ میں پولیس کا مخبر تھا اور تھانیدار کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ میں اس کے ساتھ لگ گیا اور اسے گمراہ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے بڑی محنت سے مخبری کی اور کئی مشتبہ اشخاص پیش کر دیئے۔ قدرت نے یہ مدد کی کہ وہاں یہ ملنگ پہنچ گیا اور اپنے ننگے پاؤں کے کھرے وہاں چھوڑ آیا۔ اس نے لاش کی جیب سے پیسے بھی نکالے اور وہ اتفاقیہ اس پھندے میں پھنس گیا۔ اگر وہ بھاگتا نہ تو پولیس سے بچ جاتا۔ اسے دراصل میں نے بھگایا تھا۔ یہ طریقہ اچانک میرے دماغ میں اس وقت آیا تھا جب میں پولیس کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ تھانیدار اور کانسٹیبل اور چلے گئے تو ملنگ میرے ساتھ پیچھے رہ گیا۔ دوسرا مخبر ہم سے بھی پیچھے تھا۔ میرے دماغ میں آگئی کہ یہ ملنگ گنوار آدمی ہے۔ اس کے خلاف الزام پکا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اسے کان میں کہا ــــ 'اوئے، پیچھے مڑو اور بھاگو۔ کوئی پکڑے تو اس کا سر کھول دو۔ شہر سے نکل جاؤ تمہارے کون سے یہاں بچے روتے ہیں' ــــ وہ ڈرا ہوا ملنگ اُلو کا پٹھا بن گیا اور بھاگ نکلا۔ اسے بھگا کر میں نے دراصل ثابت کر دیا تھا کہ قاتل وہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ واقعی ایک آدمی کا سر کھول دے گا......

''میں نے اس کے خلاف گواہیاں بھی تیار کیں لیکن میں سچے دل سے دعا کرتا رہا کہ وہ بری ہو جائے۔ اس قسم کے مقدموں کی اونچ نیچ سے مجھے واقفیت تھی۔ اس کا وکیل سستا تھا اور بہت کمزور۔ اسے میں نے چوری چھپے بتایا تھا کہ مجسٹریٹ کی عدالت میں کسی گواہ پر جرح نہ کرے اور کیس سیشن میں جانے دے۔ وہاں بھی میں نے اسے کچھ کام کی باتیں بتائی تھیں اور

کہا تھا کہ اپنے ملزم سے کہو کہ اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے۔ سیشن جج نے اسے بری کرنا مناسب نہ سمجھا اور سزا دے دی۔ ہائی کورٹ میں وکیل نے دو نکتے ایسے پیش کیے جن پر ملنگ بری ہو گیا اور میرا ضمیر صاف ہو گیا۔ جہاں تک مقتول کا تعلق ہے، میں اس کے قتل پر شرمسار نہیں ہوں۔ اس کے گناہوں کا سایہ مرنے کے بعد بھی اس کی پہلی بیوی سے ہٹا نہیں تھا۔ وہ جوانی کی عمر میں تھی۔ کوئی گھرانہ اس کا رشتہ قبول نہیں کرتا تھا کیونکہ سب کہتے تھے کہ اسے بدچلنی کے الزام میں طلاق ملی ہے۔ کوئی ایک بھی عورت یا مرد ایسا نہیں تھا جو یہ بتاتا کہ اس کے تعلقات کس کے ساتھ تھے۔ آخر میں نے اپنی ماں سے کہا کہ اس کا رشتہ مانگ لو۔ اس کے والدین نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی نیک چلن اور مظلوم بیٹی کے دن پھرے۔ میں نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ وہی عورت جسے سات سال اولاد نصیب نہ ہوئی۔ میرے پانچ بچوں کی ماں بنی''۔

عینی شاہد اللہ تھا

قتل کی جو واردات میں سنانے لگا ہوں یہ پاکستان کے اس قصبے میں ہوئی تھی جس کے تھانے کا میں ایس ایچ او تھا۔ آج تو یہ قصبہ ایک بڑا شہر بن گیا ہے، اس وقت یہ چھوٹا قصبہ تھا۔ تھانے میں رپورٹ آئی کہ ایک جوان آدمی کی لاش کھیتوں میں پڑی ہوئی ہے۔ اس شخص کا باپ اور بڑا بھائی اپنے محلے کے دو معززین کو ساتھ لے کر تھانے آئے تھے۔ معززین نے بتایا کہ یہ قتل کی واردات ہے۔ ثبوت اس کا یہ دیا کہ لاش کے گلے میں ایک رسی موجود پائی گئی ہے۔

میں نے ایف آئی آر کی تحریر کے لیے جو سوال پوچھنے تھے وہ پوچھے اور محرر ہیڈ کانسٹیبل کو ایف آئی آر تحریر کرنے کو کہا، پھر میں موقعہ پر چلا گیا۔ قصبہ جہاں ختم ہوتا تھا وہاں سے آگے کھیت تھے۔ قصبے کی تین چار گلیاں کھیتوں کی طرف جاتی تھیں۔ مارچ کے مہینے کا آخر تھا۔ گندم کی فصل اونچی تھی۔ خوشے پورے پورے نکلے ہوئے تھے۔ اس وقت فصل قدرتی کھاد کی پیداوار ہوتی تھی۔ ابھی مصنوعی کھاد شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے فصل اونچے ہوتے تھے۔

لاش مینڈھ سے سات آٹھ قدم دور فصل کے اندر پڑی ہوئی تھی۔ مینڈھ کے قریب بہت ساری فصل ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس جگہ دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کی لڑائی ہوئی ہے۔ وہاں سے آگے کھیت کے اندر کی طرف سات آٹھ قدم تک فصل ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہ لاش کو گھسیٹنے کا نتیجہ تھا۔ آگے لاش پڑی ہوئی تھی۔ لوگوں نے بیوقوفی یہ کی تھی کہ لاش کو دیکھنے کے لیے فصل کے اندر جاتے رہے تھے۔ اس سے یہ نقصان ہوا کہ قاتل یا قاتلوں کے کھرے ختم ہو چکے تھے۔ مینڈھ پر بھی کوئی کھرا نہیں تھا۔ مینڈھ پتھر جیسی پکی تھی اور اس پر بھی لوگ چل پھر رہے تھے۔ مجھے مقتول اور قاتل کے کھرے نہیں ملے۔

لاش جوان آدمی کی تھی۔ عمر اٹھائیس سال بتائی گئی۔ وہ اسی قصبے کا رہنے والا تھا اور ضلعے کے شہر میں ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ یہ شہر قصبے سے اکیس میل دور تھا۔ مقتول پانچ دنوں کی چھٹی

آیا ہوا تھا۔ میں نے لاش کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کپڑے ہٹا کر جسم کو اچھی طرح دیکھا۔ کہیں بھی چوٹ اور زخم کا نشان نہیں تھا۔ اس کے گلے میں تقریباً ایک گز رسی پڑی ہوئی تھی۔ یہ باندھی ہوئی نہیں تھی۔ اس طرح ہوا تھا کہ یہ رسی اس کے گلے میں ڈالی گئی اور گردن کے پیچھے ایک گانٹھ دی گئی تھی۔ مقتول مر گیا تو قاتل رسی گلے میں ہی چھوڑ گئے اور گانٹھ ڈھیلی ہو گئی تھی۔ کوئی شک نہیں تھا کہ قتل کی واردات ہے۔

مقتول نے شلوار قمیض اور سویٹر پہنی ہوئی تھی۔ میں اس کی جیبیں دیکھیں۔ قمیض کی سائیڈ والی جیب میں سے بٹوہ نکلا۔ اس میں تھوڑی سی رقم تھی جو آج مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ شاید ایک سو روپیہ اور کچھ آنے دونیاں وغیرہ تھی۔ بٹوے میں سے ایک فوٹو برآمد ہوا۔ مقتول ایک جوان لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ مقتول کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔ کلائی کے ساتھ گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے مقتول کے باپ کو فوٹو دکھا کر پوچھا کہ لڑکی کون ہے۔

"میرے اس بیٹے کی بیوی ہے"۔۔۔ مقتول کے باپ نے جواب دیا۔

میں کیا حال بتاؤں اس باپ کا جس کا جوان بیٹا اس کے سامنے مرا ہوا پڑا تھا اور اس کی بہو گھر میں بیٹھی اپنی قسمت کو رو رہی ہو گی۔ یہ مقتول کی اپنی بیوی کے ساتھ محبت کی نشانی تھی کہ اس نے بیوی کا فوٹو اپنے بٹوے میں رکھا ہوا تھا۔

بٹوے میں رقم، انگلی میں انگوٹھی اور کلائی پر گھڑی کی موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ قتل کی یہ واردات رہزنوں کی نہیں۔ رہزن گلے میں رسی ڈال کر نہیں مارا کرتے تھے۔ اگر ان کے ساتھ کوئی شخص لڑائی کرے تو رہزن چاقو چلایا کرتے تھے۔ اس واردات میں رہزنی والا شک تو میرے دماغ سے فوراً نکل گیا۔

میں نے چارپائی منگوا کر لاش کو ہسپتال برائے پوسٹ مارٹم بھیج دیا اور خود مقتول کے محلے میں چلا گیا۔ مجھے کسی اور کی بیٹھک میں بٹھایا گیا۔ یہ ایک اچھی حیثیت والے ریٹائرڈ آدمی کا گھر تھا۔ وہ بڑی اچھی تعلیم والا بھی تھا۔ میں نے اسی کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

"میں نے مرنے والے کے گھر کے افراد سے تو ہر بات پوچھی ہی ہے"۔۔۔ میں نے اس کو کہا۔۔۔ "لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو گھر والے پردے میں رکھتے ہیں اور وہ باتیں باہر سے معلوم ہوتی ہیں۔ کیا آپ میری مدد کریں گے؟...... یہ لوگ کیسے ہیں جن کا آدمی قتل ہو گیا ہے؟ ان کی کسی کے ساتھ دشمنی یا عداوت ہو گی۔ اگر آپ کچھ جانتے ہیں تو بتا دیں۔ مقتول کا اخلاق کیسا

تھا؟"

"جی ہاں!"۔۔۔ اس نے جواب میں کہا۔۔۔ "میں اسی محلے کا آدمی ہوں۔ قادر مقتول کو، اس کے باپ اور بڑے بھائی کو اور اس کے گھر کی عورتوں کو بھی جانتا ہوں۔ میں ان سب کو شریف لوگ کہا کرتا ہوں۔ قادر بھی اچھے اخلاق کا آدمی تھا۔ اس گھر کی عورتیں بھی تعریف کے قابل ہیں۔ ان کے ساتھ کسی نے کیا دشمنی رکھنی ہے۔ قتل تو وہاں ہوتے ہیں جہاں خاندانی عداوتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کے درمیان مقدمہ بازی چلتی ہے۔ کبھی ایک آدمی ادھر کا زخمی یا قتل ہو گیا کبھی ایک آدمی ادھر کا زخمی یا قتل ہو گیا۔ اس خاندان کی ایسی دشمنی کسی کے ساتھ نہیں"۔

"مقتول کی شاید کسی کے ساتھ دشمنی ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ نہیں"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "یا میں جانتا نہیں یا دشمنی ہے ہی نہیں۔ یہ جہاں ملازم ہے وہاں اس کا کوئی دشمن ہو سکتا ہے"۔

"اگر ایسا ہے تو مقتول یہاں قتل نہ ہوتا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "دشمن اسے وہیں اپنے شہر میں قتل کر دیتے"۔

"میں جو کچھ جانتا ہوں وہ بتا رہا ہوں"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "یہ آپ نے دیکھنا ہے کہ میری بتائی ہوئی کون سی بات آپ کے لیے کارآمد ہو سکتی ہے۔ ان کی ایک دشمنی ہے لیکن یہ قتل تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ ایک گھر کا تنازعہ ہے"۔

"آپ بات کریں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "ہو سکتا ہے آپ سے ہی میرے مطلب کی کوئی بات معلوم ہو جائے...... ان کا یہ کیا تنازعہ ہے!"

"قادر کی بیوی تقریباً ایک سال سے اپنے گھر بیٹھی ہوئی ہے"۔۔۔ اس معزز آدمی نے کہا۔۔۔ "یہ لوگ اسے بساتے بھی نہیں اور اس کو طلاق بھی نہیں دیتے"۔

"ان کا آپس میں کبھی لڑائی جھگڑا ہوا ہے"۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ لڑائی جھگڑا زبانی نہیں بلکہ ہاتھا پائی طرز کی لڑائی ہوئی ہے؟"

"نہیں صاحب!"۔۔۔ اس نے جواب میں کہا۔۔۔ "ایسی لڑائی تو کبھی نہیں ہوئی۔ زبانی کلامی جھک جھک ہوتی رہی ہے پھر وہ بھی ختم ہو گئی تھی یا آپ یہ سمجھ لیں کہ معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ گیا ہے"۔

"ناچاقی کی وجہ کیا ہے؟"

''جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وجہ کوئی اتنی بڑی نہیں''۔۔۔ اس معزز شخص نے کہا۔۔۔ ''قادر یعنی یہ آدمی جو قتل ہوگیا ہے اس کی ماں بڑی سخت سیاست باز اور فسادن ہے۔ قادر کی ماں نے قادر کی بیوی کا ناطقہ بند کیا ہوا تھا۔ آگے قصہ کچھ اس طرح ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ لڑکی ٹھیک نہیں تھی اور لڑکی والے کہتے ہیں کہ لڑکی اور قادر میں بہت پیار تھا جو قادر کی ماں کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ پھر اس طرح ہوا کہ لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی اور پھر واپس نہیں آئی۔ معلوم نہیں یہ لوگ اس کو لینے نہیں گئے یا انہوں نے لڑکی کو بھیجا ہی نہیں''۔

''قادر کے بٹوے سے اس کی بیوی کی تصویر نکلی ہے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اس سے تو یہ ثبوت ملتا ہے کہ قادر کو اپنی بیوی کے ساتھ اب بھی پیار ہے...... کیا آپ اس لڑکی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟''

''مجھے اچھا نہیں لگتا کہ بغیر کسی ثبوت کے اور بغیر کسی شہادت کے کسی پر اتنا غلط الزام لگا دوں''۔۔۔ اس نے شریف اور معزز آدمیوں کی طرح کہا۔۔۔ ''میں سنی سنائی آپ کے گوش گزار کر دیتا ہوں۔ آگے آپ خود تفتیش کر کے صحیح صورت حال معلوم کر لیں...... پہلی بات تو یہ سنی ہے کہ تقریباً ایک مہینے سے لڑکی گھر سے غائب ہے''۔

''غائب ہے؟''۔۔۔ میں نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔۔۔ ''ایک مہینے سے؟...... میرے پاس اس کی گمشدگی کی پورٹ نہیں آئی''۔

''پھر ہو سکتا ہے یہ بات غلط بھی ہو''۔۔۔ اس معزز آدمی نے کہا۔۔۔ ''میں نے عرض کیا ہے کہ میں سنی سنائی سنا رہا ہوں۔ عورتوں نے یہ مشہور کیا ہوا تھا کہ لڑکی گھر میں نہیں۔ پہلے تو اس لڑکی کے چال چلن کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں سنی تھی لیکن سسرال والوں نے اسے گھر بٹھا دیا تو تھوڑے عرصے بعد اس لڑکی کے خلاف باتیں اٹھنے لگیں۔ میں کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا، سنا ہے کہ لڑکی کو رات کے وقت کہیں آتے جاتے دیکھا گیا ہے''۔

اس معزز آدمی نے سنی سنائی باتیں بتائی تھیں جن پر میں پورا پورا اعتبار نہیں کر سکتا تھا پھر بھی مجھے کچھ کارآمد اشارے مل گئے۔ میں نے اس شخص کو چھٹی دے دی اور مقتول کے باپ کو بلایا۔ باپ بیچارہ بیان دینے کی حالت میں نہیں تھا لیکن مجھے اپنے کام کی جلدی تھی۔ باپ کی حالت تو اب باقی عمر یہی رہنی تھی۔ میں نے اس سے پہلا سوال وہی پوچھا جو قتل کی واردات میں پوچھا جاتا ہے یعنی یہ کہ ان لوگوں کا دشمن کون ہے۔

''ہم نے کسی کے ساتھ کیا دشمنی رکھنی ہے صاحب!''۔۔۔ اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔۔۔ ''کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا اور کوئی تنازعہ نہیں''۔

''کیا آپ کے بیٹے کے سسرال کے ساتھ آپ کا کوئی تنازعہ نہیں؟''۔۔۔ میں نے پوچھا اور کہا۔۔۔ ''آپ شرفاء میں سے ہیں۔ میں آپ کو ایک بات پہلے ہی سمجھا دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ میں نے قاتل کو پکڑنا ہے۔ خود آپ بھی یہی خواہش کرتے ہوں گے کہ آپ کے بیٹے کا قاتل فوراً پکڑا جائے اور سزا پائے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ آپ میرے آگے جو بات زبان سے نکالیں وہ بالکل ٹھیک ہو اور دوسری بات یہ کہ مجھ سے کوئی بات چھپا کر نہ رکھیں چاہے وہ بہت معمولی سی بھی ہو...... میں نے ہر بات دوسروں سے معلوم کر لینی ہے پھر میرے دل میں آپ کی جو عزت ہے وہ نکل جائے گی۔ اب بتائیں کہ اپنے مقتول بیٹے کے سسرال کے ساتھ آپ کا کیا تنازعہ چل رہا ہے؟''

''ان کی بیٹی میرے بیٹے کے ساتھ آباد نہیں ہو سکی''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''شادی کے چھ سات مہینے بعد تک ہمارے گھر میں رہی پھر اپنے ماں باپ کے گھر گئی اور واپس نہیں آئی''۔

''مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ لڑکی کو اس کے ماں باپ کے گھر بٹھانے میں کون قصور وار ہے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کے ساتھ تمہاری دشمنی کس درجے تک پہنچ گئی تھی اور میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا لڑکی کی والے اتنی جرأت اور ہمت کر سکتے ہیں کہ آپ کے بیٹے کو قتل کر دیں؟''

''میرا جوان بیٹا قتل ہوگیا ہے''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میں تو ہر کسی کو اپنے بیٹے کا قاتل کہوں گا لیکن قادر کے سالوں پر میرے دل میں شک نہیں آیا۔ ذرا سا خیال آیا تھا لیکن یہ خیال بھی آیا کہ وہ بھی ہماری طرح عزت سے گذر بسر کرنے والے لوگ ہیں۔ میں اس شک پر غور کر چکا ہوں۔ یہ میں آپ کے گوش گذار کر دیتا ہوں۔ آپ ماشاءاللہ اس لائن میں دانشمند ہیں۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ میری بہو کو میکے میں بیٹھے ہوئے کوئی گیارہ مہینے گذر گئے تھے۔ اگر اس کے بھائیوں نے اتنی خوفناک جوابی چوٹ لگانی ہوتی تو کچھ عرصہ پہلے ہی لگا لیتے''۔

''ان کے پاس بڑی مضبوط وجہ موجود ہے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''آپ لوگوں نے لڑکی کو طلاق دینے سے انکار کیا ہوا ہے۔ انہوں نے آخر یہی طریقہ سوچا ہوگا کہ اپنی لڑکی کے خاوند کو قبر میں اتار دیں تو اس کی دوسری شادی ہو جائے گی۔ لڑکی جوان ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ ابھی

ڈیڑھ سال ہی ہوا ہے کہ اس کی شادی ہوئی تھی‘‘۔

’’کون سی بیٹی کی وہ شادی کریں گے؟‘‘___ مقتول کے باپ نے کہا___ ’’وہ تو معلوم ہوا ہے کہ ایک مہینے سے لاپتہ ہے‘‘۔

’’کیا آپ کو یقین ہے؟‘‘

’’سارے محلے کی عورتیں کہتی ہیں کہ لڑکی گھر میں نظر نہیں آتی‘‘___ اس نے جواب دیا___ ’’لڑکی پردہ نہیں کرتی۔ اِدھر اُدھر آتی جاتی ہے۔ ہر روز وہ نظر آتی تھی مگر ایک مہینے سے وہ نظر نہیں آئی‘‘۔

’’لڑکی کے بھائی کتنے ہیں؟‘‘___ میں نے پوچھا___ ’’وہ کس ٹائپ کے آدمی ہیں اور لڑکی کا باپ کس اخلاق کا آدمی ہے‘‘۔

’’مالی لحاظ سے وہ ہم سے زیادہ خوشحال ہیں‘‘___ اس نے جواب میں کہا___ ’’لڑکی کا باپ خاصا ہوشیار آدمی ہے اور اپنا اثر ورسوخ رکھتا ہے اور اس کا رعب بھی مانا جاتا ہے۔ کیا شریف اور کیا بدمعاش، اس کا کہا مانتے ہیں۔ اس کے تین بیٹے ہیں۔ بڑے دو تو ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن چھوٹا بیٹا جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہے وہ ٹھیک نہیں۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا بدمعاشوں کے ساتھ ہے اور بڑھکیں مارتا رہتا ہے۔ اس وجہ سے اسے شریفوں کی سوسائٹی میں اچھا نہیں سمجھا جاتا‘‘۔

’’ایک بات بتائیں‘‘___ میں نے پوچھا___ ’’لڑکی کو طلاق کون نہیں دینا چاہتا تھا؟...... آپ؟ آپ کی بیوی یا آپ کا بیٹا؟‘‘

’’میرا بیٹا قادر!‘‘___ اس نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ پھر اس نے کہا___ ’’میرا بیٹا تو اس کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے ضد کرتا تھا کہ طلاق نہیں دوں گا۔ یہی ارادہ میرا تھا لیکن میری بیوی کو اللہ غارت کرے، کہتی تھی کہ طلاق دینی ہی ہے۔ بڑی ضدی عورت ہے اور اتنی جھگڑالو کہ میرے قابو میں بھی نہیں۔ میں نے تو بیٹوں کو اور دونوں بہوؤں کو کہہ دیا تھا کہ اس عورت کے ساتھ گذر بسر کرنی ہے تو اس طرح کرو کہ نہ تمہاری آنکھیں ہیں نہ کان ہیں‘‘۔

’’کیا قادر کے سسرال کو معلوم تھا کہ قادر لڑکی کو بسانے کا خواہشمند ہے؟‘‘

’’اگر قادر زندہ ہوتا تو وہی اس سوال کا جواب دیتا‘‘___ اس نے بڑی لمبی آہ لے کر کہا___ ’’مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ وہ لوگ طلاق کا تقاضا کرتے رہے اور ہماری طرف

سے میری بیوی جواب دیتی رہی‘‘۔

’’کیا یہ لڑکی اب آ کر کچھ خراب ہوگئی تھی؟‘‘___ میں نے پوچھا۔

’’باتیں کچھ ایسی ہی سنی ہیں‘‘___ مقتول کے باپ نے جواب دیا___ ’’یہ بھی سنا ہے کہ اسے رات کو کہیں آتے جاتے دیکھا گیا ہے‘‘۔

’’کیا آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ رات کو کس کے پاس جاتی تھی‘‘___ میں نے پوچھا۔

’’میں نے پہلے کبھی دھیان نہیں دیا تھا‘‘___ اس نے کہا___ ’’اب کوشش کروں گا کہ معلوم ہو جائے‘‘۔

اس شخص کی باتیں سنتے سنتے میرے ذہن میں ایک شک پیدا ہوا۔ لڑکی آخر جوان تھی اور اس نے ازدواجی زندگی کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔ اس نے آخر تنگ آ کر اپنی پسند کے کسی آدمی کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے ہوں گے اور اس کے ساتھ چلی گئی ہوگی۔ اس آدمی نے قادر سے لڑکی کو آزاد کرانے کا یہ طریقہ استعمال کیا ہوگا کہ قادر کو مار دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی میرے لیے سوچنے والی بات یہ تھی کہ لڑکی کسی کے ساتھ گئی بھی ہے یا نہیں، یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ لڑکی خراب ہوگئی ہو اور بھائیوں نے اپنی بے عزتی سمجھ کر اسے ختم ہی کر ڈالا ہو۔ میں نے مقتول کے باپ کو بھیج دیا اور لڑکی کے باپ کو بلایا۔ اس سے میں نے پہلی بات یہ پوچھی کہ اس کی بیٹی کہاں ہے، میں اس کا بیان لینا چاہتا ہوں۔ وہ پہلے چپ رہا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے اس پر زور دیا کہ وہ میرے سوال کا جواب دے۔ وہ پھر بھی خاموش رہا۔ میں نے اس کے ساتھ تھانیداروں کے لہجے میں بات کی تو وہ بول پڑا۔

’’وہ تو یہاں نہیں ہے‘‘___ اس نے بڑی آہستہ سے کہا۔

’’کہاں ہے؟‘‘___ میں نے بڑے رعب سے پوچھا۔

’’تقریباً ایک مہینہ پہلے وہ لاپتہ ہوگئی تھی‘‘___ اس نے جواب دیا۔

’’مجھ سے عزت کرانا چاہتے ہو تو پوری بات کرو‘‘___ میں نے دبدبے سے کہا___ ’’میرے ہر سوال کا جواب بالکل سچ اور پورا دو۔ وہ کس طرح لاپتہ ہوئی تھی‘‘۔

’’بس جی!‘‘___ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بات سنانے پر اس کا دل راضی نہیں ہو رہا۔ آہستہ آہستہ بول کر اس نے بتایا___ ’’ایک رات ٹھیک ٹھاک سوئی۔ صبح دیکھا تو لاپتہ تھی۔ اس کا ایک اٹیچی کیس بھی لاپتہ تھا۔ تھوڑا سا زیور اور اس کے جو قیمتی اور بہت اچھے کپڑے تھے۔ وہ

بھی نہیں تھے۔ وہ اپنے سینڈل دو جوڑے بھی لے گئی تھی"۔

"کیا آپ جاہل آدمی ہیں؟"ــــ میں نے پوچھا ــــ "تھانے میں رپٹ لکھوائی تھی؟"

"نہیں"ــــ اس نے جواب دیا ــــ "بالکل صاف معاملہ تھا جناب کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ کوئی اسے زبردستی اٹھا کر لے جاتا تو اس کا اٹیچی کیس، زیور کپڑے اور سینڈل وغیرہ تو نہ لے جاتا...... ہم اپنی عزت کی خاطر خاموش رہے"۔

"کہیں تلاش کیا تھا؟"ــــ میں نے پوچھا ــــ "اس کے سسرال سے پتہ کیا تھا؟ ان کا گھر آپ کے گھر سے دور نہیں"۔

سسرال جا کر اس نے کیا کرنا تھا جی!"ــــ اس نے کہا ــــ "ان کے ساتھ تو بول چال بھی بند ہے"۔

"آپ کی بیٹی راتوں کو کسی سے ملتی تھی"ــــ میں نے کہا ــــ "آپ کو معلوم ہوگا"۔

"نہیں جناب!"ــــ اس نے کہا ــــ "مجھے یہ معلوم ہے کہ میری بیٹی کو لوگ بدنام کر رہے ہیں۔ یہ دراصل میری لڑکی کی ساس کا کام ہے۔ وہ ثابت کرتی پھرتی ہے کہ میری بیٹی کا چال چلن خراب تھا اس وجہ سے اسے اس کے بیٹے نے گھر سے نکال دیا ہے"۔

میں نے اس مسئلے پر غور کیا تو میرا دماغ اسی شک پر رک جاتا تھا جو میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ لڑکی اپنی پسند کے آدمی کے ساتھ چلی گئی ہے اور اس آدمی نے مقتول کو قتل کر کے راستے سے ہٹایا ہے۔ اس کے باپ کو میں نے بہت ٹٹولا لیکن اس نے کوئی آدمی نہیں بتایا۔

اس کے بعد نے لڑکی کی ماں کو بلایا۔ اس نے بھی یہی بتایا کہ اس کی بیٹی اپنے کپڑے اور زیور اٹیچی کیس میں ڈال کر لے گئی ہے۔

"مائیں بیٹیوں کی رازدار ہوتی ہیں"ــــ میں نے کہا ــــ "اس نے تمہیں بتایا ہوگا کہ یہ خاوند طلاق دے دے تو وہ فلاں آدمی کے ساتھ شادی کر لے گی"۔

"اس نے ایسی بات میرے ساتھ کبھی نہیں کی تھی"ــــ اس نے جواب دیا ــــ "اپنی سہیلیوں کو شاید بتائی ہوگی"۔

اس عورت سے بھی میں نے بہت پوچھ گچھ کی لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی بیٹی کو خاوند نے اپنے گھر کیوں نہیں رکھا۔

"اس کی ساس کے بارے میں اگر میں کوئی بات منہ سے نکالوں گی تو آپ کہیں گے کہ یہ

عورت دشمنی کی وجہ سے ایسی باتیں کر رہی ہے"ــــ اس نے کہا ــــ "آپ اس عورت کے پڑوسیوں سے اور محلے والوں سے پوچھیں۔ وہ آپ کو بتائیں گے...... اگر میری زبان سے ہی سننا ہے تو میں دونوں طرف کی بات کروں گی۔ ادھر میری بیٹی کی ساس نری چڑیل تھی۔ اس نے میری بیٹی کو ہی نہیں، اپنے عزت دار خاوند اور بیٹوں کو بھی نتھ ڈالی ہوئی تھی"ــــ اس نے مقتول کی ماں کی وہی باتیں سنائیں جو ایک معزز آدمی اور اس کا اپنا خاوند بھی مجھے سنا چکا تھا۔ یہ باتیں سنا کر اس نے کہا ــــ "ادھر میرے گھر میں میرے بیٹے اور بیٹوں کا باپ نرے پتھر تھے۔ میری بیٹی گھر آئی تھی تو اپنی ساس کی باتیں اور سلوک سناتی تھی۔ میں اسے کہتی تھی کہ بیٹی برداشت کرو اور اپنے خاوند کے ساتھ بنا کر رکھو لیکن میرے بیٹے اور اپنے خاوند اسے کہتے تھے کہ سات ایک کہتی ہے تو اسے دس سناؤ۔ اگر زیادہ تنگ کرے تو یہاں آجاؤ۔ ہم مر نہیں گئے۔ اس طرح یہ میری بیٹی کو حوصلہ دیتے تھے کہ ساس کے گلے پڑے اور اپنے گھر آ کر بیٹھ جائے۔ اس عورت کا مقابلہ تو اس کا خاوند بھی نہیں کر سکتا۔ میری تو اپنے گھر میں کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ ساس بہو کا ڈرامہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ اسے نہ آج تک کسی نے روکا ہے اور کسی نے روکنے کی کوشش کی تو اس کو ناکامی ہوئی"۔

یہ عورت بولتی ہی جا رہی تھی۔ اس قسم کی تقریروں اور کہانیوں کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ میں نے قاتل کا سراغ لگانا تھا۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد آ گئی تھی اور محلے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کا باعث سانس رکنا لکھا گیا تھا۔ سانس رسی سے روکا گیا تھا یعنی رسی سے مقتول کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ اس کے سوا جسم پر تشدد کا اور کوئی نشان نہیں تھا۔ موت کا وقت رات ساڑھے دس اور گیارہ بجے کے درمیان لکھا گیا۔

میں نے اگلی صبح کے لیے مقتول اور اس کی بیوہ کے کچھ قریبی رشتہ داروں کو تھانے طلب کیا۔ میں رات کو سونا نہیں چاہتا تھا۔ رات کے لیے میں نے اپنے خاص مخبروں اور دو معززین کو اپنے گھر بلا لیا۔ آدھی رات کے بعد تک میں ان لوگوں سے رپورٹیں لیتا رہا۔ انہوں نے جو رپورٹیں دیں ان کو الگ الگ سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف یہ سنا دیتا ہوں کہ ان سے مجھے کیا معلوم ہوا۔

مقتول کے چال چلن اور اخلاق کے بارے میں کوئی ایک بھی رپورٹ اس کے خلاف نہیں ملی بلکہ یہ بتایا گیا کہ ہر کسی کی عزت کرنے والا اور عزت کروانے والا شخص تھا۔

مقتول کی ماں کے بارے میں ہر کسی نے وہی باتیں بتائیں جو میں پہلے سن چکا تھا۔ سب نے یہی کہا کہ مقتول کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔

مقتول کی بیوی کے بارے میں مشکوک سی رپورٹیں ملیں۔ ان رپورٹوں میں اگر کسی نے یہ کہا کہ وہ پاک صاف اور بڑے ستھرے چال چلن کی لڑکی تھی تو اسے پورا یقین نہیں تھا اور جس نے اس کا چال چلن مشکوک بتایا اس کو بھی پورا یقین نہیں تھا۔ البتہ میں ان تمام رپورٹوں کو سن کر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ لڑکی چال چلن کی ٹھیک ٹھاک تھی لیکن پچھلے تین چار مہینوں سے اس پر شبہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔

ایک آدمی بتایا گیا جو مقتول کا دوست تھا۔ وہ اسی قصبے میں رہتا تھا اور قصبے میں منیاری کی سب سے بڑی دکان اسی کی تھی۔ وہ جوان اور ذرا خوبصورت آدمی بتایا گیا تھا۔ دو مخبروں نے بتایا کہ مذکورہ لڑکی کو رات کے وقت اس کے گھر سے نکلتے ہوئے انہوں نے دیکھا ہے۔ ان دونوں مخبروں میں سے ایک نے بتایا کہ ایک بار اس نے اس لڑکی کو اس آدمی کے ساتھ شام کے بعد گلی میں کہیں کھڑے دیکھا تھا اور جب لڑکی نے مخبر کو دیکھا کہ وہ آ رہا ہے تو وہ بڑی جلدی جلدی وہاں سے چلی گئی۔

اگر میں ان مخبروں کی پوری پوری رپورٹیں سناتا تو آپ خود سمجھ جاتے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ میں اپنی بات کو مختصر کر رہا ہوں۔

مجھے اس بات کے ساتھ کوئی سروکار نہیں تھا کہ کوئی عورت کس آدمی کے ساتھ تعلقات رکھتی ہے۔ اگر مقتول کی بیوہ کا کوئی تعلق مقتول کے کسی دوست کے ساتھ تھا تو میں کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ میرا تعلق صرف اپنے کام کے ساتھ تھا جو یہ معلوم کرنا تھا کہ قتل کا باعث یہی تعلق تو نہیں۔ ایسا ممکن تھا کہ یہ شخص جس کا ذکر کیا گیا تھا، مقتول کا دوست تھا۔ اس وجہ سے مقتول کی بیوی کا اس کے ساتھ میل ملاپ تھا اور یہ میل ملاپ قابل اعتراض تعلقات کی صورت اختیار کر گیا۔ لڑکی خوبصورت بتائی گئی تھی۔ میں نے دیکھنا یہ تھا کہ یہ شخص کس ٹائپ کا ہے اور کیا یہ قتل کرنے یا قتل کروانے کی ہمت اور جرأت رکھتا ہے۔

مقتول کے سالوں کے بارے میں جو رپورٹیں ملیں وہ اس طرح تھیں کہ بڑے دونوں بھائی لوگوں سے ملنے ملانے والے آدمی ہیں اور ان کے میل ملاپ کے دائرے میں شہر کے کچھ بدمعاش ٹائپ لوگ بھی شامل ہیں۔ ایسا کہہ لیں کہ یہ دونوں بھائی شریف بھی تھے اور بدمعاش

بھی۔ ان کے چھوٹے بھائی کے بارے میں مَیں پہلے بتا چکا ہوں۔ اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی اور اس کا عام رویہ اور اخلاق وغیرہ ایسا بتایا گیا جس طرح آج کل آپ پنجابی فلموں میں ہیرو اور ولن کو دیکھتے ہیں۔

میں نے صبح بہت سے افراد کو تھانے طلب کیا ہوا تھا۔ وہ صبح ہی آنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے مزید افراد کو طلب کیا۔ ایک مقتول کا یہ دوست تھا جس کے پاس مقتول کی بیوہ جاتی تھی اور مقتول کی ساس جب آئی میں نے اس سے پوچھ کر مقتول کی بیوہ کی دو سہیلیوں کو بھی طلب کر لیا۔

مقتول کا یہ دوست پہلے آ گیا تو میں نے اسے اپنے کمرے میں بٹھایا اور پہلا سوال یہ پوچھا کہ مقتول کی بیوہ اس کے پاس آیا کرتی تھی؟

"میرے پاس آ کر اس نے کیا کرنا تھا؟" ــــ اس نے جواب دیا ــــ "ہاں ایک بات ہے جو میں آپ کو بتاؤں گا۔ وہ میرے پاس تین چار دفعہ آئی تھی اور میری منتیں کرتی تھی کہ میں اس کے خاوند کو راضی کروں کہ اسے وہ اپنے پاس بلا لے...... میری ایک بات پر اعتبار کریں جناب! اس لڑکی کو میں نے اپنے دل میں بہن کا درجہ دیا ہوا تھا۔ مقتول قادر میرا ایسا گہرا یار تھا کہ ہماری محبت دلوں میں نہیں بلکہ روحوں میں اتری ہوئی تھی" ــــ اتنا کہنے کی دیر تھی کہ اس شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر وہ بے قابو ہو کر رونے لگا۔ اس کا یہ رونا ایکٹنگ والا رونا نہیں تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد اپنے آپ کو نارمل حالت میں کیا اور کہنے لگا ــــ "لوگوں نے قادر کی بیوی کے بارے میں یہ جو مشہور کیا ہوا ہے کہ اس کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا، یہ سب بکواس ہے۔ وہ بے چاری تو اپنے خاوند کے پاس جانے کے لیے تڑپتی تھی۔ وہ اپنی ساس اور اپنی ماں، باپ اور بھائیوں کو برا بھلا کہتی رہتی تھی۔ قادر کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اپنا گھر اس لڑکی کے ساتھ آباد کرنے کے لیے روتا تھا لیکن اس کی ماں بڑی ظالم عورت ہے۔ ادھر قادر کی بیوی کا باپ اور بھائی بھی ٹھیک لوگ نہیں، ڈھیٹ لوگ ہیں"۔

اس آدمی نے بہت ساری باتیں کی تھیں اور بہت ساری باتیں میں نے پوچھی تھیں جن کے وہ جواب دیتا رہا تھا کتنی ہی دفعہ تو اس کے آنسو نکلے۔ مجھے اس پر پورا پورا اعتبار آ گیا۔ میرے ایک سوال کا جواب وہ ٹھیک طرح نہ دے سکا۔ سوال یہ تھا کہ قادر کی بیوہ کہاں غائب ہو گئی ہے؟

"اس کے لاپتہ ہو جانے کے باوجود بھی میں اسے خراب لڑکی نہیں کہوں گا" ــــ اس نے کہا ــــ "وہ اتنی نیچ لڑکی نہیں ہے کہ جس خاوند کے ساتھ وہ بسنا چاہتی تھی اسے وہ دھوکا دے اور

اس کے ساتھ بیوفائی کرے۔ اگر وہ زندہ ہے تو واپس آجائے گی"۔

"کیا بات کرتے ہو بھائی میرے!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "وہ تو اپنے کپڑے، زیور اور سینڈل وغیرہ ایک اٹیچی کیس میں ڈال کر اپنے ساتھ لے گئی ہے"۔

"مجھے لڑکی پر بھروسہ ہے اور اپنے اللہ پر بھی بھروسہ ہے"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "دیکھتے رہیں کیا ہوتا ہے"۔

"تم مجھے شک میں ڈال رہے ہو"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "شک یہ ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو"۔

"اللہ جانتا ہے"۔۔۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔۔۔ "آپ کوشش جاری رکھیں۔ گناہگار بھی اور اللہ کے نیک بندے بھی آپ کے سامنے آجائیں گے۔ میں کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا، صرف شک ہے کہ قادر کو اس کے سالوں نے خود قتل کیا ہے یا قتل کروایا ہے"۔

"وہ تمہارا دوست تھا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تمہارے ساتھ راز کی ہر بات کرتا ہوگا۔ شاید تمہیں معلوم ہو کہ اس کے دفتر کا کوئی آدمی کسی وجہ سے اس کا دشمن تو نہیں؟...... وہ گورنمنٹ کے جس محکمے میں ملازم تھا وہاں لوگوں کے کام پھنسے رہتے ہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ اس نے کسی کا کام ناجائز طریقے سے کرنے سے انکار کر دیا ہو اور اس کی آدمی کا اتنا زیادہ نقصان ہو گیا ہو کہ اس نے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا"۔

"ہاں صاحب!"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ تو وہاں جا کر اس کے دفتر سے معلوم کیا جائے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ قادر رشوت نہیں لیتا تھا۔ اس وجہ سے وہ لوگ جن کا اس کے دفتر میں کام پڑتا تھا اس سے ناراض رہتے تھے۔ پھر بھی میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ قادر کے سالوں کو مشتبہوں کی طرح شاملِ تفتیش کریں۔ خاص طور پر ان کے چھوٹے بھائی کو دھیان میں رکھیں"۔

"یہ شک تم کس بنا پر کرتے ہو؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"میں آپ کو یہی بتانے لگا تھا"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "قادر کے تینوں سالے میرے دوست تو نہیں لیکن سلام دعا بڑی اچھی ہے۔ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی ہے...... اچانک ہی ایسا ہوا کہ ان میں سے جو بھائی بھی ملا اس نے قادر کو گالیاں دیں اور بڑے غصے میں کہا کہ اس خاندان کو ہم تباہ کر دیں گے۔ ان کا چھوٹا بھائی تو کہتا تھا کہ اب قادر اور اس کی ماں بس دو دنوں کے مہمان

ہیں...... میں حیران ہوتا تھا کہ ان کی بہن کو اجڑ کر گھر بیٹھے ہوئے تقریباً ایک سال ہو گیا ہے۔ انہوں نے اس طرح کی باتیں میرے ساتھ کبھی نہیں کی تھیں، اب انہیں اچانک کیا ہو گیا ہے، اس طرح پتہ چلتا تھا جیسے ان کی بہن کو اس کے سسرال سے اب نکالا گیا ہو......

"تینوں باری باری میرے پاس آتے تھے اور یہ دھمکیاں سناتے تھے۔ میں حیران ہوتا تھا۔ پانچ چھ دنوں کے بعد بات کھل گئی کہ ان کی بہن گھر سے لاپتہ ہو گئی ہے بھائی یہ کہتے تھے کہ یہ سارا قصور قادر اور اس کی ماں کا ہے اگر یہ دونوں ہماری بہن کو گھر سے نہ نکالتے تو آج وہ لاپتہ نہ ہوتی اور ہماری یہ بے عزتی نہ ہوتی۔ مطلب یہ کہ وہ قادر اور اس کی ماں کو قصوروار ٹھہراتے تھے...... میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ کل رات قادر میرے پاس بیٹھا ہوا تھا اور دس بجے کے لگ بھگ اٹھ کر گیا تھا"۔

"سنا ہے قادر کے سب سے چھوٹے سالے کا یارانہ بدمعاشوں سے ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اور یہ بھی سنا ہے کہ یہ لڑکا اپنے آپ کو بھی غنڈہ اور بدمعاش سمجھتا ہے"۔

"آپ نے ٹھیک سنا ہے"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "بڑا چھچھورا اور اوچھا لڑکا ہے"۔

یہ خوبرو اور جوان آدمی میرے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔ اس نے اور بہت سی باتیں بتائی تھیں جو میں ساری کی ساری تحریر میں نہیں لا رہا۔ شاید ایک بات نہیں لکھی۔ وہ یہ کہ اس نے قادر کی بیوہ کے بارے میں زور دے کر کہا تھا کہ یہ لڑکی غیرت والی ہے اور جرأت والی بھی کسی سے دبنے والی لڑکی نہیں۔

مجھے اطلاع مل گئی تھی کہ قادر کی بیوی کی دو سہیلیاں آگئی ہیں۔ دونوں کے باپ ان کے ساتھ تھے۔ میں نے دونوں لڑکیوں کو اور ان کے باپوں کو بلا لیا اور انہیں پوری پوری تسلی دی کہ ان کی بیٹیوں سے قادر کی بیوہ کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے اور وہ بالکل بے فکر رہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ میری اپنی بہنیں ہیں، میں انہیں بہت جلدی فارغ کر دوں گا۔ اس کے بعد میں نے ایک لڑکی کو اپنے پاس بٹھایا اور اس سے مقتول کی بیوہ کے بارے میں پوچھا پھر دوسری لڑکی کو بلایا اور اس سے بھی پوچھا۔

دونوں کے بیان بالکل ایک جیسے تھے۔ دونوں نے کہا کہ یہ لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ کسی اور کا نام نہیں لیتی تھی۔ دو دفعہ اس نے کہا تھا کہ یہ خاوند اسے واپس نہ ملا تو وہ خودکشی کر لے گی۔ میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے لڑکیوں نے بتایا کہ گھر سے جانے سے پہلے اس نے انہیں

ذرا سا اشارہ بھی نہیں دیا تھا کہ وہ گھر سے جا رہی ہے یا وہ خودکشی کر رہی ہے۔ دونوں لڑکیاں قادر کے اس دوست کی طرح پورے یقین کے ساتھ کہتی تھیں کہ اس لڑکی کا چلن اور حوصلہ اتنا مضبوط ہے کہ اپنی جان دے سکتی ہے، اپنا جسم کسی کو نہیں دے سکتی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ تو رات رات بھر جاگتی اور وظیفے کرتی رہتی تھی۔

ان لڑکیوں کو ان کے باپوں کے حوالے اور رخصت کر کے میں نے مقتول کے سب سے بڑے سالے کو بلایا۔

''دیکھ بھائی میرے!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اگر تم اقبال جرم کر لو تو فائدے میں رہو گے''۔

''کس جرم کا اقبال کر لوں؟''۔۔۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہر ملزم اپنا بیان انکار سے شروع کرتا ہے اور اپنے آپ ہی اقبالی ہو جاتا ہے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''میں تمہارے فائدے کی بات کہہ رہا ہوں۔ اقبالی ہو جاؤ اور فائدہ مجھ سے لو۔ میں بری بھی کروا سکتا ہوں۔ میری تمہاری کوئی دشمنی نہیں اور وہ جو مارا گیا ہے میرا کچھ نہیں لگتا تھا۔ میں نے تو ان کاغذوں کا پیٹ بھرنا ہے۔ ان کا پیٹ بھر جاتا ہے تو میرا اور میرے بچوں کا پیٹ بھی بھر جاتا ہے۔ میں نے یہ ظاہر کرنا ہے کہ اپنا کام ٹھیک طرح کر دیا ہے۔ آگے عدالت کی مرضی ہے کہ سزا دے یا بری کر دے۔ عدالت کے پاس جب مقدمہ ہی کمزور جائے گا تو عدالت سزا دے ہی نہیں سکتی...... تم بات کرو''۔

اس نے پریشان ہو کر اور سخت گھبراہٹ کی حالت میں انکار ہی انکار پر زور دیا۔ البتہ یہ کہا کہ قادر کو قتل ہی کرنا ہوتا تو وہ اسی دن کر دیتے جس دن ادھر سے اعلان ہوا تھا کہ نہ بسائیں گے نہ طلاق دیں گے۔

دوسرے نمبر کے بھائی کو بلایا۔ اس کے ساتھ بھی میں نے یہی باتیں کیں اور اس کا حال بھی اپنے بڑے بھائی جیسا ہوا اور اس نے ویسے ہی عذر پیش کیے جو اس کے بڑے بھائی نے کیے تھے۔ کچھ وقت اس کے ساتھ بھی لگایا اور میں نے چھوٹے بھائی کو بلایا۔

چھوٹا بھائی جب میرے کمرے میں داخل ہوا اور دروازے سے میری میز تک جس طرح چل کر آیا، اس سے میں نے اندازہ کر لیا کہ یہ اپنے دونوں بڑے بھائیوں سے بہت مختلف ہے۔ اس کی چال اور رویہ ایسا تھا جیسے پھوکے غنڈے ہوتے ہیں۔ جو پیشہ ور اور پکے غنڈے ہوتے

ہیں۔ ان کا طور طریقہ کچھ اور طرح ہوتا ہے۔ تھانیدار کے سامنے آ کر وہ اس طرح جھک جاتے ہیں جیسے وہ کسی بادشاہ کے دربار میں آ گئے ہوں۔ تھانے سے باہر وہ کسی معمولی سے آدمی سے بھی ملتے ہیں تو اس طرح ملتے ہیں جیسے وہ غنڈے نہیں بلکہ مسکین سے آدمی ہیں۔ وہ غنڈہ گردی سوچ سمجھ کر کیا کرتے ہیں۔ مقتول کا چھوٹا سالا اس طرح اکڑتا ہوا اور جھومتا ہوا میرے سامنے آیا جیسے وہ امید رکھتا ہو کہ میں اس کے غنڈے پن کی تعریف کروں گا۔ میں نے اسے کرسی پر بٹھا دیا۔

''تمہیں دیکھ کر میری طبیعت خوش ہو گئی ہے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''سنا ہے اس شہر میں تمہاری بہت عزت ہے اور دبدبہ بھی ہے اور کچھ لوگ تو سنا ہے تم سے بہت ڈرتے ہیں''۔

''اللہ کی دین ہے جی!''۔۔۔ اس نے عجیب طریقے سے اپنے ایک ہاتھ کو حرکت دے کر اور جھوم کر کہا۔۔۔ ''کوئی سر نہیں اٹھا سکتا''۔

میں نے اسے پھونک دینی شروع کر دی اور وہ غبارے کی طرح پھولتا چلا گیا۔

''ایک بات بتاؤ عابد!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تمہاری بہن کہاں چلی گئی ہے؟''

''یہ پتہ چل جاتا تو کیا وہ آدمی اور میری بہن زندہ ہوتے؟''۔۔۔ اس نے بڑے رعب سے جواب دیا۔

''تمہارے یہ الفاظ سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے''۔۔۔ میں نے اس طرح بات کی جس طرح میں تھانیدار نہیں بلکہ اس کا دوست تھا۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تم جیسے غیرت مند بھائی اپنی غیرت پر جان دے دیا کرتے ہیں...... یہ سمجھ نہیں آتی کہ تمہارے بہنوئی کو کس نے قتل کیا ہے''۔

''یہ تو میں بھی نہیں بتا سکتا''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''ویسے یہ ضرور کہوں گا کہ اس شخص کا انجام یہی ہونا چاہئے تھا۔ کسی کی بہن یا بیٹی کو اجاڑ دینا بہت بڑا جرم ہے۔ پولیس اور قانون کے پاس تو اس کی کوئی سزا ہی نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسے شخص کو معاف کر دیا جائے''۔

''تم نے اس کی ماں کو کیوں معاف کر دیا ہے؟''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اسے بھی اڑا دینا تھا۔ اصل قصوروار تو وہی ہے''۔

''اب اسی کی باری ہے''۔۔۔ اس نے ایسے کہا جیسے نشے میں ہو۔

''بری کرانا میرا کام!''۔۔۔ میں نے کہا اور اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بے تکلف دوستوں کی طرح بڑھایا اور کہا۔۔۔ ''یہ کام صرف تم کر سکتے ہو؟''

اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑا۔

"وعدہ ہوا"۔۔۔ اس نے کہا۔

"تم شیر ہو"۔۔۔ میں نے اس کا ہاتھ دبا کر ہلاتے ہوئے کہا۔۔۔ "اب دیکھنا قادر کے قتل سے میں تمہیں کس طرح بری کراتا ہوں۔ ایک دن بھی سزا نہیں ہونے دوں گا۔ میں دو بہنوں کا بھائی ہوں۔ ایک بھائی کی غیرت کو میں ہی سمجھتا ہوں تم نے تو میرا دل خوش کر دیا ہے"۔۔۔ میں نے اس کی طرف جھک کر آہستہ سے پوچھا۔۔۔ "تم اکیلے تھے یا......"

"نہیں"۔۔۔ اس کے منہ سے نکل گیا اور میری بات بھی پوری نہ ہونے دی۔ کہنے لگا۔۔۔ "اکیلا نہیں"۔۔۔ وہ یکلخت چونک پڑا جیسے کسی نے اسے نیند سے جگا دیا ہو۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ آ گئی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا پھر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ آہستہ آہستہ اس کے منہ سے آوازیں نکلنے لگیں۔۔۔ "میں نے تو اسے قتل نہیں...... نہیں جی!...... آپ یقین کریں...... خدا کی قسم، آپ یقین کریں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا"۔

میں خاموشی سے اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے منہ سے لفظ اس طرح نکل رہے تھے جیسے ان پر اس کا کنٹرول ہے نہیں۔ وہ اپنی بے گناہی ثابت کر رہا تھا لیکن اس کا دراصل مسئلہ یہ تھا کہ اس کے منہ سے پہلے جو لفظ نکل گئے تھے، انہیں وہ واپس اپنے پیٹ میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب وہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اب ایسے لفظ منہ سے نکالنے شروع کر دیئے تھے جن کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ میں اس کے بولنے کے انداز کو اور اس کے چہرے کو بہت توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

یہی میرا ملزم تھا لیکن ملزم اگر اپنی زبان سے کہہ دے کہ قاتل میں ہوں تو تھانیدار کے لیے اتنا ہی کہہ دینا کافی نہیں ہوتا۔ ملزم کا مجسٹریٹ کے سامنے دیا ہوا تحریری اقبالی بیان بھی فیل ہو جایا کرتا ہے۔ قانون کہتا ہے کہ اقبالی بیان کے ساتھ پورا پورا ثبوت اور شہادت بھی پیش کی جائے۔

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا اور ہنس پڑا لیکن فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا۔ شاید اسے اپنی ہنسی پسند نہیں آئی تھی یا اسے احساس ہو گیا تھا کہ یہ موقع ہنسنے والا نہیں۔

"تم بول بول کر تھک گئے ہو"۔۔۔ میں نے اسے کہا۔۔۔ "اب مجھے بولنے دو۔ میں اتنا ہی بولوں گا کہ اقبالی بیان دے دو اور میں تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا"۔

"میں نے کہا ہے نا!"۔۔۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ لفظ اپنے منہ سے دھکیل دھکیل کر باہر نکالے۔۔۔ "آپ میری بات پر اعتبار کریں۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا"۔

"تم نے نہیں تو تمہارے کسی دوست نے کیا ہو گا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تم نے قادر کو صرف پکڑا ہوا ہو گا اور اس کے گلے میں رسی ڈالنے والے تمہارے دوست ہوں گے۔ ان کے نام بتا دو۔ میں تمہیں سلطانی گواہ بنا لوں گا۔ پھر تمہیں سزا نہیں ملے گی"۔

وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں لگا رہا۔ میں نے اسے خبردار کر دیا کہ اس نے اقبال جرم نہ کیا تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔

"آپ کوئی ثبوت تو میرے آگے رکھیں"۔۔۔ وہ اچانک دلیر بن گیا اور اس نے کہا۔۔۔ "آپ تو ہر کسی کو یہی کہتے ہوں گے کہ تم مجرم ہو اور تم اقبالی بیان دے دو...... میں نے جو جرم کیا ہی نہیں اس کو اپنے سر پر کیوں لے لوں"۔

"تمہاری مرضی ہے یار!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا۔۔۔ "اسے حوالات میں بند کر دو۔ آج رات کو اس کے ساتھ باتیں ہوں گی"۔

اس نے حوالات میں نہ جانے کے لیے اچھل کود شروع کر دی۔ وہ میرے کمرے سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل اسے گھسیٹ گھسیٹ کر اور دھکیل دھکیل کر حوالات میں لے گیا۔

میں نے ان تمام لوگوں کو جنہیں میں نے تھانے میں طلب کیا ہوا تھا، گھروں کو جانے کی اجازت دے دی۔ مقتول کے سسر اور دو بڑے سالوں کو بھیج دیا۔ ان کا باپ جانے کی بجائے میرے پاس آ گیا اور اس نے پوچھا کہ میں نے اس کے بیٹے کو حوالات میں کیوں بند کر دیا ہے۔

"آپ کو اچھی طرح معلوم ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔

"مجھے کچھ بھی معلوم نہیں جناب!"۔۔۔ اس نے کہا۔

"آپ چلے جائیں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "آپ کو معلوم ہو جائے گا"۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا میرے کمرے سے نکل گیا۔ میری اب ساری توجہ مقتول کے اس سالے پر ہو گئی۔

سورج غروب ہو گیا تھا۔ سارا دن بیان لیتے گزر گیا تھا۔ میں نے اے ایس آئی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو اس کام پر لگا دیا کہ وہ معلوم کریں کہ مقتول کے اس سالے، عابد کی گہری دوستی کس کے ساتھ ہے۔ اس کے دوست کو اسی جیسا جذباتی اور بیوقوف ہونا چاہیے یا وہ پکا عادی مجرم ہو گا۔

میں نے انہیں کہا کہ میں گھر جا رہا ہوں اور رات ساڑھے دس گیارہ بجے آؤں گا۔ میں نے نوجوان عابد سے بیان اگلوانا تھا۔ میں گھر چلا گیا اور وردی اتار کر نہایا۔ اپنے کپڑے پہن کر میں

کھانے پر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میری بیوی نے دروازہ کھولا اور مجھے بتایا کہ ایک کانسٹیبل آیا ہے۔ میں نے کہا کہ اسے اندر بلا لو اور تم کمرے میں چلی جاؤ۔

''وہ لڑکی آ گئی ہے جی!''—— کانسٹیبل نے اندر آ کر کہا—— ''وہ مقتول کی بیوی جو لاپتہ ہو گئی تھی''۔

''کس نے بتایا ہے؟''

''ان کے محلے کے ایک آدمی نے آ کر بتایا ہے''—— کانسٹیبل نے جواب دیا—— ''کہتا ہے کہ سیدھی مقتول کے گھر گئی اور اپنے خاوند کی میت پر اس نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ کہتا ہے جی کہ لڑکی تو شاید پاگل ہو گئی ہے۔ ان کا گھر عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس لڑکی نے اپنی ساس کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ عورتوں نے اسے پکڑ لیا''۔

''تم یوں کرو''—— میں نے کانسٹیبل کو کہا—— ''اس لڑکی کے باپ کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ اپنی بیٹی کو فوراً تھانے پیش کرو''۔

کانسٹیبل چلا گیا۔ میں حیران ہوتا رہا کہ یہ لڑکی کہاں سے آ گئی ہے۔ مقتول کی میت ابھی تک گھر میں رکھی تھی۔ ایک دن پہلے پوسٹ مارٹم ہوتا رہا۔ اسی شام جنازہ نہ ہو سکا کیونکہ گھر کے افراد کو میں نے پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ پابند رکھا ہوا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اس لیے لاش کے خراب ہونے کا خطرہ نہیں تھا۔ شاید کچھ رشتہ داروں نے آنا تھا۔ ان کے لیے جنازہ نہ اٹھایا گیا، پھر اگلا دن چڑھا تو میں نے پھر مقتول کے باپ اور بڑے بھائی کو تھانے بلا لیا۔ انہیں میں نے گھر جانے کی اجازت دی تو جنازہ اٹھانے کی تیاری کرنے لگے۔ اتنے میں مقتول کی بیوہ پہنچ گئی۔

میں کھانا کھا کر تھانے چلا گیا اور مقتول کی بیوہ کا انتظار کرنے لگا۔ ایک مہینے کی گمشدگی کے بعد اس کی واپسی کی خوشی اس کے والدین کو ہو گی۔ مجھے کوئی خوشی نہیں تھی۔ اگر میرے پاس اس کی گمشدگی کی رپورٹ آئی ہوتی اور میں اسے ڈھونڈنے میں ناکام ہو گیا ہوتا اور وہ اس طرح اچانک آ جاتی تو میں بہت خوش ہوتا کہ میرا ایک مسئلہ ختم ہو گیا ہے۔ میں اس سے بیان لے لیتا کہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی اور آ گئی ہے۔ اب میں نے اسے اس وجہ سے تھانے بلایا تھا کہ شاید اپنے خاوند کے قتل کے ساتھ تعلق رکھنے والی کوئی بات اس کے سینے میں چھپی ہوئی ہو۔

وہ آ گئی۔ اس کے ساتھ اس کا باپ اور بڑا بھائی تھا۔ میں نے انہیں دور سے دیکھا تھا کہ باپ اور بھائی اسے لا رہے تھے۔ میرے دل کو تکلیف ہو رہی تھی۔ یہ لوگ حیثیت اور عزت والے

تھے۔ ان کا رعب اور احترام تھا لیکن یہ باپ اور بھائی اپنی بیٹی کو اس طرح تھانے تک لائے جس طرح پاگلوں کو کہیں لے جایا جاتا ہے۔ راستے میں لوگ ان کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بہت سارے بچے ان کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ یہ سب تماشائی تھے۔ ان لوگوں نے چھوٹی چھوٹی غلط حرکتیں کر کے اپنے آپ کو تماشہ بنایا تھا۔ میں لیکچر نہیں دوں گا۔ آپ کو ان لوگوں کی غلطیاں سنا دی ہیں۔ یہ غلطیاں ہمارے گھروں میں آج بھی شوق اور فخر سے کی جاتی ہیں۔

لڑکی میرے کمرے میں لائی گئی۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی تھی۔ اپنے منہ پر ہاتھ مار مار کر اس نے منہ لال سرخ کیا ہوا تھا۔ اپنے بالوں کو اس نے نوچا تھا اس لیے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور وہ بہت خوبصورت تھی۔ میں نے اس کے باپ اور بھائی کو باہر بھیج دیا اور لڑکی کو کرسی پر بٹھایا۔ اسے پانی پلایا پھر میں نے افسوس کیا کہ اس کا خاوند قتل ہو گیا ہے۔ اسے تسلیاں دیں اور ایسی باتیں کیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میں تھانیدار نہیں اور اس پر کوئی الزام نہیں۔

''نہ تھانے سے ڈرو نہ مجھ سے ڈرو''—— میں نے کہا—— ''میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میری چھوٹی بہن میرے پاس آئی ہے...... میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے خاوند کو کس نے قتل کیا ہے''۔

''اس کے ماں نے!''—— اس نے کہا۔

یہ پہلی بات تھی جو اس کے منہ سے نکلی تھی۔ میرے سامنے آ کر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی تھی اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ حیران اور پریشان تھی۔

''اس کی ماں چڑیل کی تو میں نے بہت باتیں سنی ہیں''—— میں نے کہا۔

''اپنے بیٹے کو اس چڑیل نے کھا لیا ہے''—— اس نے کہا اور اپنی ساس کی باتیں سنانی شروع کر دیں۔

میں یہ باتیں پہلے بھی سن چکا تھا۔ نہ سنتا تو بھی مجھے معلوم تھا کہ ایک بری ساس کیسی ہوتی ہے اور گھر میں کیا کرتی ہے۔ یہ عورت صرف بری ساس نہیں تھی بلکہ بری بیوی اور بری ماں بھی تھی۔ سارے گھر کے لیے مصیبت بنی ہوئی تھی۔ میں اسی معاشرے کا فرد تھا۔ میں ہر بات سمجھتا تھا کہ لیکن میں نے اس کی بیوی کو بولنے سے روکا نہیں۔ اسے بولنے دیا تا کہ اس کا دل ہلکا ہو جائے اور میری طرف سے اس پر جو گھبراہٹ ہے وہ اس کے دل سے اتر جائے۔ میں نے یہ بھی معلوم کرنا

تھا کہ یہ گئی کہاں تھی اور واپس کیوں آ گئی ہے۔

''میں تو کہتی ہوں''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میرے باپ اور میرے بھائیوں نے بھی میرے خاوند کو قتل کیا ہے۔ میں انہیں کہتی تھی کہ جس طرح قادر کا بڑا بھائی ماں باپ سے الگ ہو کر اسی حویلی میں رہ رہا ہے۔ اسی طرح میں قادر کو الگ کر لوں گی لیکن میرا باپ اور میرے بھائی کہتے تھے کہ قادر پر بھروسہ نہ کرو، وہ اسی ماں کا بیٹا ہے۔ تم سر اونچا کر کے رہو اور ان لوگوں کو ایک کے جواب میں دس سناؤ...... آپ نہیں جانتے قادر کو میرے ساتھ کتنی محبت تھی''۔

اتنا کہہ کر وہ ایسا روئی کہ مجھے بھی اس نے ہلا دیا۔ ایسا نظر آ رہا تھا کہ اب یہ کبھی چپ ہو گی ہی نہیں۔ میں نے اس دوران ارادہ کر لیا کہ اسے اب گھر کی کوئی بات نہیں کرنے دوں گا۔ یہ باتیں ختم ہونے والی نہیں تھیں۔ میرا کام اور میرا مقصد کچھ اور تھا۔ میں نے اسے چپ کرایا۔

''اب یہ بتاؤ''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''تم چلی کہاں گئی تھیں؟ کس کے ساتھ گئی تھیں؟''

''اپنے خاوند کے پاس چلی گئی تھی''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''اور کہاں جانا تھا میں نے؟''

''کیا؟''۔۔۔ میرے منہ سے بڑی لمبی ''کیا'' نکلی میں تو بہت ہی حیران ہو گیا تھا۔

اس نے جو بیان دیا وہ میں اپنے لفظوں میں سناتا ہوں۔ یہ تو میں نے سنا دیا ہے کہ اس لڑکی کو جس کا نام خدیجہ تھا، کس طرح اس کے ماں باپ کے گھر بٹھا دیا گیا تھا۔ قادر طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔ نہ خدیجہ کی مرضی طلاق لینے کی تھی۔ قادر کی ماں تو خدیجہ اور اس کے والدین کو تنگ کرنے کے لیے کہتی تھی کہ طلاق نہیں دیں گے اور لڑکی کو بسائیں گے بھی نہیں لیکن قادر اور خدیجہ کی سوچ کچھ اور تھی۔ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ تڑپ رہے تھے۔

کچھ مہینے گزر گئے تو قادر نے اپنے دوست جلیل کے ساتھ اس مسئلے پر بات کی۔ میں جلیل کے بارے میں سنا چکا ہوں کہ وہ قادر کا ہمراز دوست تھا۔ جلیل نے اپنی بیوی کے ذریعے قادر اور خدیجہ کی ملاقات کا انتظام کر دیا۔ جلیل کی بیوی نے خدیجہ کو بتایا کہ قادر اس سے ملنا چاہتا ہے۔ خدیجہ فوراً جلیل کے گھر پہنچی اور میاں بیوی کی ملاقات الگ کمرے میں ہوئی۔ خدیجہ نے مجھے اس ملاقات کی ہر ایک بات سنائی۔ میں صرف یہ لکھوں گا کہ یہ ایک جذباتی ملاقات تھی۔

قادر جس شہر میں ملازم تھا۔ وہ بائیس تیئس میل دور تھا۔ اس وقت اتوار کو چھٹی ہوا کرتی تھی۔ قادر ہفتے کی شام گھر آ جاتا اور اتوار کی رات واپس چلا جاتا تھا۔ ہفتے کی شام اپنے گھر میں

کھانا کھا کر قادر جلیل کے گھر چلا جاتا اور ادھر سے خدیجہ آ جاتی جلیل کی بیوی نے خدیجہ کے ساتھ گہری دوستی کر لی تھی۔ خدیجہ کے والدین قادر کی بیوی پر اعتبار کرتے تھے۔ وہ بھی خدیجہ کی عمر جتنی تھی۔ وہ خدیجہ کے گھر جاتی۔ اس کی ماں کے ساتھ بھی گپ شپ لگاتی پھر اسے کہتی، خالہ میں خدیجہ کو ساتھ لے جا رہی ہوں۔ ماں نے کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ تو یہی بہتر سمجھتی تھی کہ خدیجہ کا کسی طرح دل لگا رہے۔

جلیل اور اس کی بیوی نے خدیجہ کا دل لگانے کا بندوبست کر دیا تھا لیکن ہر ہفتے کا ملنا ٹھیک نہیں تھا۔ پکڑے جانے کا ڈر تھا اس لیے یہ ملاقاتیں ایک ہفتہ چھوڑ کر ہونے لگیں۔

یہ کوئی ازدواجی زندگی نہیں تھی۔ قادر اور خدیجہ نے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا۔ وہ یہ تھا کہ خدیجہ ہمیشہ کے لیے اپنے گھر سے نکل آئے اور قادر اسے شہر اپنے پاس لے ائے گا پھر دونوں کبھی ادھر نہیں آئیں گے۔ اگر ان کے والدین وغیرہ کو معلوم ہو گیا کہ وہ شہر میں اکٹھے رہ رہے ہیں اور وہ ان تک پہنچ گئے تو یہ دونوں اس شرط پر واپس آئیں گے کہ آپس میں اختلاف ختم کرو اور ہمیں اپنی زندگی بسر کرنے دو۔

ایک رات قادر شہر سے یہاں آیا۔ اس کے گھر والوں کو معلوم نہیں تھا۔ خدیجہ نے دن کے وقت اپنے وہ کپڑے، زیور وغیرہ جو اس نے ساتھ لے جانے تھے، چوری چوری ایک اٹیچی کیس میں ڈال لیے تھے۔ رات کو جب اس کے گھر والے سوئے ہوئے تھے وہ اٹھی اور اٹیچی اٹھا کر گھر سے نکل گئی۔

میں نے بڑے آرام سے سنا دیا ہے کہ اس نے اٹیچی کیس اٹھایا اور نکل گئی لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جس طرح میں نے سنایا ہے۔ یہ تو بڑا خطرناک اور مشکل کام تھا جو اس لڑکی نے کامیابی سے کر لیا۔ یہ خاوند کی محبت کا کرشمہ تھا اور یہ بھی خیال میں رکھیں کہ وہ کوئی گناہ نہیں کر رہی تھی۔ یہ اس لڑکی کی اصل طاقت تھی۔

قادر اور جلیل کھیتوں میں کھڑے تھے۔ انہوں نے خدیجہ کو پہلے بتا دیا تھا کہ وہ کس طرف سے جلیل کے گھر آئے۔ قادر نے اس کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے لیا اور وہ جلیل کے گھر گئے۔ ساڑھے تین چار بجے یعنی سحری کے وقت بڑے شہر کی طرف جانے والی دو تین بسیں گزرا کرتی تھیں۔ قادر نے خدیجہ کو ایک بس میں بٹھایا اور میاں بیوی اس جگہ سے نکل گئے جہاں ان کے درمیان گھروں کی سیاست بازی اور خباثت کی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ قادر نے شہر میں ایک

مکان کرائے پر لے لیا تھا۔

قادر نے کسی وجہ سے چار پانچ دن چھٹی لی تھی۔ اس کے گھر کا کوئی کام تھا جو مجھے یاد نہیں رہا کہ کیا تھا۔ وہ خدیجہ کو شہر میں اکیلا چھوڑ آیا تھا اور اپنے دو دوستوں کو کہہ آیا تھا کہ اس کے گھر کا خیال رکھے۔ خدیجہ نے مجھے بتایا کہ قادر نے ایک مہینے بعد اپنے والدین کو بتانا تھا کہ خدیجہ اس کے پاس ہے اور وہ واپس نہیں آئے گی۔

میں نے قادر کے باپ سے پوچھا تھا۔ اس نے ابھی گھر والوں کو نہیں بتایا تھا۔

''کیا تم قادر کے قتل کی اطلاع پر آئی ہو؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''ہاں جی!''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''جلیل بھائی جان نے اپنا ایک آدمی قادر کے دفتر میں بھیجا تھا کہ قادر کے ایک دوست کو اطلاع دے آئے کہ قادر قتل ہو گیا ہے۔ اس دوست نے گھر آکر مجھے اطلاع دی۔ اسی دوست نے مجھے بس پر بٹھایا تھا...... اگر کسی کو شک ہے کہ میں کسی اور کے ساتھ کہیں اور اور چلی گئی تھی تو میرے ساتھ چلو۔ میں کرائے کا وہ مکان دکھاؤں گی جہاں ہم رہتے تھے۔ قادر کے اور میرے کپڑے، زیور اور سامان وہیں پڑا ہے چل کر دیکھ لو''۔

یہ لڑکی جسے میں کچھ اور سمجھتا تھا، میری نظروں میں فرشتہ بن گئی۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو باہر جا کر کہا کہ جلیل کو اپنے ساتھ لے آئے۔

''تمہارا شک کیا ہے؟''۔۔۔ میں نے خدیجہ سے پوچھا۔۔۔ ''قادر کو کس نے قتل کیا ہے؟ ایسا تو نہیں کہ تمہارے بھائیوں کو پتہ چل گیا ہو کہ تمہیں قادر لے گیا ہے اور انہوں نے اس میں اپنی بے عزتی سمجھی ہو؟''

''میں کیا بتاؤں!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''یہ ہو تو سکتا ہے لیکن وہ پہلے میرے پاس آتے اور کہتے کہ اپنے گھر چلو...... آپ خود سوچیں میرا دماغ کام نہیں کرتا''۔

میں نے اسے یہ نہ بتایا کہ اس کا چھوٹا بھائی قتل کے شبہے میں حوالات میں بند ہے۔ خدیجہ کے ساتھ میرا اور کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے اس کے ساتھ تھوڑی بہت اور باتیں کیں اور اس کے باپ کو بلا کر خدیجہ کو اس کے حوالے کیا۔ باپ کو میں نے صرف یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ یہ اپنے خاوند کے پاس چلی گئی تھی۔ لوگوں کو بتا دو کہ اسے بدنام نہ کریں۔

تقریباً گیارہ بجے کا وقت ہو گیا۔ جلیل آ گیا تھا۔ میں نے اسے بلایا۔ میں نے پہلے اس سے پوچھ گچھ کی تھی تو میں نے اسے کہا تھا کہ وہ کوئی بات مجھ سے چھپا رہا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ

کچھ بھی نہیں چھپا رہا۔ خدیجہ سے پتہ چلا کہ جلیل نے مجھ سے **یہ بات چھپائی تھی** کہ خدیجہ قادر کے پاس چلی گئی ہے۔ اب پھر جلیل میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ خدیجہ کہاں ہے؟

''کیا تم نہیں جانتے کہ تفتیش میں کوئی بات پولیس سے چھپانا جرم ہے؟''۔۔۔ میں نے کہا۔

''میں جانتا تھا یا نہیں جانتا تھا''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میں نے یہ جرم کیا ہے۔ آپ مجھے گرفتار کریں اور سزا دیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ آپ اپنا فرض پورا کریں''۔

مجھے امید تھی کہ وہ ڈر جائے گا۔ وہ تو بالکل ہی نہیں ڈرا۔ میں نے اسی سے پوچھا کہ اس نے کیا فرض ادا کیا ہے۔

''دوستی کا فرض!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میرے دوست نے کہا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ خدیجہ نے بھی مجھ سے یہی وعدہ لیا تھا۔ خدیجہ مجھے بھائی جان کہتی ہے۔ بھائی اپنی بہن کے ساتھ وعدہ کر کے اپنی جان دے سکتا ہے اسے دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اگر میں نے جرم کیا ہے تو اس سزا کو بڑی خوشی سے قبول کروں گا''۔

اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ خدیجہ کی گمشدگی کی رپورٹ میرے پاس آئی ہی نہیں تھی۔ اگر رپورٹ آتی اور جلیل یہ راز ظاہر نہ کرتا کہ وہ قادر کے پاس ہے تو پھر وہ مجرم تھا۔ مجھے آج تک یہ خوبصورت جوان یاد ہے۔ اسے میں نے دل سے پسند کیا تھا۔ ہر بات بڑے پکے لہجے میں کرتا تھا۔ میں نے اس سے تصدیق کرائی تھی جو اس نے کر دی کہ خدیجہ نے جو بیان دیا ہے وہ ٹھیک ہے۔

''میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں''۔۔۔ جلیل نے کہا۔۔۔ ''اس وقت جہاں جاؤ وہاں قادر کے قتل کی باتیں ہو رہی ہوتی ہیں۔ ہر کوئی پوچھتا ہے کہ قاتل کون ہے۔ لوگ اپنی اپنی رائے بھی دیتے ہیں۔ مجھے آج ہی ایک آدمی نے بتایا کہ جب قادر قتل ہوا، اس سے آدھا پونا گھنٹہ پہلے وہ گلی سے نکل کر کھیتوں کے راستے اپنے محلے کی طرف جا رہا تھا تو اس نے خدیجہ کے چھوٹے بھائی عابد کو ایک آدمی کے ساتھ ایک مینڈھ پر بیٹھے دیکھا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ اس آدمی کو سلام دعا ہوئی تھی۔ قادر میرے گھر اسی راستے سے آیا کرتا تھا۔ گلیوں کی طرف سے فاصلہ زیادہ ہے۔ آپ اس آدمی کو ابھی بلا سکتے ہیں''۔

جو آدمی عابد کے ساتھ بیٹھا ہوا بتایا گیا تھا۔ اسے میں جانتا تھا۔ وہ ایک بار کا سزا یافتہ تھا۔ اس نے ایک آدمی کو چاقو مارا تھا۔ وہ آدمی بچ گیا تھا۔ چاقو مارنے والے اس شخص کو دفعہ 307 میں تین سال سزائے قید ہوئی تھی۔ وہ چوری کی وارداتیں بھی کرتا تھا لیکن وہ لڑائی جھگڑے میں مشہور تھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو اس آدمی کے گھر بھیجا جس نے جلیل کو یہ بات بتائی تھی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل کو اس سزا یافتہ آدمی کو تھانے لانے کے لیے بھیج دیا۔ جلیل کو ابھی تھانے ہی رہنے کو کہا۔ وہ برآمدے میں چلا گیا۔

میں نے عابد کو حوالات سے نکلوا کر اپنے کمرے میں بٹھایا۔ اے ایس آئی نے مجھے باہر بلایا۔ میں گیا تو اس نے بتایا کہ ایک مخبر نے بتایا کہ اس نے قتل کے وقت سے کچھ دیر پہلے عابد کو ایک گلی میں اسی جرائم پیشہ آدمی کے ساتھ کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آیا۔ اس جرائم پیشہ اور سزا یافتہ آدمی کا نام کچھ اور تھا۔ میں اس کا نام فیقا رکھ دیتا ہوں۔

''ہاں بھائی عابد!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''کچھ سوچا ہے؟ میری بات پر غور کیا ہے؟...... اقبالی ہو جاؤ یار! فائدے میں رہو گے''۔

اس نے انکار کیا اور منتیں کرنے لگا کہ میں اسے چھوڑ دوں۔

''فیقے کے ساتھ کھیتوں میں بیٹھے کیا کر رہے تھے؟''۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''کب؟''۔۔۔ اس نے پوچھا۔۔۔ ''کس وقت؟''

''اپنے بہنوئی کو قتل کرنے سے آدھا گھنٹہ پہلے!''۔۔۔ میں نے کہا۔

''ویسے ہی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے''۔۔۔ اس نے کہا۔

''اتنی ٹھنڈی رات اور وہ جگہ دیکھ''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تمہیں وہی جگہ بیٹھنے کو ملی تھی۔ لوگ گھروں میں دروازے کھڑکیاں بند کر کے اور رضائیاں لے کر سوئے ہوئے تھے اور تم دونوں کو گرمی لگ رہی تھی''۔۔ میں نے اسے پریشان کرنے کے لیے پوچھا۔۔۔ ''فیقے کے ساتھ کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس نے کیا کہا، تم نے کیا کہا۔ یہ کوئی پرانی باتیں نہیں۔ ابھی ایک ہی رات گذری ہے...... بولو۔ یہ سوچ لو کہ جو باتیں تم بتاؤ گے وہ میں فیقے سے بھی پوچھوں گا۔ ذرا سا بھی فرق ہوا تو نتیجہ دیکھ لینا''۔

''سچی بات ہے جی!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میں اپنی بہن کی باتیں کر رہا تھا کہ اس نے خاندان کی عزت تباہ کر دی ہے۔ فیقا میرے بہنوئی قادر اور اس کی ماں کو گالیاں دیتا تھا کہ وہ میری

بہن کو بسا لیتے تو بہن اس طرح گھر سے لاپتہ نہ ہوتی''۔

''پھر قادر آ گیا اور تمہاری باتیں رک گئیں''۔۔۔ میں نے کہا۔

''قادر نہیں آیا تھا جی!''۔۔۔ اس نے کہا۔

میں نے اس کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے بعد یہی ہوتا رہا کہ میں کوئی سوال کرتا، وہ اپنی مرضی کا جواب دیتا اور میں اس کے منہ پر بڑا سخت تھپڑ مارتا، پھر میں نے اسے بتایا کہ اس نے اپنا انکار جاری رکھا تو ایذا رسانی کے کون کون سے طریقے استعمال کیے جائیں گے اور اگر وہ مر گیا تو اس کی لاش غائب کر دی جائے گی۔

ہیڈ کانسٹیبل نے آ کر بتایا کہ فیقا آ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ اسے اندر بھیج دو۔ فیقا آ گیا ہے ۔ میں نے کہا کہ اسے اندر بھیج دو۔ فیقا آیا۔

''یہی تھا؟''۔۔۔ میں نے عابد سے پوچھا۔۔۔ ''یہی تھا نا تمہارے ساتھ؟''

''جی!''۔۔۔ عابد نے جواب میں کہا۔

''اچھی طرح شناخت کر لو''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''بولو!''

''یہی تھا جی!''۔۔۔ اس نے کہا۔

''شاباش!''۔۔۔ میں نے کہا۔

میں فیقے کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ وہ میرے کمرے میں چلا جائے اور عابد کا خیال رکھے۔ اس تھانے میں حوالات کے دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ عورتوں کے لیے تھا جو اس وقت خالی تھا۔ میں فیقے کو اس کمرے میں لے گیا۔

''اپنی زبان سے بول فیقے!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تیرا یار تو بک پڑا ہے۔ تم تو استاد آدمی تھے۔ کیا بیوقوفی کی تم نے؟ اتنے کچے آدمی کے ساتھ ...ین واردات کر ڈالی''۔

میں ایک بات بتاتا ہوں۔ جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ پولیس والوں کا طور طریقہ کچھ اور ہوتا ہے ان کے ساتھ دوستی بھی ہوتی ہے اور دشمنی ایسی کہ ضرورت پڑے تو انہیں مار مار کر ہڈی پسلی ایک کر دی جاتی ہے۔ یہ لوگ پولیس کے لیے مددگار بھی ہوتے ہیں۔ میں فیقے کے ساتھ دوستی کے رنگ میں بات کر رہا تھا اور میں اس کے ساتھ جھوٹ بول رہا تھا کہ جلیل نے اقبال جرم کر لیا ہے۔

''اب بتاؤ کیا کرنا ہے''۔۔۔ میں نے فیقے سے کہا۔۔۔ ''تمہاری ہسٹری شیٹ عدالت میں پیش ہو گی تو سیدھے پھانسی کی کوٹھڑی میں جاؤ گے۔ میں تمہیں بچانا چاہتا ہوں۔ تم نے اس تھانے

کے بہت کام کیے ہیں"۔

"سلطانی گواہ بنالیں"۔۔۔اس نے کہا۔

"تم بات کرو"۔۔۔میں نے اتنے پیار سے کہا جیسے میں تھانیدار نہیں ہوں۔۔۔"میرے کمرے میں آجاؤ"۔

میں نے اپنے کمرے میں آکر ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ وہ عابد کو حوالات میں لے جائے۔ فیقے کو بٹھالیا۔

"میری زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے حضور!"۔۔۔اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔۔۔"خیال رکھنا۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں"۔

"تمہارے بچوں کا ہی تو مجھے خیال ہے فیقے!" میں نے کہا۔۔۔"میں مقدمے میں ایک خانہ خالی اور ایک خانہ کمزور رکھوں گا۔ اول تو سیشن سے بری ہو جاؤ گے، نہیں تو اپیل میں نکل جاؤ گے۔ مجھے مکمل بات سناؤ"۔

"سلطانی گواہ نہیں بنائیں گے؟"

"تم بیان دو"۔۔۔میں نے کہا۔۔۔"باقی مجھ پر چھوڑو"۔

اور بھی کئی باتیں کر کرا کے اس نے اقبالی بیان دے دیا۔ مجھے تو یہ امید تھی کہ وہ سیدھے ہاتھوں نہیں مانے گا لیکن میری استادی کام آگئی۔ میں سیدھی سی بات سنا دیتا ہوں۔ فیقے اور عابد کی دوستی تھی۔ فیقا پکا بدمعاش تھا اور عابد بدمعاشی میں منہ مارتا تھا۔ اسے گھر سے پیسے مل جاتے تھے اور وہ گھر سے پیسے چوری بھی کر لیا کرتا تھا۔ فیقے اور دو تین اور دوستوں نے اسے جوئے کا چسکا بھی ڈال دیا تھا۔

عابد کی بہن خدیجہ اپنے سسرال سے آکر گھر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ قادر کی ماں جو ناروا سلوک کرتی تھی وہ گھر میں سناتی تھی تو عابد کو بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے فیقے کو بتایا کہ وہ انتقام لینا چاہتا ہے۔ فیقا اسے روکتا تھا۔ وقت گذرتے گذرتے وہ وقت آگیا کہ خدیجہ لاپتہ ہو گئی۔ اس کے گھر والوں نے پہلے تو چھپائے رکھا لیکن عورتوں نے پوچھنا شروع کر دیا کہ خدیجہ کہاں ہے۔ بات چھپی نہ رہ سکی۔ لوگوں نے باتیں بنانی شروع کر دیں۔

عابد جوشیلا اور جذباتی نوجوان تھا۔ وہ عقل کو استعمال نہیں کرتا تھا اور وہ اپنے آپ کو غنڈہ اور بدمعاش بھی سمجھتا تھا۔ اسے یہ وہم بھی تھا کہ سارا شہر اس سے ڈرتا ہے اور اس کی عزت کرتا ہے۔

اس کی کسی کے ساتھ لڑائی ہو گئی۔ اس شخص نے عابد کو طعنہ دیا کہ جا پہلے اپنی بہن کو تو ڈھونڈ جو اپنے یار کے پیچھے تمہارے منہ پر تھوک گئی ہے۔

عابد کو اپنی بہن کی بجائے اور قادر پر غصہ آیا کہ قادر اس کی بہن کو اپنے گھر رہنے دیتا تو آج بہن گھر سے نہ بھاگ جاتی اور یہ طعنے نہ سننے پڑتے کہ تیری بہن اپنے یار کے پیچھے نکل گئی۔ قادر پر اسے یہ بھی غصہ تھا کہ قادر خدیجہ کو طلاق نہیں دیتا تھا۔ طلاق دے دیتا تو خدیجہ کی دوسری شادی کر دی جاتی۔

انہی دنوں فیقے کو کچھ رقم کی ضرورت پڑ گئی۔ وہ عابد کا دوست تھا۔ عابد نے اس کے آگے اپنی بے عزتی اور غصے کا رونا رویا اور قادر کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس نے فیقے کو یہ بھی کہا کہ وہ اس کی مدد کرے۔ ان کے درمیان قتل کرنے اور قتل نہ کرنے کی بھی باتیں ہوئیں۔ عابد کے دماغ پر خون سوار ہو گیا تھا۔ فیقے کے دماغ میں یہ بات آگئی کہ اسے جو رقم درکار ہے وہ عابد سے حاصل کر سکتا ہے۔ اس نے عابد کو بتایا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ اگر اسے ایک ہزار روپیہ مل جائے تو اس کی پریشانی ختم ہو سکتی ہے۔

"میں فوراً ایک ہزار روپیہ تو نہیں دے سکتا"۔۔۔عابد نے کہا۔۔۔"دو تین دنوں تک پانچ سو روپیہ دے دوں گا۔ تم قادر کو قتل کرنے میں میری مدد کرو۔ اس کے بعد باقی رقم بھی دے دوں گا اور میں رقم تم سے واپس نہیں لوں گا"۔

یہ یاد رکھیں کہ آج سے چالیس سال پہلے کا ایک ہزار روپیہ آج کل کے بیس ہزار کے برابر تھا۔

فیقا تیار ہو گیا اور دونوں قتل کا کوئی ایسا طریقہ سوچنے لگے۔ جس میں وہ پکڑے نہ جائیں۔ انہوں نے اس شہر جا کر جہاں قادر ملازم تھا، اسے قتل کرنے پر غور کیا۔ یہ کام فیقے نے اپنے ذمے لیا کہ وہ وہاں جا کر قادر سے معلوم کر لے گا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ وہ اکیلا ہی رہتا ہو گا۔ کسی رات جا کر اسے آرام سے قتل کر آئیں گے۔

قادر کی قسمت میں انہی کے ہاتھوں مرنا لکھا تھا۔ وہ چار پانچ دنوں کی چھٹی آگیا اور عابد نے اسے دیکھ لیا۔ عابد نے پہلے کئی بار دیکھا تھا کہ رات کو قادر جلیل کے گھر جاتا ہے اور کھیتوں کی طرف سے جاتا ہے۔ قتل کی رات عابد نے اسے جلیل کے گھر جاتے دیکھ لیا۔ اس نے فیقے کے گھر جا کر اسے بتایا اور تین سو روپیہ بھی فیقے کو دیا۔

فیقا اپنے گھر سے رسی لے آیا اور دونوں قادر کے راستے میں کھیتوں میں جا کر بیٹھ گئے۔

قادر واپس آیا تو دونوں اس کی طرف پیٹھ کر کے آہستہ آہستہ چل پڑے تا کہ قادر کو شک نہ ہو اور وہ پہچان بھی نہ سکے۔ قادر ان کے قریب آیا تو دونوں نے اسے راستہ دے دیا اور اس کی طرف دیکھا نہیں۔ رات کا وقت تھا۔ قادر نے تو انہیں پہچانا ہی نہیں ہو گا۔

قادر ان کے قریب سے گذر کر دو تین قدم آگے گیا ہو گا کہ عابد نے فیقے کے ساتھ طے کئے ہوئے طریقے کے مطابق پیچھے سے قادر کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ فیقے نے قادر کے گلے میں رسی ڈال کر پیچھے ایک گانٹھ دے دی۔ عابد نے قادر کو چھوڑ کر رسی کا ایک سرا پکڑ لیا۔ دوسرا سرا فیقے کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں نے رسی کو اپنی اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ قادر گرنے لگا تو دونوں اسے کھیت کے اندر گندم کی فصل میں گھسیٹ کر لے گئے۔ قادر کا تڑپنا بند ہو گیا۔ فیقے نے اس کی نبض دیکھی؟ پھر دل پر ہاتھ رکھا۔ وہ مر گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی کہ اب کوئی نہیں پکڑ سکے گا۔

وہ بھول گئے تھے کہ ایک عینی شاہد دیکھ رہا تھا۔ وہ اللہ کی ذاتِ باری تھی اور سچا انصاف اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے۔

میں نے یہ اقبالِ جرم عابد کے آگے رکھا۔ اسے چکمہ دیا کہ موقعہ کا گواہ کوئی نہیں اس لیے وہ بری ہو جائے گا۔ اس نے بھی بیان دے دیا، ہر دونوں کے اقبالی بیان ایک مجسٹریٹ سے قلمبند کروا کے دونوں کو جیل کی حوالات (جوڈیشل لاک اَپ) میں بھیج دیا۔

میں نے مقدمہ بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ پیروی بڑی مضبوط کی تھی۔ کوئی خانہ خالی نہیں رہنے دیا تھا۔ دونوں ملزموں کو سزائے موت دی گئی۔ ہائی کورٹ میں اپیلیں نامنظور ہو گئیں۔ رحم کی اپیلیں بھی نامنظور ہوئیں اور دونوں کو پھانسی دے دی گئی۔

ختم شد